غالب نمبر

راوی

راوی

نگران :
پروفیسر محمد منور ، ایم - اے

مجلس ادارت :
مدیر : اجمل نیازی
مدیر معاون: احمدسعید چمن
نائب مدیر : اطہر وقار عظیم
محمد جاوید

غالب نمبر

گورنمنٹ کالج ، لاہور

انتساب

★

روح غالب کے نام

★

★

★

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

★ ★ ★ ★

ترتیب

اداریہ

برصغیر پاک و ہند کے علاوہ دوسرے بڑے ممالک میں بھی غالب کی برسی منائی گئی ہے - اب غالب صرف ہمارا شاعر نہیں رہا - ساری دنیا کا شاعر بن گیا ہے - غالب نے ان انسانی جذبوں ، قدروں اور سوچوں کے بارے میں لکھا ہے جو آفاقی ، غیر فانی اور کائناتی ہیں - اس سلسلے میں اس نے وہ انداز ، ترکیبیں اور علامتیں استعمال کی ہیں جو زندہ ، مستقل اور ہمہ گیر ہیں - اس نے ہمیں احساس دلایا ہے کہ ایک انسان خواہ وہ کسی بھی خطے کا ہو ، صرف انسان ہے - مختلف علاقائی ، اعتقادی ، نسلی ، لسانی ، قومی اور ملکی خصوصیات ، روایات ، رواجات اور تعصبات کے علاوہ بھی بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو دھرتی کے سب انسانوں میں مشترک ہیں - مختلف جگہوں کی مٹی میں فرق ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے مگر آخرکار یہ بات قطعی اور حتمی ہے کہ وہ مٹی ہی ہے - کوئی اور چیز قطعاً نہیں - اور مٹی کی پتلوں میں یہ اشتراک کیا کم ہے کہ وہ ایک ہی شے سے بنے ہوئے ہیں - پھر یہ کیا کہ اس ہمہ گیر رشتے کو سراسر نظر انداز کر کے لوگ قوموں ، ملکوں ، فرقوں ، رنگوں ، نسلوں اور گروہوں میں بٹ گئے - صفحۂ ہستی کے چاروں جانب حرفوں ، لفظوں ، فقروں ، مصرعوں ، شعروں ، نظموں ، افسانوں اور مضمونوں کی طرح بکھر گئے - ہر ایک نے اپنی حیثیت ، اہمیت ، خصوصیت اور انفرادیت کو اجاگر کیا اور یہ ہونا چاہئے تھا - مگر کتاب زندگی -- جس کے وجود نے ان کے موجود ہونے کا پتہ دیا ، کرم خوردہ الماری پر بوجھ بن گئی - اگر مجموعی طور پر اس کتاب کی کوئی افادیت نہیں تو پھر اس تکلف کی کیا ضرورت ہے - اسے پھاڑ ڈالو ، ورق ورق کرو ، لفظ لفظ بکھیر دو ، ہوا میں اڑاؤ ناچو ، کودو اور گاؤ - ہم انسان نہیں حیوان ہیں - ہم میں کوئی قدر مشترک نہیں - ہم کسی اور ہی مخلوق سے تعلق رکھتے ہیں ہم صرف ایک مخصوص حد اور قد تک محدود اور مقید ہیں - ہمارا کسی سے کوئی رابطہ اور واسطہ نہیں -

غالب کی آواز ایسے فروعی تعصبات اور گروہی امتیازات پر ایک زبردست چوٹ ہے - جھوٹی عظمتوں اور وقتی و خود ساختہ بڑائیوں پر ایک ضرب کاری ہے - انسانیت کے ایک سا ہونے کا اعلان ہے - اس کا کلام حقیقت کو پہچان

لینے کا پیغام ہے ۔ اپنی اصل سے وصل پانے کا درس ہے ۔ زندگی کا عرفان ہی اس کا ایمان ہے ۔ وہ جو نفسیات انسانی کا نباض تھا ، کائنات ادب کا بادشاہ تھا ، اس نے ان باتوں کا ذکر کیا جو سب کی باتیں ہیں ۔ وہ قدریں ایک ہیں۔ وہ جذبے سب میں ہیں۔ ورنہ "بے چاری" اردو زبان کے اس خستہ حال شاعر کو نہ ہم اتنا مقام دیتے اور نہ دنیا کے لوگ اتنی پذیرائی بخشتے ۔ اس کی عظمت اور عقیدت کا سبب وہ نغمہ ہے جس میں سارے دنیا کے لوگ اپنی دھڑکنوں کی آواز سنتے ہیں ۔ اس کے شعر کی الاپ میں سب کی اپنائیت تھرکتی ہے ۔ وہ خود انفرادیت کا متوالا تھا مگر اپنے فن میں اجتماعیت کا رس نچوڑ دیا ۔

غالب کے کلام میں انہیں کچھ تو اپنا نظر آیا ہوگا ۔ یہی "کچھ" آج بہت کچھ بن چکا ہے ۔ ورنہ اردو اور دوسری زبانوں کے کئی اور استاد شعرا موجود ہیں جن کی کئی صد سالہ برسیاں منائی جا سکتی تھیں ۔

اب غالب کو خراج عقیدت پیش کرنے کا اچھا ، مفید اور بہتر طریقہ یہ ہے کہ ان آفاقی قدروں کو عام کیا جائے جن کی طرف غالب نے اشارہ کیا ہے ۔ ان قدروں کو عام کر کے ہی دنیا بھر کے مختلف رنگ و نسل کے انسانوں میں یگانگت ، یکسانیت ، محبت ، دردمندی اور دوسروں کے کام آنے کا جذبہ پیدا کیا جا سکتا ہے اور یہی غالب کی زندگی کی آرزو تھی ۔

اس کے علاوہ اردو زبان جس میں غالب نے وہ جذبے اور قدریں سمو دیں جو عالم گیر ، آفاق گیر اور ہمہ گیر ہیں ۔ اس زبان کے حروف میں اس نے ساری کائنات کو سمیٹ کر رکھ دیا ۔ دنیا بھر کے انسانوں کے احساسات ، خواہشات اور روایات کو انڈیل دیا ۔ لوگوں کی رگوں میں دوڑنے والے طوفان بردوش خون کے سمندر کو غزل کے کوزے میں بند کر دیا۔ کون کہتا ہے کہ یہ زبان وقیع نہیں اور یہ صنف سخن وسیع نہیں ۔ گفتۂ غالب نے اسے رشک فارسی بلکہ اب رشک انگریزی ، جرمن ، فرانسیسی ، عربی ، روسی اور رشک ہر زبان بنا دیا ہے ۔ آج لوگ اردو جاننے کے لئے بے تاب ہیں ۔ کلام غالب سمجھنے اور پڑھنے کے مشتاق ہیں ۔

شعر و ادب کی اس صنف سخن (غزل) کی جامعیت اور اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اسے اپنائے رکھا جائے۔ دیوان غالب جو کتاب زندگی بھی ہے ، ملکی اور بین المملکتی سطح پر پڑھایا جائے۔ قومی زبان کی حیثیت سے اردو کے

فروغ کے لئے اسے رائج کیا جائے ۔ ذریعہ تعلیم و اظہار بنایا جائے اور بین الاقوامی لحاظ سے بھی اس کا مقام بلندتر کیا جائے ۔

* * *

غالب نمبر اصولاً فروری میں نکل آنا چاہئے تھا ۔ مگر فروری کا مہینہ اور بہت سے ضروری کاموں کا شکار ہوگیا ۔ یہ غالب کی روح کا کرب تھا ، ان کی دردمندیوں کے احساس کا سورج طلوع ہوا یا خون بستہ یادوں کا پیمانہ چھلک پڑا ۔

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں
کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

اب کی بار غالب کی یاد فتنہ و فساد کا ایک جہان آباد کر گئی ۔ پھر یہ یاد یوں برباد ہوئی کہ غالب کے ساتھ بسائی جانے والی رنگا رنگ بزم آرائیوں کے ارادے طاقچۂ نسیاں پر رکھ دیئے گئے ۔

غالب خستہ کے بغیر کونسے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا، کیجئے ہائے ہائے کیوں

لوگ ہائے ہائے بھی کرتے رہے اور زار زار رویا بھی کئے ، کام واقعی بند ہو گئے ، مگر غالب خستہ نے سو سال بعد جن سے خستگی کی داد پانے کی توقع کی ع

وہ ہم سے بھی زیادہ کشتۂ تیغ ستم نکلے

* * *

اس شمارے کے بارے میں صرف اتنا عرض ہے کہ یہ غالب کے فن سے عقیدت کا نتیجہ ہے جس میں آپ کی خدمت کا جذبہ بھی شامل ہوگیا ہے ۔ غالب نمبر کی خصوصیت صرف یہ ہے کہ یہ غالب نمبر ہے ۔ غالب کی انفرادیت کی طرح شاید اس میں بھی کچھ لیا پن آپ کو نظر آئے ۔

جہان ادب میں غالب کی عظمتوں اور اس کے فن کی رفعتوں کو سلام کیا جا رہا ہے ۔ ہم نے بھی اس سپاس گزاری میں اپنا حصہ شامل کر دیا ہے ع

گر قبول افتد زہے عز و شرف

یہ پرچہ راوی کے تمام قارئین کے ذوق و شوق کو مد نظر رکھ کر مرتب کیا گیا ہے ۔ اس میں تنقید بھی ہے اور تخلیق بھی - خاص انداز کے مضامین بھی ہیں اور عام دلچسپی کی باتیں بھی - باہر کے لوگ بھی ہیں اور کالج کے ادیب بھی - کئی پرانے سلسلے بھی اور کچھ نئے اضافے بھی - تقریباً صد سالہ "جوان" راوی کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے ادب میں یہ چند قطرے کچھ ایسے اہم نہ بھی ہوں مگر یہ تنوع اگر آپ میں تھوڑا سا تعجب بھی پیدا کر دے تو ہم خوش ہو جائیں گے کہ ہماری محنت رائیگاں نہیں گئی ۔ شاید یہ تعجب آپ میں تجسس پیدا کرے۔ تجسس ، تحرک میں ڈھل جائے اور آپ غالبیات اور ادبیات سے کوئی تعلق جوڑ لیں۔ اس میں آپ کا بھلا ہے، راوی کی خوش قسمتی اور گورنمنٹ کالج کا فخر ۔

میں جناب پرنسپل صاحب پروفیسر اشفاق علی خاں اور راوی کے مینیجر جناب صدیق کلیم صاحب کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنی ادب دوستی کے جذبے کے تحت ہمیں غالب نمبر نکالنے کی خصوصی اجازت دی - تعلیمی تعطل کی وجہ سے اس شمارے میں انگریزی کا حصہ شامل نہیں ۔ اس کا ہمیں افسوس ہے ۔

میں پروفیسر محمد منور صاحب کا بھی انتہائی شکر گزار ہوں - آپ نے راوی کی تیاری کے سلسلے میں ہمیں صرف مشورے ہی نہیں دیئے بلکہ ہر مرحلے پر ہمارے ساتھ مل کر کام کیا - یہ انہی کی مہربانیوں کا ثمر ہے کہ ہم میں اتنی ہمت پیدا ہوئی اور ہم راوی کا ایک بہتر پرچہ نکالنے میں کامیاب ہوئے ۔

آخر میں ان صاحب دل اہل قلم حضرات کو احساس کی اتھاہ گہرائیوں سے ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں - جن کی قلمی معاونت کے طفیل ہم اس سعادت سے نوازے گئے ۔ ڈاکٹر ملک عبدالغنی صاحب نے اپنے مضمون کے علاوہ خلیفہ عبدالحکیم ، مولانا حالی اور جگر مراد آبادی کی وہ نظمیں عطا فرمائیں جو انہوں نے ہدیۂ عقیدت کے طور پر کہی تھیں - اس لحاظ سے میرے عزیز اور رفیق اطہر صاحب بھی شکریے کے مستحق ہیں ۔

۲۱-۳-۶۹ اجمل نیازی

* * *

درد دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلاؤں
انگلیاں فگار اپنی ، خامہ خونچکاں اپنا

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

جہان معنی

نقد و نظر

ہوں گرمیٔ نشاط تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

عظمت غالب

ڈاکٹر سید عبداللہ

غالب بالاتفاق (شاید اقبال کے بعد) اردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں ۔ اور غزل کے فن میں شاید اقبال سے بھی بڑے ہیں ۔ کسی شاعر کی عظمت کا ایک ثبوت تو خود اس کا قبول عام ہے لیکن محض قبول عام کو عظمت کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا ۔ قبول عام بہرحال ایک اضافی ، اعتباری اور وقتی شے ہے ۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک شاعر اپنے زمانے میں مقبول ہو مگر بعد کے زمانوں میں لوگوں کی نظر میں نہ جچا ہو ۔ اس کے برعکس یہ بھی ممکن ہے کہ اپنے زمانے میں مقبول نہ ہوا ہو مگر بعد کے کسی دور میں خلقت کے جذبوں کا ترجمان بن گیا ہو ۔ غرض یہ ہے کہ قبول عام عظمت کی کوئی مستقل دلیل نہیں ۔ اگرچہ یہ بھی ایک دلیل ہے ضرور ۔۔ زبان خلق نقارۂ خدا بھی ہے اور نقارۂ مخلوق بھی ۔

سو غالب کی بڑائی کی ایک دلیل یہی ان کا قبول عام ہے ۔۔ لیکن جیسا کہ اوپر بیان ہوا غالب کی بڑائی کی کچھ اور دلیلیں بھی ہیں جو خود قبول عام کا باعث بھی ہیں ۔

غالب کے قبول عام کا ایک باعث یہ ہے کہ وہ سب انسانوں کے بنیادی اور مشترک جذبوں کی ترجمانی کرتے ہیں ۔۔۔ یوں تو سبھی شاعر جذبوں کے ترجمان ہوتے ہیں مگر بعض شاعر ہمہ زمان اور ہمہ رنگ جذبوں کے نمائندہ ہوتے ہیں ۔۔ ! مثلاً یہی دیکھیے ولی زندگی کے لطیف نشاطیہ میلان کے نمائندہ ہیں ، مگر ان کی شاعری زندگی کی ایک بہت بڑی حقیقت کو بالکل نظرانداز کر گئی ہے ۔۔ یعنی ان کے کلام میں انسان کا بنیادی مسئلہ غم موجود ہی نہیں ۔ ولی اس لئے صرف ان لوگوں کے شاعر ہیں اور اس دور زندگی کے شاعر ہیں جب جوانی زندگی کو ایک مفہوم بخش رہی ہوتی ہے اس دور سے باہر ولی کی شاعری کھوکھلی اور قصہ پارینہ معلوم ہوتی ہے ۔

اس طرح میر تقی میر زندگی کی بنیادی حقیقت غم کو تسلیم کرتے ہیں بلکہ صرف اسی حقیقت کو مانتے ہیں باقی جو کچھ ہے اسی کے تابع ہے ۔۔،

ان کی شاعری میں بہار بھی خزاں کا ایک روپ ہے - ان کے چمن میں پھول امید اور حسن کے نمائندہ نہیں بلکہ غم و اندوہ کے نمائندہ ہیں -

ع دل پر داغ ہی اپنا چمن ہے اور کہ ہر غنچہ دل پر آرزو تھا

وغیرہ وغیرہ - غور کیا جائے تو یہ زندگی کا آدھا تصور ہے - زندگی عبارت ہے رنج وراحت دونوں سے، یعنی باری باری اور نوبت بہ نوبت. یہ صرف رنج نہیں، یہ صرف راحت بھی نہیں البتہ عقلی تجزیے سے اس کے رنج کو بھی گوارا بنایا جا سکتا ہے - غرض زندگی کے یہ دونوں عناصر حقیقی ہیں - مگر میر کے یہاں صرف ایک ہی روپ ہے ، فقط - یعنی غم کا - اس کے برعکس غالب کی شاعری ، مذکورہ شاعروں کی شاعری کی طرح ادھوری نہیں - بلکہ زندگی کی کل حقیقت کی نمائندگی کرتی ہے - اس میں غم کی حقیقت کو تسلیم کیا گیا ہے مگر یہ بھی باور کرایا گیا ہے کہ غم کے باوجود زندگی کو گوارہ بنایا جا سکتا ہے - جینے کی آرزو اور غم کو راحت میں بدلنے کا سلیقہ اگر ہو تو غم غم نہیں رہتا - غالب کی شاعری کی یہ کیفیت قبول عام کے لئے ہر ذہن کو تیار کر دیتی ہے - وہ ناگوار اور نامطبوع صورت حال کی شکل بدل دیتے ہیں اور ناگواری کا نئے انداز سے تجزیہ کرکے ، اس میں خوشگواری کا رنگ پیدا کر دیتے ہیں -

(۱) نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے
روانئ روش و مستئ ادا کہیے
(۲) نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے
طراوت چمن و خوبئ ہوا کہیے

غالب کا یہ انداز فکر کہ "بہار تو ہے" - بڑی خوبی سے ذہن کو ایک ناگوار و ناموافق صورت حال کے بارے میں مطمئن کر دیتا ہے ، نہیں نگار کو الفت --- نہ ہو مگر یہ کم ہے کہ نگار کا حسن خرام اور اس کی مستئ ادا دل کو مسحور کیے دیتی ہے - غالب راحت کی ہر صورت سے بہرہ اندوز ہو سکتے ہیں ، اور مثالی کی جستجو میں وقت کو تلخ نہیں کرتے - جو ہے وہی اور وہ بھی ٹھیک ہے -

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے
حوران خلد میں تری صورت مگر ملے

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

کف افسوس ملنا عہد تجدید تمنا ہے

اچھا ہے سرگزشت حنائی کا تصور
دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

ان اشعار میں راحت اور خوش گواری کی ایک صورت ناخوش گواری ناتمامیت اور ناقابل اطمینان صورت حال سے نکالی گئی ہے - زندگی سے نباہ کی یہ صورت طبع انسانی کے لئے قابل قبول اور آرزوے حیات کے لئے معاون ثابت ہورہی ہے - انسان ہر حال میں جینا چاہتا ہے - جو چیز جینے کی آرزو اور جینے کے سلیقے میں اضافہ کرے انسان اسے پسند کرتا ہے - غم کے اثبات کے ساتھ زندگی کی یہ سلیقہ شناسی یا سلیقہ آموزی غالب کو ہر دل کے قریب کر دیتی ہے -

پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ غالب زندگی کے ہر دور میں موافق طبع اور دل پسند ہیں - بخلاف دوسرے درجے کے شعرا کے جو عمر کے ایک خاص دور کے باہر بےمزہ ہو جاتے ہیں - مثلاً حسرت موہانی کہ ان کا کلام صرف چڑھتی جوانی میں اچھا لگتا ہے یا جگر مراد آبادی کہ ان کا کلام سنجیدہ طبع لوگوں کو بہت کم متاثر کرتا ہے - غالب کا کلام ، عمر کے ہر دور میں خوش آہنگ معلوم ہوتا ہے - اور یہ ثبوت ہے اس امر کا کہ غالب پورے انسان کے شاعر ہیں یعنی اس کے ہر دور کے جذبوں کے شاعر ہیں -

جب کسی شاعر کا کلام ایسا ہو جاتا ہے تو یہ اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ اپنے زمانے سے آگے بھی قبول پائے گا - مستقبل میں بھی لوگ اسے اپنا ہی شاعر خیال کریں گے - اور اس کے کلام کو اپنے جذبوں کا ترجمان بنائیں گے - پھر یہ شاعر اپنے ہی ملک کے لوگوں کو متاثر نہیں کرے گا بلکہ اپنی لسانی مملکت سے باہر کی دنیا کو بھی محظوظ کر سکے گا - - - اس کے اشعار کے ترجموں میں وہی حظ ہوگا جو اس کے اوریجنل میں ہے - - - ایسے ہی شعرا آفاق اور عالم گیر ہوتے ہیں - - - اور غالب کو ایسا ہی ایک شاعر سمجھا جا سکتا ہے -

عام جذبوں کی بات سے قطع نظر - - ، غالب زندگی کی تازگی کے مدعی و آرزو مند شاعر ہیں - - - ، یہ قاعدہ ہے کہ فرد یا معاشرہ جب اپنے ارد گرد کے حالات کی یکسانی و بے رنگی سے اکتا جاتا ہے تو وہ زندگی کو بدلنے کا آرزو مند ہو جاتا ہے اور اسی پے بہ پے تبدیلی سے زندگی کے چمن میں نئی رونق ، نئی بہار نمودار ہوتی ہے ، - - - جو شاعر اس تازگی کا آرزو مند ہوتا ہے وہ اپنے اردگرد کے حالات کی بے رنگی کے خلاف احتجاج کرتا ہے - لیکن یہ یاد رہے کہ احتجاج کی طاقت کسی معمولی دل و دماغ کو میسر نہیں ہوتی - - - - یہ صرف بڑے اور غیر معمولی رجال و ابطال کے حصے میں آتی ہے -

غالب بھی ان بڑے "رجال" میں سے تھے جن کے حصے میں احتجاج کی طاقت تھی - چنانچہ غالب کے کلام میں تازگیٔ حیات کی خاطر احتجاج کا بھرپور نعرہ موجود ہے -

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
قضا بگردش رطل گراں بگرد انیم

اسی طرح ع رفتم کہ کہنگی ز تماشا بر افگنم اور بلا شبہ یہ آواز کسی فکری یا ادبی مجاہد ہی کی ہو سکتی ہے جو کاروبار عالم کی کہنگی سے اکتا چکا ہو اور جس کے قلب و جگر میں یہ طاقت بھی ہو کہ وہ نعرۂ انا اسداللہ لگا سکے - اقبال کے سوا ، - - - یہ نعرہ کہیں اور سنائی نہیں دیتا -

بعض اہل قلم نے غالب کی دلکش شخصیت کو بھی ان کے اسباب عظمت میں شمار کیا ہے - - - - مگر میں اس ادبی محاکمے میں ان کی شخصیت کو ان کے ادبی کارنامہ پر زبردستی ٹھونسنا نہیں چاہتا - یہ تو ظاہر ہے کہ کسی ادیب کی شخصیت اس کے کارنامے سے الگ نہیں ہو سکتی مگر شخصیت کے یہ روپ خود کارنامۂ ادب نہیں - - - - ، ادبی کارنامہ الگ شے ہے اور غالب کی عظمت کا کارنامہ ادب کی وجہ سے ہے نہ کہ شخصیت کی دلکشی کی وجہ سے ، - - - ہزاروں افراد غالب کی طرح کثیر الاحباب ہوئے ہیں مگر وہ غالب نہیں بن سکے - لاکھوں افراد غالب سے بھی زیادہ آم کے شائق ہیں مگر وہ غالب نہیں ہو سکے - ہزاروں افراد غالب ہی کی

طرح بذلہ سنج و ظریف ہوں گے مگر غالب بننا صرف غالب کے حصے میں آیا۔

مقصد یہ کہ ادبی عظمت کے ذکر میں، شخصیت کی دلکشی کا غیر معتدل پیوند، تنقیدی بے ادبی اور ایک طرح کی زبردستی ہے۔

غالب نے اپنی شاعری میں کل انسان کے جو جذبے بیان کیے ہیں ان کی تاثیر یا "ترجمانیت"، میں غالب کے نادر اسلوب بیان کا پورا حصہ ہے۔ خصوصاً اردو کلام میں، غالب نے اپنی شاعری کو وہ بدیع اسلوب عطا کیا ہے جو اس خاص تہذیب کی نمائندگی کرتا ہے جس کا ایک خاص اسلوب حیات تھا۔ اس اسلوب حیات میں فارسی ترکیب اور لفظوں کی مغلئی شان و شوکت بنیادی عناصر ہیں۔۔۔ غالب کے کلام میں، مغلوں کے دور اقتدار کا ایک غیور شخص بول رہا ہے۔۔۔!

غالب نے اپنے اسلوب بیان کے ذریعے اس مضمحل اور ناتوان اور نسوانی آواز کی مخالفت کی ہے جو دلی کی آخری شاعری اور لکھنو کے دور عروج میں نمایاں ہو کر، ضعف و اضمحلال کا پتہ دیتی ہے۔!

اردو جس قوم کی زبان ہے اس کے لہجے میں کڑک اور قوت ہونی چاہئیے۔۔۔، وہ روزمرہ جو ہندی روزمرے سے جا ملتا ہے اور فارسی ترکیب اور پر شوکت الفاظ سے دور لے جاتا ہے اس میں وہ کڑک اور قوت نہیں۔ وہ دور انحطاط کی نمائندگی کرتا ہے، واضح ہو کہ میر و سودا اس سے مستثنیٰ ہیں اس لئے کہ ان کا کلام سہل اردو ہونے کے باوصف جذبوں کی شدت اور گہرائی کا حامل ہے۔۔۔، اور گہرائی بھی بہرحال ایک غیر معمولی امر ہے۔

فارسی ترکیب اور پرشوکت الفاظ کا یہ ورثہ غالب سے اقبال نے بھی پایا۔ اور یہ امر اقبال کے لئے بھی ایک وجہ امتیاز ہے۔۔۔، اور غالب کے لئے تو یہ ہے ہی کیونکہ غالب کا اسلوب بیان تہذیب کے دور اقتدار سے، اقبال کے مقابلے میں زیادہ قرب زمانی اور قربت مکانی رکھتا ہے۔۔۔ اور ان جذبات و احساسات اجتماعی سے ہم آہنگ ہے جن کی ترجمانی غالب کے حصے میں آئی ہے۔

غالب کی ناموری کے اور اسباب بھی ہوں گے لیکن میں نے اپنی دانست میں مرکزی اسباب کی نشاندہی کی ہے جن کا خلاصہ یہ ہے : اول ۔ غالب فطرت انسانی کی پوری نمائندگی کرتے ہیں ۔ دوم ۔ غالب صرف اپنے دور سے مخصوص نہیں بلکہ اپنے دور سے آگے بھی قابل قبول ہیں ۔ سوم ۔ صرف اپنے ملک کے لئے نہیں بلکہ ملک سے باہر بھی پڑھے جا سکتے ہیں ۔ چہارم ۔ غالب زندگی کی تازگی کے مدعی ہیں اور اس کے لئے احتجاج کو ضروری سمجھتے ہیں ۔ غالب موت کو مانتے ہیں لیکن ہر صورت وہ زندگی کے شاعر ہیں ۔ جینے کی آرزو رکھتے ہیں اور جینے کا سلیقہ سکھاتے ہیں اور آخر میں یہ کہ غالب اپنی تہذیب اور اس کی شوکت کے مداح اور مصور ہیں اور ان کا اسلوب ضعیف روزمرہ نویسی اور عوامیت کے خلاف بھرپور احتجاج ہے اور یقیناً ان کے کلام کے قبول عام میں اس خصوصیت کا بھی حصہ ہے !

غالب ۔۔ یادوں کی ایک شمع

پروفیسر سید وقار عظیم

غالب سے میری ذہنی وابستگی اور جذباتی شیفتگی کا آغاز کب او کیوں کر ہوا؟ یہ سوال شعوری طور پر میرے سامنے آج سے پہلے کبھی نہیں آیا تھا اور آج سے پہلے یادوں کے ان بے شمار چراغوں نے جو آج جھلملاتے، جگمگاتے ایک ایک، کرکے میری آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے ہیں، اس چراغاں کی صورت اختیار نہیں کی تھی جو اس وقت میرے سینے میں روشن ہے۔

پہلی یاد۔ اب سے کوئی ۵۴ سال پہلے کی ہے۔ میں آٹھویں جماعت کا طالب علم ہوں۔ اردو کی جو کتاب داخل نصاب ہے اس کے حصہ نظم میں میر، درد، غالب اور حالی کی دو دو تین غزلیں، مثنویوں میں میر حسن اور نسیم کی مثنویوں کے علاوہ غالب کی مثنوی "آموں کی تعریف میں" کا ایک ٹکڑا شامل تھا جو اس شعر سے شروع ہوتا تھا:

بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے　　　خامہ نخل رطب فشاں ہو جائے

حصہ نثر میں سر سید، حالی، آزاد، شبلی، نذیر احمد اور شرر کی تصانیف کے اقتباسات کے علاوہ غالب کے تین چار خط بھی تھے۔

غالب کی جن تین غزلوں کے منتخب شعر شامل نصاب تھے، ان کے پہلے مصرعے یہ ہیں:

۱۔ کوئی امید بر نہیں آتی
۲۔ ابن مریم ہوا کرے کوئی
۳۔ نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

امتحان سے کچھ دن پہلے جب نصاب ختم ہوا تو مجھے اپنے ادب کے کئی اکابر کے نام یاد ہو چکے تھے لیکن جو نام سب سے زیادہ یاد تھا وہ غالب کا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ بغیر کسی کوشش کے غالب کے کئی شعر زبانی یاد ہو گئے تھے، دوسری وجہ آموں کی تعریف میں کہے ہوئے وہ

شعر جنہیں پڑھتے وقت ان طرح طرح کے آموں کا ذائقہ تازہ ہوتا رہتا تھا ، جن کا گہوارہ اودھ کی وہ سر زمین ہے جو باغ جنت کے لئے بھی باعث صد رشک ہے۔ شاعروں اور شاعروں کے ان بڑے بڑے ناموں میں سے صرف غالب کے نام کے میرے ذہن کی گہرائیوں میں جگہ بنا لینے کی ایک وجہ غالب کی آموں سے گہری رغبت کے وہ لطیفے بھی تھےجو ہمارے اردو کے مولوی صاحب نے "بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے" پڑھاتے وقت ہماری ہنسی اور ہماری خوشی میں شریک ہو کر ، ہمیں سنائے تھے - آٹھویں جماعت کے نصاب کے خاتمے پر جو غالب مجھے کوئی واضح احساس دلائے بغیر چپکے سے میری شناسائی اور آشنائی کے حلقے میں داخل ہو گیا تھا ، وہ ایک شاعر تھا جس کے کچھ شعر مجھے زبانی یاد تھے اور کچھ مولوی صاحب کی انتہائی کوشش کے باوجود میری سمجھ میں نہیں آئے تھے ، وہ ایسا شاعر تھا جس نے آموں کی تعریف میں بڑے خوبصورت شعر کہہ کر میری پسند کے پھل کو اپنی پسند کا پھل کہا تھا ، وہ ایسا انسان تھا جو آم حاصل کرنے کے لئے بادشاہوں تک سے ہنسی مذاق کی باتیں کر سکتا تھا۔

اس کے بعد کے دو تین برسوں میں بڑی تیزی سے کئی باتیں ہوئیں اور غالب کا ملا جلا شاعرانہ اور انسانی وجود میرے ذہنی وجود میں سے نکل کر میرے جذباتی وجود میں سماتا رہا - گھر میں ، پاس پڑوس میں اور چھوٹی بڑی تقریبوں میں بجنے والے گراموفون ریکارڈ دل نشین دھنوں میں غالب کی غزلیں سنا سنا کر اس احساس میں یقین کا رنگ بھرتے رہے کہ غالب ہمارے گرد و پیش کی ساری زندگی پر چھایا ہوا ہے -

ایف - اے میں داخلہ ہوا اور قدم اناؤ کی چھوٹی سی بستی سے نکل کر لکھنو کی طرف بڑھے جو سارے ہندوستان کی ادبی اور تہذیبی زندگی کا دل تھا - تدریس شروع ہوئی اور استادوں نے ادب اور زندگی کے باہمی ربط کی طرف اشارے کئے اور ادب و شعر کی پرکھ کی کسوٹیاں سامنے رکھیں اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ یہ سب باتیں تو غالب نے مجھے پہلے سے سکھا رکھی ہیں - آٹھویں جماعت میں پڑھتے ہوئے کسی شعر کے اچھا لگنے اور کسی شعر کے معنی سمجھ میں نہ آنے کی جو یاد اب بھی تازہ تھی اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا کہ شعر کو جانچنے کے جو معیار تمہیں اب شعوری طور پر بتائے جا رہے ہیں وہ غالب کی غزلوں کے طفیل غیر شعوری طور پر تم نے پہلے سے اپنا رکھے ہیں - شاعر کے شعر کا اپنی ذات کے ساتھ اور اپنے معاشرے کی ذات کے ساتھ جو گہرا تعلق ہے اس کی منطق ، غالب کے خطوں ، اس کے لطیفوں اور اس کی کوچہ و بام میں

گائے جانے اور خاص و عام کے دل میں اتر جانے والی غزلوں کے وسیلے سے تم تک پہنچ چکی ہے۔ غالب کے رشتے سے میرے قلب و ذہن کو اسیر کر لینے والی یہ پوشیدہ، غیر محسوس اور غیر شعوری منطق ایف۔ اے اور بی۔ اے کی چار سال کی تعلیم کے دوران میں میرے لئے محسوس اور شعوری بنتی گئی۔ حامداللہ افسر، مولوی محمد حسین اور سید مسعود حسن رضوی جیسے استادوں کی ادبی اور شعری بصیرت، ان کی تصانیف جو غالب کے اشعار کی تشریح و تفسیر و تعبیر کو ادب کے دقیق مسائل کا وسیلہ بناتی تھیں، مرزا محمد عسکری کی کتاب ادبی خطوط غالب، بیخود موہانی، آسی لکھنوی اور اثر لکھنوی جیسے شارحین غالب کے خیالات پر بحثوں کی گرم بازاری، نگار کے خاص نمبر، غالب کی زمینوں میں کہی جانے والی طرحی غزلوں کے مشاعرے، چار پانچ سال تک لکھنو میں رہ کر مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ جیسے ہماری شاعری میں غالب ہی سب کچھ ہے اور اس کا دیوان غزلیات ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے سارے خارجی اور داخلی تجربوں کی روح ہے۔

یہی زمانہ ہے جب مضامین رشید پڑھے اور اندازہ ہوا کہ اس عظیم مزاح نگار اور طنز نگار کی عظمت میں غالب کا فیضان اثر کسی حد تک کارفرما ہے۔ یہی دور ہے جب علی عباس حسینی، ل۔ احمد اکبرآبادی، نیاز فتح پوری اور مجنوں گورکھپوری کے افسانوں نے ادب کی اس مقبول صنف کو عروج بخشا تھا۔ لیکن ان کے افسانوں کے عنوان دیکھ کر، ان کے افسانوں میں آنے والے مکالمے پڑھ کر اور ان کے اسالیب کی خوش ترکیبیوں پر نظر ڈال کر یہ رائے اور زیادہ پختہ ہوگئی اور اب دیوان غالب میرے لئے حرز جاں بن گیا۔

ایم۔ اے کے نصاب میں غالب کی غزلیں بھی تھیں اور ان کے خط بھی۔ اب غالب کو اور قریب سے دیکھا اور میری تنقید نگاری کی ابتدا جن دو مضمونوں سے ہوئی وہ دونوں غالب کے زیر بار احسان ہیں۔ ایک مضمون تھا "شعر میں سادگی" اور دوسرے کا "اردو کا پہلا نقاد"۔ پہلے مضمون کے خیالات کا سرچشمہ غالب کے شعر تھے اور دوسرے کی بنیاد تنقید کے وہ اصولی نکتے جو اردو نثر میں سب سے پہلے غالب کے خطوں کے وسیلے سے ہم تک پہنچے ہیں۔

غالب مجھے سب شاعروں اور سب نقادوں سے زیادہ عزیز ہے کہ مجھ میں جو تھوڑا بہت تنقیدی شعور ہے وہ اسی کا عطا کیا ہوا ہے۔ اتفاقات اور حادثات نے غالب کو مجھ سے چھین لیا۔ کیسے بتاؤں کہ یہ غم میری زندگی کا کتنا بڑا غم ہے؟

غالب کے فنی اضافے

ڈاکٹر عبادت بریلوی

غالب کے فن کی تحلیل اور اس کے مختلف پہلوؤں کے تجزیے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ ایک اعلیٰ درجے کے خالق جمال اور ایک بہت بڑے فن کار تھے - انہوں نے فن کی اہمیت کو سمجھا تھا اور وہ اس کے بنیادی اصول کا گہرا شعور رکھتے تھے - ان اصولوں کو برتنا ان کے پیش نظر تھا - چنانچہ انہوں نے ان بنیادی اصولوں کو عملی طور پر بڑے سلیقے سے برتا ہے - وہ فن کی روایت کے پرستار تھے - لیکن اس روایت کو تجربے کے ساتھ ہم آہنگ کرنا بھی ان کے پیش نظر تھا - یہی وجہ ہے کہ ان کے فن میں روایت اور تجربے کا ایک حسین اور متوازن امتزاج ملتا ہے - وہ حسن و جمال کے شیدائی تھے اور زندگی اور فن دونوں میں اس حسن کی تلاش و جستجو ان کے پیش نظر تھی - چنانچہ وہ اس حسن و جمال کی تلاش و جستجو میں سرگردان رہے ہیں اور انہوں نے اس کی تخلیق کو بھی اپنا شعار بنایا ہے - یہی وجہ ہے کہ ان کے فن میں حسن و جمال کی تخلیق مختلف طریقوں سے ہوتی ہے اور وہ اس میں مختلف زاویوں سے اپنے آپ کو رونما کرتا ہے - وہ ایک تہذیب کی پیداوار ہیں اور اس تہذیب کا جمال ان کے فن میں اپنی تمام رنگینیوں اور رعنائیوں کے ساتھ بے نقاب نظر آتا ہے -

اس میں شبہ نہیں کہ غالب کے مزاج میں بغاوت کے عناصر پوری طرح موجود تھے اور طبیعت اور افتاد طبع کے اعتبار سے وہ ایک انقلابی تھے - اس کی ایک بہت بڑی وجہ ان کی رومانیت اور رومان پسندی ہی تھی - ہر رومانی مزاج فنکار اپنے ماضی سے مطمئن نہیں ہوتا - حال سے مطابقت پیدا کرنا بھی اس کے لئے مشکل ہوتا ہے - وہ تو مستقبل میں حسین دنیائیں بساتا ہے اور ان دنیاؤں کو اپنے تخیل کے رنگوں سے سجاتا ہے - وہ صرف سہانے خواب دیکھتا ہے اور انہی خوابوں کے سہارے اس کی زندگی بسر ہوتی ہے - غالب نے بھی اپنی

رومانیت پسندی کی وجہ سے ہی سب کچھ کیا ہے - وہ کسی چیز سے مطمئن نہیں ہوتے - خوب سے خوب‌تر کی تلاش میں انہوں نے زندگی اور فن کے ان گنت صحراؤں کی خاک چھانی ہے - لیکن ان تمام باتوں کے باوجود انہوں نے ماضی اور حال سے اپنا رشتہ توڑا نہیں ہے - انہوں نے روایت سے بغاوت ضرور کی ہے لیکن وہ روایت کے بعض پہلوؤں کی پرستش میں بھی پیش پیش رہے ہیں - یہی وجہ ہے کہ رومانیت اور رومان پسندی کے باوجود روایت کا رچاؤ اور اس کی رنگینی ان کے فن میں اپنی تمام تابانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے - غالب کے فن کا یہ بڑا کمال ہے کہ اس میں روایت کے اثرات صحت مندی کے ساتھ اپنے آپ کو رو نما کرتے ہیں -

روایت کے اثرات میں جو چیز سب سے زیادہ ان کے یہاں نمایاں نظر آتی ہے وہ فارسی شاعری کی روایت اور خاص طور پر اس روایت کے ان علم برداروں کے اثرات ہیں جن کی شاعری نے خود اس روایت کو رنگین اور پرکار بنانے میں نمایاں حصہ لیا ہے - بیدل، عرفی، نظیری اور ظہوری کے اثرات ان کے فن میں بہت نمایاں ہیں - ان شاعروں نے فارسی شاعری کی روایت کو جس رنگینی اور پرکاری سے آشنا کیا ہے، وہ مجموعی طور پر سمٹ کر غالب کے فن میں کچھ اس طرح سرایت کر گئی ہے جیسے کسی صحت مند اور توانا جسم میں تازہ اور رخشاں لہو دوڑتا ہے - غالب نے فارسی شاعری کی روایت سے رنگینی اور رچاؤ کی خصوصیات حاصل کی ہیں اور انہیں اردو شاعری کی فنی روایت کا جز بنا دیا ہے - ان سے قبل اردو شاعری میں معنوی اور صوری دونوں اعتبار سے وہ شگفتگی اور شادابی نہیں تھی جو ان کے ہاتھوں پیدا ہوئی - غالب کے فن کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے اردو شاعری کی روایت کو ان خصوصیات سے آشنا کیا -

غالب کے فن میں ایک نشاطیہ رنگ اور طربیہ آہنگ بھی خاصا نمایاں نظر آتا ہے - بظاہر تو یہ رنگ و آہنگ ان کی شخصیت اور افتاد طبع کا ترجمان اور عکاس ہے - لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فارسی شاعری کی روایت کے اثرات بھی ان کے فن میں اس رنگ و آہنگ کو نمایاں کرنے میں برابر کے شریک ہیں - غالب سے قبل اس رنگ و آہنگ کی روایت اردو شاعری میں موجود نہیں تھی - البتہ فارسی شاعری میں اس کا ایک سلسلہ ملتا ہے اور خاصی تعداد میں شاعر اس رجحان کے علم‌بردار نظر آتے ہیں - غالب کا

فن اس رجحان سے متاثر ہوا ہے - اور اس میں نشاط و طرب کی وہ جو ایک چاندنی سی مسکراتی ہوئی نظر آتی ہے اس کا سبب فارسی کی یہی روایت ہے جس کو غالب نے اپنے فن میں کچھ اس طرح داخل کیا ہے کہ اس نے اردو شاعری کی دنیا ہی بدل دی ہے -

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اردو شاعری کی روایت سے غالب کا کوئی رشتہ نہیں ہے اور صرف فارسی شاعری کی روایت ہی ان پر اثر انداز ہوئی ہے - ایسا نہیں ہے - غالب نے اردو شاعری کی روایت سے بھی اثر قبول کیا ہے، اور یہ اثرات بھی ان کے فن میں نت نئے روپ اختیار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں - سب سے اہم بات جو اس سلسلے میں سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے فارسی اور اردو کی روایات کے باہمی امتزاج سے ایک تیسری روایت کو پیدا کیا ہے جو ان کا ایک اہم فنی کارنامہ ہے - اس امتزاج نے ان کے فن میں نشاطیہ اور المیہ رنگ کی دھوپ چھاؤں کو جنم دیا ہے - غالب نے ان دونوں کو اس طرح ہم آہنگ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ ان کے فن میں شعلہ و شبنم ایک دوسرے سے گلے ملتے ہوئے نظر آتے ہیں -

غالب کے فن میں روایت کے اثر سے شوخی کا پہلو بھی نمایاں ہوا ہے - یہ شوخی ظاہر ہے کہ صنف غزل کے مزاج کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی - لیکن غالب کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اس شوخی کو، اور اس شوخی کے اثر سے پیدا ہونے والے ایک مزاحیہ اور طنزیہ انداز کو غزل کے مزاج میں داخل کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کو غزل کے مزاج کا جز بنا دیا ہے - اس شوخی اور طنز و مزاح کے عناصر غزل کی روایت میں شیخ، واعظ اور زاہد کے بیان میں تو ملتے تھے لیکن حسن و عشق اور عاشق و معشوق کے معاملات کے بیان میں یہ رنگ ذرا مشکل ہی سے نظر آتا تھا - غالب پہلے شاعر ہیں جنہوں نے ان معاملات کے بیان میں بھی اس رنگ کو پیدا کر دکھایا - وہ اس طرح کہ غزل کی روایت میں عاشق اور معشوق کے معاملات سے متعلق ایسے مضامین جو فرسودہ ہو چکے تھے اور مضحکہ خیز معلوم ہوتے تھے، غالب نے ان کو اپنی غزل میں جگہ تو دی - لیکن اس طرح جیسے وہ ان کا خاکہ اڑا رہے ہیں اور ان پر طنز کے بھرپور وار کر رہے ہیں - غالب کے اس انداز سے جو شاعری پیدا ہوئی ہے وہ بہ ذات خود بھی اہم ہے - کیونکہ اس میں بڑی شگفتگی کا احساس پیدا ہوتا ہے لیکن اس سے زیادہ اہم یہ بات ہے کہ اس انداز سے غزل

کی روایت کو ایک نیا میدان ملا ہے - اور اس میدان میں اس کو ایک اہم صنف سخن کی حیثیت سے اپنے جوہر دکھانے کے مواقع نصیب ہوئے ہیں - یہ صحیح ہے کہ غالب کے بعد آنے والے غزل کے فن کار غالب کے اس انداز فن کو پوری طرح برتنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں لیکن غالب نے انہیں وہ راستے ضرور دکھا دیئے ہیں جن پر چل کر غزل کی صنف اپنے آپ کو فنی اعتبار سے نئی وسعتوں سے ہمکنار کر سکتی ہے -

یہ ایک حقیقت ہے کہ غالب نے روایت سے بہت استفادہ کیا ہے - اور اس کے اثر سے اپنے فن میں نہ صرف رنگینی اور رچاؤ کی خصوصیات پیدا کی ہیں بلکہ بعض ایسے پہلو بھی اس میں نمایاں ہوگئے ہیں جن کی وجہ سے نہ صرف غالب کے فن میں بلکہ خود صنف غزل کے فن میں ایک نئے رنگ و آہنگ نے اپنی جگہ بنائی ہے - لیکن غالب اس روایت کے پرستار نہیں ہیں - انہوں نے اپنے فن کو اس روایت کی لکیر کا فقیر نہیں بنایا ہے - وہ تو اس روایت کے بندھنوں کو توڑ کر اس کے حدود سے باہر بھی نکلے ہیں ، اور انہوں نے اپنے فن کو بعض نئے تجربات سے بھی آشنا کیا ہے - ان تجربات کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں توازن ہے اور ان کی جڑیں روایت کی زمین میں پوری طرح پیوست ہیں - تجربہ جب روایت کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہوتا ہے اسی وقت فن کی دنیا میں اسے حیات جاوداں ملتی ہے - غالب نے اپنے تجربے کو روایت سے پوری طرح ہم آہنگ کیا ہے - اسی لئے ان کے فن میں اس کی ایک مستقل حیثیت نظر آتی ہے -

بات یہ ہے کہ غالب نے اپنے فن میں تجربے کے یہ چراغ صرف تجربے ہی کی خاطر روشن نہیں کئے - ان کے پیچھے تو ان کے لئے احساسات اور نئے شعور کا ہاتھ ہے - اور ان نئے احساسات و شعور کی وجہ سے ان کے یہاں وہ نئے موضوعات و مضامین پیدا ہوئے ہیں جن کے اظہار و ابلاغ کے لئے انہیں ان تجربات سے کام لینا پڑا ہے - یہی سبب ہے کہ ان کے تجربات میں اختراع کا رنگ نظر نہیں آتا اور صرف صناعی کی صورت دکھائی نہیں دیتی - اپنی ایک بنیاد رکھتے ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کو شاعر کے خیال ، مواد اور موضوع اور اس کے صحیح جمالیاتی اظہار کے شعور نے پیدا کیا ہے - غالب نے بدلتے ہوئے حالات، نئے افکار و خیالات، اور نئے جمالیاتی تصورات سے ان تجربات کا

خمیر اٹھایا ھے - اسی لئے ان میں ایک استواری نظر آتی ھے اور ایک موالست کا احساس ھوتا ہے -

غالب کے ان تجربات کی جھلک سب سے پہلے تو ان کی شاعری کے وزن و آھنگ میں دکھائی دیتی ھے - غالب نے اپنے موضوعات کو بحروں کی مناسبت سے وزن و آھنگ کو استعمال کیا اور ان میں ایک مکمل ھم آھنگی پیدا کی - ان کی شاعری میں بحروں کا انتخاب ، بعض خاص زمینوں کا استعمال ، الفاظ کی مخصوص در و بست ، ترکیبوں کی تراش - ان سب میں، ان کا تجرباتی مزاج اپنی جھلک دکھاتا ھے - ظاھر ھے کہ غالب نے یہ سب کچھ اپنے موضوع کے اظہار و ابلاغ کے لئے کیا ھے - غالب نے اپنے وزن و آھنگ میں جو شگفتگی اور شادابی اور ، بلند آھنگی پیدا کی ھے اور اپنی شاعری کو جس نغمگی اور موسیقیت سے روشناس کیا ھے ، اس کی مثال اردو شاعری میں ان سے قبل نہیں ملتی - یوں محسوس ھوتا ھے جیسے ان کے فن میں ترنم کے چشمے سے پھوٹ رہے ھیں اور نغموں کے دریا سے موجزن ھیں - غالب کا کمال یہ ھے کہ وہ اپنی شاعری میں اس صورت حال کو پیدا کرکے اس تجربے کے صوتی آھنگ کو سامنے لا کر کھڑا کر دیتے ھیں جس کی گہرائی کا کوئی ٹھکانا نہیں - اور جس کا نتیجہ یہ ھوتا ھے کہ ان کے موضوع کی مکمل تصویر مع ایک وسیع پس منظر کے آنکھوں کے سامنے آ کر کھڑی ھو جاتی ھے -

وزن و آھنگ کے اس نئے تجربے کے ساتھ ساتھ غالب نے اپنے فن میں علامتوں اور اشاروں کے استعمال کا بھی ایک اھم تجربہ کیا ہے - علامتوں اور اشاروں کا استعمال تو غالب سے قبل بھی اردو شاعری کی روایت میں عام تھا - خصوصیت کے ساتھ غزل کے فن میں اس کی ایک روایت موجود تھی - لیکن غالب نے اس روایت کو کچھ اور بھی استوار کیا - انھوں نے غزل کی روایتی علامتوں اور اشاروں میں نیا خون زندگی دوڑایا - اور اپنے وسیع اور ھمہ گیر موضوعات کو ان کے ذریعے سے ظاھر کرنے کی کوشش کی - اس طرح یہ روایتی علامات و اشارات نئی معنویت سے آشنا ھوئے اور ان کے دامن میں نئی وسعتیں پیدا ھوئیں - لیکن غالب اپنے موضوعات کی گہرائی اور گیرائی کے پیش نظر اپنے اظہار و ابلاغ کو صرف ان علامتوں اور اشاروں ھی تک محدود نہیں کر سکتے تھے - انھیں تو اپنے اظہار و ابلاغ کے لئے کچھ نئے اشاروں اور علامتوں کی ضرورت بھی تھی - چنانچہ انھوں نے ان نئی علامتوں اور اشاروں

کو تخلیق بھی کیا - لیکن اس میں بھی ان کی صناعی اور ایجاد پسندی کو دخل نہیں تھا - اس کا منبع بھی ان کے موضوعات کا اظہار و ابلاغ کا جمالیاتی احساس و شعور تھا - اسی احساس و شعور کے زیر اثر انہوں نے بعض ایسی علامتوں سے کام لیا جو ان کی جذباتی اور ذہنی کیفیت کے ساتھ مناسبت رکھتی تھیں - غالب زمانے کے زخم خوردہ تھے - ان کی زندگی میں باوجود شگفتگی اور شادابی، تیزی و تندی ، جولانی اور طراری کے ایک سلگنے والی کیفیت تھی - یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس صورت حالات کی مناسبت سے خون ، آگ ، دھواں اور شور وغیرہ کے لئے اشاروں اور علامتوں سے کام لیا اور ان کے ذریعے سے اپنے فن میں اظہار و ابلاغ کا ایک نیا عالم پیدا کیا - پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ اپنی اس ذہنی کیفیت کے باوجود وہ زندگی سے مایوس نہیں تھے - ان کی نگاہیں تو ایک نئی دنیا کے پیدا ہونے کا منظر دیکھ رہی تھیں - چنانچہ اس صورت حال نے انہیں سحر ، زنجیر ، خواب ، بیداری ، ستارے ، ماہتاب اور اسی طرح کے بہت سے اشاروں اور علامتوں کی تخلیق کی طرف راغب کیا - اور ان علامتوں اور اشاروں میں ایسا جادو تھا کہ غالب کے بعد اردو شاعری میں ان کے استعمال کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا اور موجودہ دور میں جدید سے جدید اردو شاعروں نے اس سے اظہار و ابلاغ کے سلسلے میں بڑے بڑے کام لئے - نتیجہ یہ ہوا کہ اردو شاعری کی دنیا ہی بدل گئی -

یہ سب کچھ غالب کا فنی کارنامہ تھا - انہوں نے اردو شاعری میں علامت نگاری کو ایک اسلوب کی حیثیت سے مستقل حیثیت دی اور نہ صرف ابلاغ بلکہ جمالیاتی اظہار کے لئے بھی اس کو اس طرح استعمال کیا کہ اردو شاعری میں اس نے ایک رجحان کی حیثیت اختیار کر لی - اور غالب جمالیاتی اظہار کے اس رجحان کو برتنے اور عام کرنے میں اس وجہ سے کامیاب ہوئے کہ وہ اس کی اہمیت کا گہرا شعور رکھتے تھے - اور ان کے خیال میں ناز و غمزہ کی بات دشنۂ و خنجر میں اور مشاہدۂ حق کی گفتگو بادۂ و ساغر میں کرنا شاعر کے لئے ناگزیر ہے -

غالب نے اپنے فن میں رمزیت اور ایمائیت کے ایک نئے انداز کو وجود میں لانے کا تجربہ بھی کیا ہے - غالب سے قبل اردو شاعری میں رمز و ایما کی روایت تو موجود تھی لیکن اس میں یہ بانکپن نہیں تھا جو غالب کے ہاتھوں پیدا ہوا - وہ تہ داری کی کیفیت نہیں تھی جو غالب کے ہاتھوں وجود میں

میں آئی۔ غالب نے اپنے فکر کی نسبت سے اس رمز و ایما کو زیادہ تہہ دار بلکہ کسی حد تک پیچدار بنا دیا اور اس طرح اس کی حدیں ابہام سے جا ملیں۔ یہ ابہام آج کی شاعری کے لئے ایک اسلوب کی حیثیت رکھتا ہے۔ غالب نے آج سے سو سال قبل اس ابہام کو ایک اسلوب بنا دیا۔ لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ ابہام کو انہوں نے اپنے حدود میں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں ابہام سے زیادہ اس کی لطافت کا احساس ہوتا ہے۔ اور جو ابہام ان کے یہاں نظر آتا ہے اس کو ایک لطیف ابہام کہنا چاہئے۔ یہ لطیف ابہام اس رمزیت اور ایمائیت ہی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے جس کو غالب نے بڑی چابک دستی کے ساتھ اپنے فن میں برتا ہے۔

اس رمزیت ایمائیت اور لطیف ابہام کی وجہ سے اردو شاعری کو ایک نیا اسلوب ملا۔ یہ اسلوب غالب کے ساتھ مخصوص ہے، اور ان کا فن اس اسلوب سے بھی پہچانا جاتا ہے۔ اس اسلوب نے انہیں اپنے زمانے میں بڑی حد تک اجنبی بنا دیا تھا، اور اسی لئے وہ اس زمانے میں عام نہ ہو سکا۔ شاید اس وجہ سے کہ غالب ایک عظم شاعر اور فن‌کار کی حیثیت سے اپنے زمانے سے تقریباً سو سال قبل پیدا ہوئے۔ وہ اپنے زمانے میں شاعر فردا تھے۔ انہیں موجودہ دور میں پیدا ہونا چاہئے تھا۔ ان کا احساس و شعور اور جمالیاتی اظہار موجودہ دور سے مناسبت رکھتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ موجودہ دور میں اس اسلوب نے تقریباً تمام جدید شاعروں کے دلوں میں اپنی جگہ بنائی اور ان کے فن کا عام معیار یہی اسلوب قرار پایا۔ اس اعتبار سے غالب کی حیثیت ایک ایسے پہاڑ کی ہے جس کے دامن میں پرورش پانے والی ہر چیز اس کی مخصوص آب و ہوا سے متاثر ہوئی ہے۔

زبان و بیان کو غالب نے بہ ذات خود ایک فن بنا دیا ہے۔ زبان، اس میں شبہ نہیں، کہ اظہار کا ذریعہ ہے لیکن ایک عظیم شاعر کے ہاتھ میں اس کی حیثیت ایک فن کی ہو جاتی ہے۔ ایک ایسا فن جو اظہار و ابلاغ کے ساتھ ساتھ حسن و جمال کے لور کو بکھیرتا ہے اور شاعری میں ایک چراغاں کی سی کیفیت کو پیدا کر دیتا ہے۔ غالب نے زبان میں ایک اجتہادی شان پیدا کی ہے۔ اس کو رنگین اور پرکار بنایا ہے۔ اس میں گل بوٹے سے کھلائے ہیں۔ اس میں ایک عجب طرح کی جگمگاہٹ اور تابانی سی پیدا کی ہے۔ اس کو ہیرے کی طرح تراشا ہے۔ اس میں نئے رنگ بکھیرے ہیں۔ نئے پہلو پیدا کئے ہیں۔

الفاظ کو آسمان پر بکھرے ہوئے ستاروں کی طرح یک جا کیا ہے - اس میں تزئین و آرائش نہیں ہے ، فطرت کا حسن زیادہ ہے - یہی وجہ ہے کہ حسن کی فطرت اس میں قدم قدم پر اپنا جلوہ دکھاتی ہے - غالب نے زبان کی اصلاح نہیں کی ہے لیکن ایک نئی زبان کو پیدا کیا ہے - اس میں شبہ نہیں کہ ان کی یہ زبان عام لوگوں کی زبان نہیں - اس میں ایک ادبی رنگ و آہنگ ہے - اور اس کو صحیح معنوں میں شاعری کی زبان کہا جا سکتا ہے - غالب سے قبل شاعری کی زبان میں یہ ادبی رنگ و آہنگ کم تھا - وہ بولنے کی زبان سے زیادہ قریب تھی - فارسی کے اثرات غالب کی پیدا کی ہوئی زبان میں غالب ہیں - لیکن ان اثرات کو پیدا کرنے میں ان کی کسی شعوری کوشش کو دخل نہیں تھا - وہ تو ان کے مزاج کا جز تھی - اس کا رنگ تو ان کی شخصیت میں رچا ہوا تھا - یہی وجہ ہے کہ فارسی کا رنگ و آہنگ ان کی زبان میں اجنبی اور نامانوس نہیں معلوم ہوتا - برخلاف اس کے وہ تو اس تہذیب کی تمام رنگینیوں اور رعنائیوں کو سامنے لا کر کھڑا کر دیتا ہے جس نے غالب کو پیدا کیا تھا - اور جس کی رنگینیاں اور رعنائیاں ان سے قبل کئی سو سال تک اس سر زمین پر رنگ بکھیرتی رہی تھیں -

غالب نے آردو شاعری کو ایک ایسی زبان دی جو صرف رنگین اور پرکار ہی نہیں تھی ، اس میں احساس کی شدت ، جذبے کی صداقت، شعور کی گہرائی ، فکر کی گہرائی اور نظریے کے مکمل اظہار و ابلاغ کی بڑی صلاحیتیں تھیں - غالب کی شاعری انہیں تمام عناصر سے عبارت تھی - چنانچہ یہی عناصر اس مخصوص زبان کی تخلیق کے محرک ہوئے جو غالب کا ایک اجتہادی کارنامہ ہے - گذشتہ سو سال میں اردو کے ان تمام شاعروں کے یہاں یہ زبان اپنی جھلک دکھاتی ہے جن کی شاعری میں احساس کی شدت ، جذبے کی صداقت، شعور کی گہرائی ، فکر کی گیرائی اور نظریے کی پختگی استزاج صحیح جمالیاتی اظہار کا تقاضا کرتا ہے -

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو غالب جدید شاعری اور اس کے مختلف فنی رجحانات اور جمالیاتی میلانات کے پیش رو نظر آتے ہیں - اور ان کے فنی اور جمالیاتی اجتہاد کے اثرات کا رنگ و آہنگ نہ صرف جدید شاعروں کی شاعری بلکہ اعلیٰ درجے کے نثر نگاروں کی نثری تخلیقات میں بھی اپنی جھلک دکھاتا ہے -

غرض غالب بڑے ہی پہلودار فن‌کار تھے - اردو شاعری میں وہ ایک ادائے خاص سے نکتہ سرا ہوئے اور ان کا فن یاران نکتہ دان کے لئے صلائے عام کا پیغام ثابت ہوا - انہوں نے اپنے فن سے جمالیاتی اقدار کی نئی دلیائیں ہی پیدا نہیں کیں ، ان اقدار کو موجودہ دور کے مزاج کا جز بنا دیا - چنانچہ موجودہ زمانے میں غالب کے فن کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی دوسرے شاعر کے فن کو حاصل نہ ہوسکی - دور جدید میں مختلف خیالات و نظریات اور اور مختلف اسالیب و انداز بیان رکھنے والے شاعروں اور ادیبوں کو جس طرح غالب کے فن نے متاثر کیا ہے شاید کسی دوسرے فن‌کار نے اس طرح متاثر نہیں کیا -

اس لئے شاید یہ کہنا بے جا نہیں کہ اردو شاعری کی روایت میں غالب کے فن کی حیثیت وہی ہے جو جغرافیائی اعتبار سے کسی ملک میں ایک سر بہ فلک پہاڑ کی ہوتی ھے -

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ھے یاران نکتہ دان کے لئے

من ہمایم مگس چرا باشم (غالب)

ڈاکٹر عبدالغنی

اس بات میں شک نہیں کہ مرزا غالب شاعرانہ فطرت لے کر آئے تھے لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مرزا پیدائشی نواب تھے اور نواب بھی ایسے نہیں جو یہیں اسی برصغیر میں کسی تاریخی حادثہ کی بناء پر بنے ہوں - یا ان کے والد کو یہ مرتبہ حاصل ہوگیا ہو بلکہ پشتہا پشت سے ان کے خاندان میں عظمت چلی آرہی تھی - سلاجقۂ عظیم کے ساتھ ''پیوند ہم گوہری'' رکھتے تھے - اوز ان کی فطرت میں عظمت کے پشتینی اثرات موجود تھے - اس میں شک نہیں کہ محرکات کی تبدیلی سے نسلی اثرات میں تبدیلی ہو سکتی ہے - اور وہ ایک صورت پر قائم نہیں رہتے - لیکن توارث کے ذریعے ان اثرات کے انتقال میں جو جبر اور لزوم موجود ہے اسے تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے - تعلیم ، تربیت ، ماحول تمام مل کر ان نسلی اثرات کو ایک خاص صورت دے سکتے ہیں - لیکن ان کا استیصال محال ہے - بنا بریں مرزا غالب اپنی فطرت میں عظمت کے خاص ممکنات لے کر پیدا ہوئے تھے - ان ممکنات نے ان کی طبیعت میں سرشاری کی ایک خاص کیفیت زندگی بھر قائم رکھی - اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کی شخصیت ، ان کا اسلوب اور ان کی فکر ہمیں عظمت کے ایک خاص معیار پر نظر آتے ہیں -

تہذیبی روایات کی نمائندگی اور اقدار عالیہ سے وابستگی کے لحاظ سے مرزا غالب ہمیں ایک محترم مقام پر فائیز دکھائی دیتے ہیں - یہ مقام مرزا داغ کو حاصل نہ ہو سکا حالانکہ وہ بھی نواب زادے تھے - اس کی وجہ ظاہر ہے - مرزا داغ کی والدہ کا کردار ادب اردو کے ہر طالب علم پر واضح ہے - اس کے اثرات مرزا داغ کی فطرت سے محو نہ ہو سکے - بلکہ وہ مختلف حیلوں سے ان اثرات کو اہل نظر کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنے میں کوشاں رہے اور نفسیاتی اعتبار سے ان کی شخصیت ہمارے لئے موضوع فکر بن گئی - لیکن

مرزا غالب اس لحاظ سے کسی نفسیاتی الجھن میں مبتلا نہیں تھے۔ ان کی والدہ جہاں ایک معزز خاندان کی دختر تھیں وہاں سیرت کے اعتبار سے بھی لیک اختر تھیں۔ مرزا غالب صحیح معنوں میں انجیب الطرفین تھے ۔ اپنے والد اور اپنی والدہ دونوں کی طرف سے ان کی فطرت کو اجابت اور عظمت کے اوصاف عطا ہوئے تھے ۔ اب اگر ان اوصاف نے انہیں زندگی بھر مخمور رکھا تو وہ بالکل حق بجانب تھے ۔ مرزا غالب کو زیر بحث لاتے ہوئے ان کے مزاج کی اس کیفیت کو نہ تو ہم نظر انداز کر سکتے ہیں اور نہ ہی ان وقیع نتائج سے غافل رہ سکتے ہیں ۔ جو اس کیفیت کے باعث پیدا ہوئے ۔

مرزا غالب نے جس ماحول میں پرورش پائی اس سے ان نسلی اثرات کو پنپنے کا موقع ملا۔ برطانوی تسلط کے باعث پاکستان اور بھارت میں رہنے والے اچھے اچھے انجیب الطرفین مسلمانوں کے خون میں وہ نسلی اثرات دب کر رہ گئے ہیں جو آج سے ڈیڑھ صدی پہلے کسی مزاحمت کے بغیر نشو و نما پایا کرتے تھے ۔ لیکن مرزا غالب کا عہد طفلی اس قسم کے معاندانہ ماحول سے محفوظ تھا لہذا ان کی ممکنات فطرت اس طرح نشو و نما پاتی رہیں جس طرح ایک نخل برومند اگنے ہی مناسب اور موزوں غور و پرداخت کے سبب برابر بڑھتا چلا جاتا ہے ۔ یہ تو درست ہے کہ ان کے دل اور دماغ کی تہذیب کے لئے غیر معمولی قسم کے اساتذہ نہیں تھے ۔ لیکن یہ کمی ہولے ہولے زمانے نے پوری کر دی ۔ مرزا غالب حساس عظمت سے سرشار رہ کر زندگی بسر کرنا چاہتے تھے اور معاصرین سے اپنی عظمت تسلیم کرانا چاہتے تھے ۔ لیکن زمانے نے انہیں بار بار جھٹکے دیئے ۔ وہ ابھی اپنی پاک طینت ماں کی گود میں ہی تھے اور ایک لاڈلے شاہزادے کی طرح پرورش پارہے تھے کہ ان کے پہلو میں ایک خار رکھ دیا گیا ، جس کی کسک نے ان کے دل میں احساس کہتری پیدا کیا ۔ اور نتیجتاً اس احساس نے اس احساس عظمت کو دوآتشہ کر دیا ، جو ان کی فطرت کا حقیقی راز تھا ۔ انہیں محسوس ہوا کہ یہ عیش و تنعم انہیں اپنے باپ کی وجہ سے حاصل نہیں ہوا بلکہ ننہال والوں کا احسان ہے ۔ اس احساس نے ان کے دل میں یہ عزم راسخ پیدا کر دیا کہ وہ اپنے اجداد کی طرح عزت و احترام حاصل کرکے رہیں گے خواہ وہ شعر و سخن کے ذریعے ہی کیوں نہ ہو ۔

زمانے نے ایک اور کروٹ لی اور ان کے ہاتھ سے اسباب عیش تقریباً چھین لئے گئے ۔ ان کی خاندانی پنشن پر کاری ضرب اپنوں کی طرف سے لگی ۔

مرزا غالب کا ردعمل بھی شدید تھا - انہیں جلد محسوس ہو گیا کہ اب سوال صرف عیش و عشرت کا نہیں بلکہ اس سے زیادہ نام و نمود کا مسئلہ ہے اور خاندان کی عظمت کو بٹہ لگ رہا ہے - اس طرح طوفان حوادث اور مرزا غالب کے درمیان وہ کشمکش شروع ہو گئی جس نے جہاں مرزا کو مسلسل اور متواتر ایک خاص رفعت پر رکھا وہاں علم و ادب کو بھی بے بہا جواہر پارے عطا کر دئے - لطف کی بات یہ ہے کہ صرف پنشن کا مسئلہ ان کے لئے چیلنج نہ بنا بلکہ شعر اردو اور شعر فارسی کا جو اسلوب اس زمانے میں رواج پذیر ہو چکا تھا وہ بھی ان کے لئے درد سر کا موجب بن گیا - اب مرزا غالب کو خاص قسم کی روایات عزیز تھیں وہ روایات جو ان کے خون کا جزو تھیں جو ان کی نسلی عظمت کے مترادف تھیں اور جنہیں وہ اپنی اسلی عظمت کا مظہر سمجھتے تھے - ان سے انحراف ان کے لئے اپنی روح سے انحراف تھا - اس لئے فکر و اسلوب کے لحاظ سے روایات کے اس معیار کو قائم رکھنا ان کے لئے لابدی ہو گیا - اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی خاطر انہوں نے تادم آخر جہاد جاری رکھا -

زمانے نے مرزا غالب سے مطالبہ کیا کہ بلندیوں کو ترک کرکے نیچے عام سطح پر آ جاؤ مگر انہوں نے نہ مانا - اسی میں ان کی عظمت پنہاں ہے - لباس ، خوراک ، رہائیش کا ایک خاص معیار تھا ، جسے اپنی معمولی سی آمدنی کے باوجود انہوں نے کبھی ترک نہ کیا - نشت و برخاست ، وضع قطع ، عادات و خصائل ، اخلاق و اطوار ہر بات میں سلجوقیوں والا وہی دیرینہ شاندار معیار برقرار رہا - خطابات سے لگاؤ ، درباری اعزاز کی خواہش ، انگریز حکام سے ملاقات کے وقت اپنے وقار کا خیال ، دوسروں کی مدح و ستائش کے وقت فطرت کی دولختی جو انہیں مورد طعن بناتی تھی ، یہ ساری باتیں ہمارے سامنے "تخمۂ افراسیاب" میں سے اس والا فطرت کو موجود کر دیتی ہیں جو برابر کوشاں ہے کہ اس کی نسلی شان میں فرق نہ آنے پائے- اپنی ناداری کا یہ عالم ہے کہ قرض لے کر شراب پیتے ہیں ، مگر دل میں آرزو ہے کہ توفیق ارزانی ہو تو کم از کم اپنے شہر میں کوئی بھوکا نہ رہنے دیں - ادھر وبا میں دوسرے کے ساتھ مل کر مرنے کو بھی اپنی شان کے خلاف تصور کرنا اور ادھر غریبوں کی حاجت روائی کرکے اپنی شان امارت کا اظہار کرنا بہمہ وجوہ قرون وسطیٰ کے امراء کی ذہنیت کا مظاہرہ

ہے جو اپنے آپ کو "ہما" تصور کرتے تھے - اور گوارا نہیں کرتے تھے کہ مکھیوں کی طرح نجاست پر بیٹھیں ، یعنی کوئی ایسی حرکت کریں جس سے فطرت کی پستی ظاہر ہوتی ہو -

مرزا غالب کی شخصیت کا یہ راز ان کی شعری تخلیقات میں بھی موجود ہے- شاہ نصیر اور ذوق کے مقلدین نے انہیں عام محاورہ کا پابند کرنا چاہا تھا مگر روش عام اختیار کرنے سے ان کی فطرت ابا کرتی تھی - ان کے نزدیک انوری ، خاقانی ، نظامی اور حافظ کی روش قابل تقلید تھی - یہی وہ لوگ تھے جو ان کی روح کے قریب تر تھے اور ذہنی طور پر انہیں اس ماحول میں پہنچا دیتے تھے جو ہر لحاظ سے انہیں عزیز تھا - وہ عرفی ، نظیری ، ظہوری ، صائب اور بیدل کی بھی تقلید کرنا چاہتے تھے کیونکہ ان شعراء نے اساتذۂ قدیم کی ان روایات کو قائم رکھا تھا جو مرزا کو عزیز تھیں - اس لئے دہلی والوں کے اعتراضات کے باوجود انہوں نے کہہ دیا : گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل ، انہوں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ اردو کو مقامی محاورہ کی بہتات کے باعث ہندی‌نژاد نہیں بننے دیں گے بلکہ رشک فارسی بنا ڈالیں گے - اور انہوں نے فی‌الواقعہ تراکیب ، تشبیہات اور استعارات کے اعتبار سے اردو کو رشک فارسی بنا کر ایک عظیم کارنامہ انجام دیا - اردو زبان پر یہ احسان اسی عظمت کا ہے ، جو غالب کی فطرت میں مضمر تھی - بعد میں اسی حسن بیان نے اقبال کے لئے راہ صاف کی - مرزا غالب کو قضیۂ پنشن کے سلسلہ میں کلکتہ جانا پڑا وہاں بھی پست فطرت لوگ موجود تھے اور غالب کو اساتذۂ قدیم کی راہ سے ہٹاکر عام راہوں پر چلانا چاہتے تھے - ان کی سرتوڑ کوشش تھی کہ غالب قتیل اور واقف کے متبع بن جائیں مگر وہاں بھی ان کی والا نسبی آڑے آئی اور انہوں نے برملا کہہ دیا کہ 'من ہما یم مگس چرا باشم'- اس لئے اگر مرزا غالب کا اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کلام اساتذۂ فارسی کے معیار پر پورا اترتا ہے تو لاریب یہ اس روح کا اعجاز ہے جو انہیں ورثہ میں ملی تھی - ہم برہان قاطع کے سلسلہ میں بھی اسی روح کو مصروف پیکار دیکھتے ہیں -

فکر کی دنیا میں بھی غالب ہمیں ہما نظر آتے ہیں - رکیک اور مبتذل خیالات کو انہوں نے کبھی قبول نہ کیا - انسان کے متعلق جو بات بھی کہی فطرت انسانی میں ڈوب کر کہی اور کائنات کے جو اسرار بیان کئے وہاں تک صرف خواص کی نگاہیں پہنچ سکتی ہیں - مقدار افکار کی بجائے ہمیشہ

نوعیت افکار ان کا معیار رہا - 'نہ گویم تالہ باشد نغز غالب'۔ ان کے اس مصرعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اپنے آپ پر کس قدر سخت پابندیاں عائد کر رکھی تھیں - یہ پابندیاں زمانے کے چیلنج کے مقابلے میں سپر کا کام دیتی تھیں اور ان کو شکست سے بچاتی تھیں - جب وہ اپنے آپ کو غالب مغلوب کہتے ہیں تو دراصل یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حوادث زمانہ نے مجھے مغلوب کرنا چاہا مگر میں غالب ہی رہا - یہی وجہ ہے کہ جب وہ کمیں گاہ سے اپنی ذات اور حیات و کائنات کا جائزہ لیتے ہیں تو عجیب و غریب افکار بیان کرتے ہیں اور پتہ چلتا ہے کہ ایک دیدہ ور ہرشئے کو بے نقاب کرکے رکھ دینا چاہتا ہے حتیٰ کہ خالق کائنات بھی اس کی جرأت افکار کی تاب لاتا نظر نہیں آتا - ظاہر ہے فکر کی دنیا میں بھی غالب یہی کہتے ہیں کہ میں عظیم ہوں -

ایام کہولت میں بھی غالب کی عظمت نے اپنے آپ کو بڑی آب و تاب کے ساتھ ظاہر کیا اور ایک ایسی راہ نکالی کہ جس کو دیکھ کر ہر ایک انگشت بدندان رہ گیا - انہوں نے زندگی بھر پامال راہوں سے احتراز کیا تھا اور جب قویٰ مضمحل ہوگئے ، فکر و اسلوب کا سابقہ معیار قائم رکھنا ناممکن ہو گیا ، انہوں نے ادب اردو کو ایک نئی چیز دے دی جو دنیائے ادب میں منفرد ہے اور یہ ان کی بصورت مکالمہ مکتوب نگاری ہے - ان مکتوبات میں مزاج شناس غالب ایسے ہلکے پھلکے انداز میں باتیں کرتا ہے کہ پڑھنے والے کی طبیعت شگفتہ ہو جاتی ہے اس لحاظ سے مشرق و مغرب کے کسی ادیب کے خطوط غالب کی اردوئے معلیٰ کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے -

اب ذرا اس تضاد پر نسبتاً تفصیل سے غور کر لینا مناسب ہوگا جو ہما اور مگس میں موجود ہے - ہما ایک فرضی پرندہ سہی لیکن اس کے ساتھ بڑے وقیع معانی وابستہ ہو چکے ہیں - ہما اپنی احتیاج کو درخور اعتنا نہیں سمجھتا لیکن دوسروں کے لئے آیۂ رحمت ہوتا ہے - جس کسی کے سر پر اس کا سایہ پڑتا ہے وہ والا قدر اور بلند منزلت بن جاتا ہے - گدا پر اس کا سایہ پڑا اور وہ شہنشاہ زمان بن گیا - اب مگس ہر لمحے اپنی احتیاج رفع کرنے کے درپے رہتی ہے اور اس بات کا اسے قطعاً خیال نہیں رہتا کہ اپنی اشتہا کو دور کرنے کے لئے کس قسم کی اشیاء کو اس نے چاٹا - نہ اسے یہ تمیز ہوتی ہے کہ صاف اور ستھری ، پاکیزہ اور لطیف چیزیں کس طرح اس کے آ بیٹھنے سے دم بھر میں غلیظ اور کثیف بن جاتی ہیں - پست فطرت لوگ بھی

جب شاعری کا دم بھرتے ہیں تو یہ نہیں دیکھتے کہ انہوں نے اپنے دل و دماغ کو ناقص مآخذ سے غذا بہم پہنچائی اور نہ ہی اس بات کا انہیں دھیان ہوتا ہے کہ ان کے معیار پست کی وجہ سے الفاظ اور معانی بھی رکیک ہوگئے - لیکن مرزا غالب اپنے دل و دماغ کی آبیاری کے لئے صرف نظیف اور لطیف سرچشموں کا رخ کرتے ہیں اور وہ بھی ایک گرسنہ چشم گداگر کی طرح نہیں بلکہ سیرچشم عفیف صاحب دل کی طرح - اور پھر جس لفظ پر ان کا سایہ پڑتا ہے وہ گنجینۂ معنی بن جاتا ہے اور جس خیال کو بیان کرتے ہیں وہ رفعت میں ہمدوش ثریا ہو جاتا ہے -

مرزا غالب کی اس اکسیر صفت خلاق کی ہم صرف دو ایک مثالوں پر اکتفا کریں گے - جن ایام میں مرزا مقدمۂ پنشن کی وجہ سے پریشان تھے اور اپنوں کی بیوفائی کی وجہ سے نالاں ، انہوں نے اپنی حالت کا نقشہ ایک غزل مسلسل میں کھینچا - آپ سارے ادب اردو کو کھنگال لیجئے - حسن و جمال کے لحاظ سے اس کی مثال نہیں ملے گی - اس کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے :

اے تازہ واردان بساط ہوائے دل — زنہار اگر تمہیں ہوس ناؤ نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو — میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے
ساقی بجلوہ دشمن ایمان و آگہی — مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے
یاشب کو دیکھتے تھے کہ ہرگوشۂ بساط — داماں باغبان وکف گلفروش ہے
لطف خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ — یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے
یا صبحدم جو دیکھیے آکر تو بزم میں — نے وہ سرور وسوز نہ جوش و خروش ہے
داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی — اک شمع رہ گئی ہے سووہ بھی خموش ہے
آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں — غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

غزل کے ان اشعار کے بعد مرزا غالب کے مندرجہ ذیل شعروں کا مطالعہ بھی احظاظ نفس اور بصیرت افروزی کا موجب ہوگا جو انہوں نے بہادر شاہ ظفر کو مخاطب کرکے لکھے ہیں :

تیرا انداز سخن شانۂ زلف الہام — تیری رفتار قلم جنبش بال جبریل
تجھ سے عالم پہ کھلا رابطۂ قرب کلیم — تجھ سے دنیا میں بچھا مائدۂ بذل خلیل
بہ سخن اوج دہ مرتبۂ معنی و لفظ — بہ کرم داغ نہ ناصیۂ قلزم و نیل

غزل اور قصیدے کے یہ اشعار ہمارے خیال کی بخوبی تائید کرتے ہیں۔ جیسا کہ پیشترازیں ذکر کیا گیا ہے، غزل مقدمۂ پنشن کے زمانے کی تخلیق ہے اور نسخۂ شیرانی کے حاشیے پر پہلے پہل درج ہوئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اس حقیقت کا پوری طرح ظہور شروع ہوا جسے مرزا غالب نے لفظ ''ہما'' سے تعبیر کیا ہے۔ زمانے نے انہیں جھنجھوڑا۔ ان کی شخصیت میں ایک تہلکہ رونما ہؤا۔ اور ان کی حقیقی قدر و قیمت کا اظہار ہونے لگ گیا۔ یہ سفر کلکتہ کا زمانہ ہے (۱۸۲۷ء تا ۱۸۲۹ء)۔ اس سے پہلے ان کے پاس الفاظ اور افکار دونوں تھے۔ صرف جذبہ کی کمی تھی۔ قضیۂ پنشن نے وہ کمی پوری کردی۔ وہ اب مجسم درد و سوز تھے اور جذبہ اور فکر کا حسین امتزاج ہو چکا تھا۔ اسی لئے سفر کلکتہ کے زمانہ کی تخلیقات میں ہم دیکھتے ہیں کہ تخیل میں عجیب و غریب لکھار اور معنویت موجود ہے۔ یاران وطن کی بے مہری نے مرزا غالب کی تخلیقی قوتوں کو یک لخت ارتقاء کی آخری منزل پر پہنچا دیا۔ اس زمانے کی غزل اور مثنوی، قصیدہ اور قطعہ ہر چیز جذبۂ تخلیق کی بلوغت کا اظہار کرتی ہے۔ اور بلوغت بھی ایسی جو بے مثل اور بے اظہر ہے۔ کٹھالی میں پڑ کر سونا کندن ہوتا ہے۔ اسداللہ خان آزمائش میں پڑا اور ایک لخت ہما بن گیا۔ حالات نے اچانک نامساعدت اختیار کی اور انہیں دبانا چاہا۔ مگر وہ دفعتاً اپنی تمام ممکنات فطرت کے پورے زور کے ساتھ ابھرے۔ اسی لئے وہ کلکتہ میں پہنچے ہیں اور یار لوگوں نے ان کے ساتھ عامیانہ سلوک روا رکھا ہے تو وہ کہتے ہیں۔ عزیزو مجھے دیکھنے کے لئے ایک اور نگاہ چاہئے۱۔

غزل اور قصیدے کے منقولہ بالا اشعار پر نگاہ ڈالئیے۔ غزل ذہانت اور فطنت کے بلوغ کے دور کی ہے۔ ایام پختگی کی فارسی اور اردو کی بہت سی غزلوں کا عالم بھی اسی طرح نرالا ہے۔ قصیدہ ایک بےدست وپا اور مفلوک الحال بادشاہ کی تعریف میں ہے۔ یعنی موضوع بالکل پست ہے۔ اب دیکھئے غزل اور قصیدہ دونوں میں مرزا غالب نے الفاظ کا استعمال کس چابکدستی اور کس بے مثال صناعی سے کیا ہے۔ ہم یہ الفاظ ادھر ادھر بھی پڑھتے رہتے ہیں لیکن مرزا غالب کے قلم سے ٹپکے ہیں تو جواھر ریزے بن گئے ہیں۔ اگ میں حسن بیان اور حسن خیال کا نہایت ھی دلآویز توازن رونما ہو چکا ہے۔ ممدوح اس قابل نہیں تھا کہ قصیدہ لکھتے ہوئے غالب کی طبیعت پر الہامی کیفیت طاری ہوتی۔ مگر یہ دیکھ کر

۱۔ اس نقطۂ نگاہ سے یہ شعر بھی خالی از لطف نہ ہوگا :

بیاورید گرا اینجا بود زباندانے — غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد

حیرت ہوتی ہے کہ الہامی کیفیت صرف طاری ہی نہیں ہوئی بلکہ اس میں عجیب و غریب آب و تاب پیدا ہوگئی ہے - حیات و کائنات کے متعلق بھی غالب کے افکار کی بداعت اسی طرح کی مختلف اور متعدد مثالوں سے ثابت کی جا سکتی ہے - اور ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ مرزا نے فرسودہ خیالات اور پامال باتوں کو بھی وہ آن بان عطا کی ہے کہ :

ناطقہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا کہیئے

یہ قصیدہ اس غزل کی نسبت کافی بعد کے زمانے کا ہے - اور اسی غرض کے کے لئے منتخب کیا گیا ہے کہ پتہ چل جائے مرزا غالب اپنی ہما صفتی کی بدولت کس طرح پست مضمون کو بلندیوں پر پہنچا دیتے ہیں -

ان تمام امور کے زیر نظر ہم بلاخوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ مرزا غالب کی فطرت میں جو عظمت موجود تھی اس نے ادبی دنیا کو بیش بہا تحائف عطا کئے جو بیان و خیال کا اعجاز ہیں -

غالب کے چند جمالیاتی تصورات

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

غالب کے جمالیاتی تصورات معلوم کرنے سے پہلے ہمیں جمالیات کے مفہوم سے ، جسے انگریزی میں (Aesthetics) کہتے ہیں ، آگاہی حاصل کر لینا مفید ہوگا - تاریخ جمالیات میں بام گارٹن* (۱۷۱۴ تا ۱۷۶۲ء) پہلا عالم جمالیات ہے جس نے فلسفہ حسن و فن کے لئے ایستھیٹک Aesthetics (جمالیات) کے لفظ کو اصطلاح کے طور پر استعمال کیا اور اسے رواج دیا ، نیز اسے فلسفے کا ایک علیحدہ و مستقل شعبہ قرار دیا - جمالیات کا علم اس اعتبار سے اپنے نام سے کہیں زیادہ قدیم ہے - لغوی اعتبار سے اس کا مفہوم وہ نہیں ہے جو اس سے اصطلاحاً لیا جاتا ہے - ایستھیٹک دراصل یونانی زبان کا لفظ ہے ، اور اس کے معنی ایسی شے کے ہیں جس کا ادراک حواس کے ذریعے کیا جاتا ہے ، لیکن بام گارٹن نے ایستھیٹکس (یا جمالیات) کے لفظ کو اصطلاح کے طور پر استعمال کیا اور اس سے اس علم کو تعبیر کیا ، جو احساس (feeling) اور ادراک (intellect) دونوں سے بحث کرتا ہے ، اور پھر اس علم کا اطلاق اس نے حسن پر کر دیا - یہ لفظ امتداد وقت کے ساتھ ساتھ بطور اصطلاح رواج پاتا رہا، اور آخر کار مستند طور پر فلسفۂ جمال کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا - چنانچہ آج تک اس کے مفہوم کے آفاق میں بتدریج وسعت و گہرائی پیدا ہو رہی ہے اور آئندہ میں ہوتی رہے گی (مفصل بحث کے لئے دیکھیے مصنف کی تاریخ جمالیات ، ۱ : ۳۵ببعد) -

اس جگہ اس امر کی بھی صراحت کر دی جاتی ہے کہ جمالیات کے علم میں حسن کے ساتھ فن سے بھی بحث کی جاتی ہے ، بالفاظ دیگر حسن اور فن دونوں جمالیات کے موضوع ہیں ، لیکن اس مضمون میں ہم غالب کے فقط چند ایک بنیادی تصورات حسن سے گفتگو کریں گے -

---

*Alexander Gattlieh Baumgarten (1714-1762)

جہاں تک غالب کے فلسفۂ جمال کا تعلق ہے ، یہ بات ہمیشہ ذہن نشین رہنی چاہئیے کہ وہ یورپ کے فلسفۂ جمال کی طرح لادینی (secular) نہیں ، بلکہ اس کی بنیاد اس عقیدے پر استوار ہے کہ یہ کائنات اللہ تعالیٰ کی تخلیق بالحق ہے اور جمیل اور جلیل ہے ، نیز اللہ تعالیٰ کا تخلیقی عمل حرکی dynamic و ارتقائی اور رنگ دوام سے مزاین ہے - یہ تصور جو بنیادی طور پر اسلامی ہے - غالب نے ہرنگ تغزل اس طرح بیان کیا ہے :

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

اس شعر کے مافیہ (content) کی تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی بنیاد مفصلۂ ذیل عقائد پر رکھی گئی ہے : اولاً ، یہ کائنات حسین ہے ، ثانیاً اس کی تحسین اللہ تعالیٰ کر رہا ہے جو خود بھی حسن مطلق ہے ، اور ثالثاً یہ عمل تحسین حرکی و ارتقائی ہے - ان عقائد کی تعبیر فلسفیانہ انداز میں اس طرح کی جا سکتی ہے کہ غالب کا نظریۂ حسن معروضی ، مابعد الطبیعاتی اور حرکی ہے - جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے یہ نظریۂ حسن بنیادی طور پر اسلامی ہے ، اور اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں ہم آیات قرآنی سے استشہاد کریں گے -

سب سے پہلے حسن کے لغوی معانی و مفہوم سے آگاہی حاصل کی جاتی ہے - حسن عربی زبان کا لفظ ہے ، جس کے معنی امام لغت راغب اصفہانی نے اپنی شہرۂ آفاق لغت المفردات میں یہ دئے ہیں : "حسن وہ شے ہے جو مسرت بخشتی ہے ، یا عقل ، خواہش یا حس کی رو سے مرغوب ہوتی ہے - حسن کا نقیض "سوء" ہے , جس کے معنی ہیں وہ شے جو انسان کے لئے غم لاتی ہے ، یہ غم چاہے دنیا کا ہو یا آخرت کا ، خواہ نفسیاتی ہو یا جسمانی یا محض معروج یا خارج سے تعلق رکھتا ہو ، جیسے جاہ و مرتبت یا مال و دولت کا جاتے رہنا (بذیل مادہ) - قرآن کریم بھی لفظ حسن کے اس لغوی مفہوم کی تصدیق کرتا ہے اور اس سے ایسی ہی شے مراد لیتا ہے جو دیکھنے والے کو مسرت بخشتی ہے -

لونها تسرالنظرین (۲ : ۶۹)
اس کا رنگ دیکھنے والوں کو مسرت بخشتا ہے -

یہ آیت قرآن حکیم کے ایجاز بلاغت کی حسین امثلہ میں سے ہے - اس میں فقط رنگ اور اس کی صفت سرور انگیزی کا ذکر کیا گیا ہے - ظاہر ہے یہ صفت رنگ کی ذاتی نہیں بلکہ اضافی ہے اور اس مبنیٰ حسن ہے ، جو اس آیت میں مضمر اصلی ہے ، او سرور انگیزی جس کی ذاتی صفت ہے اور جس کی حیثیت مطلق ہے - چنانچہ قرآن حکیم نے یہ کہہ کر کہ ''اس'' کا رنگ دیکھنے والوں کو مسرت بخشتا ہے ، اس واقعیت پر مہر تصدیق ثبت کردی کہ جو چیز سرور انگیز ہوگی وہ حسین بھی یقیناً ہوگی - اس آیت میں ایک نکتہ اور بھی قابل غور ہے اور وہ یہ کہ یہاں حسن کے لفظ کو محذوف کرکے اس حقیقت کو آشکارا کر دیا گیا ہے کہ حسن کی صفت مطلق سے ہر قلب انسانی آشنا ہے ، اور وہ اسے فطری طور پر پہچانتا اور محسوس کرتا ہے ، اور قلب کی یہ قوت انفعال جسے ''وجدان'' سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں ، حسن کی اس صفت سرور انگیزی کو معلوم کرنے کا معیار ہے -

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ہولہ بالا آیت میں حسن کے لفظ کو محذوف کرکے فقط اس کی صفت سرور انگیزی کو بیان کو دیا گیا ہے ، لیکن دوسری جگہ حسن کی اس صفت کا بظاہر کوئی ذکر نہیں ، لیکن لفظ ''جمال'' کو اس انداز سے فقرے میں استعمال کیا گیا ہے کہ جمال کی صفت سرور انگیزی خود بخود آشکارا ہو گئی ہے :

ولکم فیھا جمال حین تریحون و حین تسرحون (۶ : ۱۱)

اور تمہارے لئے چوپاؤں میں ، جب شام کے وقت چراگاہ سے واپس لاتے ہو اور صبح کو لے جاتے ہو ، جمال ہے -

اس آیت میں چوپاؤں کے متحرک و نظر افروز نظاروں کی سرور انگیزی کو ''جمال'' سے تعبیر کرکے اس حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ حسن و سرور لازم و ملزوم ہیں ، یعنی جو چیز حسین ہوگی وہ سرور انگیز ضرور ہوگی - اس سے معلوم ہوا کہ قرآن حکیم کے نزدیک حسن اور سرور ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں - چنانچہ جو شے حواس کے نزدیک ''حسن'' ہے اسی کو قلب ''سرور'' کہتا ہے - بہرحال ، قرآن مجید کے نزدیک اس کائنات کی ہر شے حسین ہے اور اسے ایسا اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے :

الذی احسن کل شیئٍ خلقه (۳۲: ۷)

وہ (اللہ تعالی ہے) جس نے جو چیز بھی تخلیق کی اسے حسین بنایا -

جہاں تک انسان کی خوبصورتی کا تعلق ہے ، وہ بھی اللہ تعالی کے اعجاز تخلیق کی مرحون منت ہے :

و صورکم فاحسن صورکم (۶۴ : ۳) -

اور تمہاری صورتیں بنائیں تو کیا ہی حسین صورتیں بنائیں -

مفصلہ بالا بحث سے ثابت ہوا کہ غالب نے اپنے محولہ بالا شعر میں جو جمالیاتی تصورات بیان کئے ہیں ان کی بنیاد قرآن مجید کی متذکرۂ بالا آیت پر رکھی گئی ہے - اس طرح زیر بحث شعر میں غالب نے حسن کا جو حرکی نظریہ پیش کیا ہے ، اس کا منبی بھی قرآن حکیم ہے - اس جگہ اس حقیقت کا اظہار کر دینا ضروری ہے کہ قرآن حکیم نے سب سے پہلے انسان کو اس واقعیت سے آشنا کیا ہے کہ حسن جامد و ساکن نہیں بلکہ حرکی و ارتقائی ہے :

کل یوم ھو فی شان (۵۵ : ۲۹) -

وہ (یعنی حسن مطلق) ہر لحظہ ایک نئی شان میں ہے ، یعنی اس کے حسین مناظر حرکی و ارتقائی ہیں -

حسن کی اس حرکی صفت کو مولانا حالی اور علامہ اقبال نے نہایت دلکش انداز میں بیان کیا ہے :

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں (حالی)

اور

ہر لگارے کہ مرا پیش نظر می آید
خوش نگاریست ولے خوشتر ازاں می باید (اقبال)

غالب کے کمال ہنر کا یہ اعجاز ہے کہ اس نے حسن کے مفصلہ بالا تینوں نظریات کو ایک شعر میں اس طرح بیان کردیا ہے کہ جیسے دریائے معنی کو کوزے میں بند کر دیا ہو - ان تشریحات کو پیش نظر رکھیے

اور پھر اس شعر کے معانی پر غور کیجئیے تا کہ عقل و وجدان ہمارے اس وعدے کی تصدیق کریں :

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں (غالب)

اہل علم و نظر سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ غالب نے اس شعر میں جو جمالیاتی تصورات بیان کیے ہیں وہ اس سے پہلے صوفی شعراء کے کلام میں عام طور پر پائے جاتے تھے ۔ لیکن غالب نے جس چابکدستی سے ان کا اظہار کیا ہے وہ اسی کا حصہ ہے ۔ بہرحال غالب جب یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ کائنات حسین ہے اور اسے اللہ تعالی نے جو حسن مطلق ہے حسین بنایا ہے تو اس کی توجیہ بھی کرتا ہے ۔ وہ صوفیہ کرام کی طرح اس عقیدے کا اظہار کرتا ہے کہ اس کائنات کا حسن اللہ تعالیٰ کی تجلیات یا اس کے جلوۂ حسن کا مرہون منت ہے ۔ اگر اس نظریے پر غور کریں تو یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ اس کی اساس مندرجہ ذیل آیات قرآنی پر قائم ہے :

کل یوم ھو فی شان (۲۹ : ۵۵)

اور

اللہ نور السموت و الارض (۵۳ : ۳۵)

اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے ۔

ان دونوں آیات سے صوفیہ کرام نے یہ استنباط کیا کہ اللہ تعالیٰ کی نورانی و حسین تجلیات سے یہ کائنات حسین ہے اور چونکہ یہ تجلیات ہر لحظہ ایک نئی ارتقائی شان میں جلوہ نما ہوتی ہیں ، اس لئے یہ کائنات اپنے حسن کے اعتبار سے بالخصوص حرکی و ارتقائی ہے ۔ غالب نے اس تصور کا اظہار اس طرح کیا ہے :

کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوہ نے
کرے جو پرتو خورشید عالم شبنمستاں کا

اس شعر میں موزونی ، تشبیہہ ، حسن تعلیل اور رعایت لفظی کی داد نہ دینا صرف ظلم ہی نہیں بلکہ اپنی کور ذوق اور حسن کوری کا اعتراف بھی ہوگا ۔ غالب اللہ تعالی کو حسن مطلق یا نورالسموت والارض سمجھتے

ہوئے یہ کہتا ہے کہ اے اللہ ! تیرے حسن کے جلوے نے اس بے رنگ دنیا کو اس طرح حسین و رنگین بنا دیا ھے جس طرح آفتاب دنیا اپنی تجلی سے شبنم کے قطروں کے عالم کو رنگین و منور بنا دیتا ھے -

غالب کے نزدیک یہ کائنات نہ صرف اپنے حسن کے لئے بلکہ اپنے وجود کے لئے بھی تجلیات الٰہی کی مرھون منت ھے ، اس لئے یہ کائنات نہ وہم و مایا ھے (جیسا کہ موضوعیت پسندوں subjectivists اور ویدانتیوں کا نظریہ ہے) اور نہ مادی حقیقت ھے (جیسا کہ معروضیت پسندوں objectivists اور دھریوں اور اشتراکی مادیت پسندوں communist materialists کا خیال ھے) ، بلکہ یہ تخلیق بالحق ھے ، جیسا کہ قرآن حکیم کا عقیدہ ہے (مفصل بحث لئے دیکھیے مصنف کی کتاب جمالیات ، قرآن حکیم کی روشنی میں ، ص ۳۳۵ ببعد) ۔ اس نظریے کا غالب نے اپنے ایجاز بلاغت سے اس طرح اظہار کیا ھے :

ھے تجلی تری سامان وجود
زرہ بے پرتو خورشید نہیں

یہاں یہ سوال پیدا ھوتا ھے کہ وجود کیا ھے ؟ چونکہ مسئلہ وجود فلسفے میں ازبس اھمیت رکھتا ھے ، اس لئے اس سے بالتفصیل گفتگو کی جائے گی ۔ وجود عربی زبان کا لفظ تو ھے ، لیکن یہ اصطلاح کے طور پر وضع کیا گیا ھے ۔ اس کے معنی ھستیٔ موجود اور ھست کے ھیں ۔ اسلام میں ارسطو کی تعلیم کے داخل ھونے سے پہلے ابتدائی مذاھب اپنے عام تصورات میں شے یا جسم کو مع صفات کے استعمال کیا کرتے تھے (اشعری مقالات ، ۱ : ۴۴ ببعد) ، اور ان میں اس بارے میں اختلاف تھا کہ اللہ تعالی کو "شئے" کہا جائے یا "جسم" ۔ بعد ازاں یہ سوال اٹھایا گیا کہ اللہ تعالی جوھر (ارسطو کے مفہوم میں) کے تصور کے دائرے میں ھے یا نہیں (اشعری : ۱ : ۱۵۵ ببعد) جہاں تک اھل اسلام کا تعلق ھے انہوں نے اللہ تعالی کو "شے"، یا "جوھر" کہنے سے متفقہ طور پر انکار کر دیا ۔ بہرحال ارسطو نے اپنی مابعد الطبیعیات میں وجود کا جو تصور قائم کیا تھا اسے زیادہ قبولیت حاصل ھوئی ۔ یہ صحیح ھے کہ اللہ تعالی کے لئے لفظ موجود کے استعمال سے شبہات پیدا ھوتے ھیں ، لیکن اس کا جواب یہ دیا گیا کہ اس لفظ سے مراد صرف یہ ھے کہ اللہ تعالی معلوم یا قائم بالذات ہے (اشعری ، ۲ : ۵۲۰) ۔ مسلمان اس

طرح اللہ تعالی کے متعدد اسماء اور صفات کے ساتھ وجود کے لفظ کا اضافہ کرنے کے قابل ہوگئے اور بالآخر اللہ تعالیٰ کو واجب الوجود بھی کہنے لگے - یہ فقط معتزلہ اور بہت سے دوسرے فلاسفہ تھے جنھوں نے کہا کہ خدا کا وجود اور ہستی ایک ہی شے ہے اور کوئی الگ صفت نہیں -

مستند عربی میں موجود کے معنی پہلے ہی سے ہست کے آئے ہیں ، لیکن جہاں تک "وجود" کے لفظ کا تعلق ہے ، یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ بعد میں وضع ہوا - اس کی ایک ناقابل تردید دلیل یہ ہے کہ "وجود" کا لفظ نہ زمانہ جاہلیت کی شاعری میں استعمال ہوا ہے نہ قرآن مجید اور احادیث میں ، بلکہ عرب مترجمین نے یونانی فلسفے کے لفظ "being" اور " existence " کے لئے "وجود" کی اصطلاح وضع کی اور اس کے مفہوم کا دائرہ وسیع کردیا مثال کے طور پر نہ صرف حقیقت بلکہ اس صدق کو بھی جو اس حقیقت کی نمائندگی کرتا ہے موجود کہا گیا - وجود کا تصور "الواحد" کے تصور کے ساتھ بھی ملتبس ہو گیا - موجود بھی زیادہ تر اشیاء کے تصور سے مطابقت رکھتا ہے - یہ یاد رہے کہ ارسطو نے "موجود" اور "وجود شی" میں کوئی مابعدالطبیعی امتیاز قائم نہیں کیا - (دیکھیے مصنف کی کتاب اقبال اور جمالیات ، ص ۹۱ ، ۹۲ ببعد) -

جہاں تک غالب کا تعلق ہے اس کے نزدیک "وجود" کوئی ٹھوس اور قائم بالذات حقیقت یا جوہر (essence) نہیں ہے ، بلکہ صورت و شکل کا ایک نام ہے - ظاہر ہے - صور و اشکال اعراض accidents ہی کے دائرے میں تو آتے ہیں - بہر حال ، یہ صور و اشکال ذات حق کی تجلیات سے جلوہ نما ہوتی ہیں ، اس لئے یہ حقیقت میں تو محض عدم ہیں ، لیکن جلوۂ حق سے ان کی نمود ہوتی ہے - یہ تصور وجود غالب نے اس طرح بیان کیا ہے :

ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

غالب چونکہ وجود کو محض مجموعۂ صور خیال کرتا ہے اور صور کو قائم بالحق سمجھتا ہے ، اس لئے وہ اس عالم ہستی کو ٹھوس حقیقت یا وجود تصور نہیں کرتا ، گو اس کی نمود یا شہود سے انکار نہیں کرتا :

شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

یہ تصور بظاہر کتنا ہی سہل نظر آتا ہو ، لیکن حقیقت میں یہ ازبس دشوار ہے - غالب کو اس دشواری کا پورا احساس ہے - وہ چونکہ تمام موجودات کی ہستی کو قائم بالحق سمجھتا ہے ، جس میں وہ نظر اور اہل نظر کو بھی شامل کرتا ہے - اس لئے یہ مسئلہ حل نہیں کر سکتا کہ جب تمام مرئی وجود (= مشہود) ، اہل نظر (شاہد) اور نظر (شہود) کی حقیقت ایک ہی ہے تو پھر مشاہدہ کس کا اور کرنے والا کون ہوا؟

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

اس ازبس نازک مقام پر پہنچ کر غالب کا نظریۂ وجود وحدت الوجودی رنگ اختیار کر لیتا ہے - علامہ اقبال بھی اس منزل فکر میں پہنچ کر وحدت الوجودی ہو جاتا ہے - وہ یہ تو کہتا ہے کہ خودی لازوال ہے ، اور وہ ذات خدا میں مدغم ہوکر اپنی ہستی کھو دے گی (جیسا کہ اہل ویدانت کا عقیدہ ہے) ، نیز وہ خودی کی انفرادیت کا بھی قائل ہے ، لیکن اس عقیدے کے باوجود جب وہ خودی کی اصل کی تلاش و جستجو میں نکلتا ہے تو اسی مقام پر پہنچ جاتا ہے ، جہاں منصور نے "انا الحق" کا نعرہ لگایا تھا اور غالب کو یہ کہنا پڑا تھا کہ

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے -

چنانچہ علامہ اقبال بھی یہ کہتے ہیں :

خودی را از وجود حق وجودے
خودی را از نمود حق نمودے
نمی دانم کہ ایں تابندہ گوہر
کجا بودے اگر دریا نبودے

(ارمغان حجاز ، ص ۱۷۳)

دوسری جگہ وہ اس تصور کا یوں اظہار کرتا ہے :

وہی اک حسن ہے لیکن نظر آتا ہے ہر شے میں
یہ شیریں بھی ہے گویا بیستوں بھی، کوہکن بھی ہے

(بانگ درا ، ص ۷۳) -

غالب کے اس تصور کو جامع طور پر سمجھنے کے لئے وحدت الوجود سے متعلق قدیم و جدید فلسفیانہ متصوفانہ نظریات کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے - "وحدت الوجود (pantheism یونانی میں "pan" کل کے اور "تھیوس" خدا کے معنی میں آتا ہے) فلسفے میں خدا کی عینیت atheism اور مادی دنیا کا مسئلہ ہے - اس مسئلے کی حیثیت دہریت (atheism ، یعنی یہ عقیدہ کہ خدا کا کوئی وجود نہیں) اور ازعانی خدا پرستی (theism ، یعنی یہ عقیدہ کہ خدا موجود ہے اور اس کی طرف سے وحی و ہدایت آتی ہے) کے بین بین ہے - ایک فلسفی وجود الٰہی کے تصور پر تین طریقوں سے بحث کر سکتا ہے ، یعنی ایک ایسے وجود being کے تصور سے جو کل وجود کی علت cause اور اصل اصول original sum ہے - وہ اس کے وجود سے مطلقاً انکار کر سکتا ہے - یا نفساتی طور پر یہ استنتاج inference کر سکتا ہے کہ خدا موجود ہے اور اس سے پھر اس استنتاج پر پہنچ سکتا ہے کہ وہ کل اشیاء کی علت العلل - First cause ہے - لیکن وہ خدا (بحثیت علت) اور دوسرے موجودات بحیثیت معلولات (effects) کے درمیان تعلق کی نوعیت کو اس کی تشریح کیے بغیر چھوڑ بھی سکتا ہے - آخیر میں وہ معلول سے علت کی طرف استدلال کرتے ہوئے ان کے درمیان ایک ناگزیر تعلق کو واضح بھی کر سکتا ہے - آخری طریقہ ھی وحدت الوجود کی اصل اور اس کی شرح ہے - دھریئے اور وحدت الوجودی کے نزدیک خدا کے تصور کی اصل ایک ھی ہے - ہم اپنے آپ اور گرد و پیش کی چیزوں پر ، جن سے ہم واقف ہیں ، استدلال کرنے ھی سے کسی "وجود برتر" کی ہستی کا استنتاج کرتے ہیں اور اور یہ وجود برترھی ہے جس پر کل اشیاء منحصر ہیں اور جس سے ان کا صدور ہوتا ہے یا جس میں وہ بقا پاتی ہیں - وحدت‌الوجود نے علت و معلول کی عینیت اختیار کر لی اور معلول کی تالی کفایت consequent adequacy کی اس لئے صحیح طور پر تشریح کر دی گئی تاکہ اس کی علت کی نشاندھی کی جا سکے - اس کے نزدیک مادہ (matter) کا ، جو قلب (mind) سے کم تر نہیں ، الوھیت (Deity) سے صدور (emanation) واجب ہے - وحدت کائنات

(Unity of Universe) ایسی وحدت ہے جو اس حیثیت سے کل موجود کثرت (variety) پر حاوی ہے کہ وہ اس سے ایسے طریقے سے صادر ہوتی ہے جو نتیجے کے ذریعے لازمی طور پر توضیح ہے - لہذا ہر موجود شے اپنی ہستی کی، جسے وہ حاصل کرنے کے قابل ہوتی ہے، کل شرح اندر رکھتی ہے -

فلسفۂ یونان کا قدیم ترین ایونی (Inenian) مکتب فکر، جس حد تک وہ ازعانی خدا پرستی کا قائل ہے، بنیادی طور پر وحدت الوجودی تھا اور قدماء میں ایپی کیورس Epicurus (۲۷ تا ۳۴۱ م ق) اور لیو قرائطس Lueretius, carus (۵۴ تا ۹۸ م ق) اور متاخرین میں برونو Burno (۱۵۴۸ تا ۱۶۰۰ء) اسی دبستان وحدت الوجود سے تعلق رکھتے تھے- سالماتی نظریہ (The Atomic theory) یا یہ کہ کل اشیاء کا مبدء شعوری سالمات ہیں اس دبستان کی معراج کمال ہے - سانکھیہ کپل ہند و فلسفے کا ایک ممتاز نظام ہے، جو مشرق میں وحدت الوجودی رجحانات کا سب سے بڑا ترجمان تھا - سپے سپس (Speusippus) کو، جو افلاطون کا بھانجا تھا اور اس کے بعد "اکیڈیمی" میں اس کا جانشین ہوا، انتہا پسند وحدت الوجودی کہا جاتا ہے - اس نے جس بات کی تعلیم دی اسے عقیدے کا سچا عروج کمال تصور کر سکتے ہیں، یعنی یہ کہ "الہ" یا "برتر و اعلی" مرتبے کے لحاظ سے تو اول ہے، لیکن تسلسل کے اعتبار سے آخری ارتقائی تخلیق ہے - اس نے مسرت کی یہ تعریف کی ہے کہ وہ فطرت کے ساتھ توافق کی عادت ہے - بقول اس کے روح ایک اعلی ریاضیاتی اور ہندسی وحدت ہے، یا ایسی وسعت ہے جس کی تشکیل عدد نے ہم آہنگ طور پر کی ہے - رواقین (Stoics) دبستان والے ایپی کیورس سے وسیع طور پر مختلف ہونے کے باوجود وحدت‌الوجود کے ماننے والوں میں شمار کیے جا سکتے ہیں - ان کا عقیدہ یہ تھا کہ جو کچھ حقیقی ہے مادی ہے - یہ کائنات مجموعی لحاظ سے شعور رکھتی ہے اور یہ شعور ہی الوہیت ہے - یہ عالم مستقلاً ایک ارتقائی حالت میں ہے - پانی، مٹی اور ہوا کے عناصر آگ سے ظہور پذیر ہوتے ہیں اور آگ پھر انہیں اپنے اندر جذب کر لیتی ہے، اور یہ سلسلہ ایک ابدی چکر میں چلتا رہتا ہے - روح انسانی (یا خودی) اور خدا دونوں کی فطرت ایک ہی ہے اور وہ ایک دوسرے پر عمل اور رد عمل کرتے ہیں - عقل چاہے انسان میں ہو یا خدا میں، وہ اسے زیادہ تر قوت میں مضمر خیال کرتے ہیں - شاید اسکندریہ کے دبستان تصوف خصوصاً فلاطینوس (Plotinus) کے دبستان تصوف سے بڑھ کر کوئی شے وحدت الوجود

کی اس قدر مخالف دکھائی نہیں دیتی - یہ موخرالذکر دبستان ہے جو خدا کو اتنا منزہ بنا دیتا ہے کہ فکر بھی انفرادیت سے جدا ہوئے بغیر اس تک رسائی نہیں حاصل کر سکتی- پھر بھی اس دبستان کے سینے سے وحدت الوجود کا ایک بھرپور چشمہ پھوٹا ہے-دیونیسس (Dionyrisus) جعلی ایروپیگائٹ(The (Pseudo-Aeropagite نے جو افلاطونی دبستان کا ایک عیسائی فلسفی ہے ، اسے یعنی وحدت الوجود کو اپنے قیاسات میں شامل کر لیا - ان قیاسات میں جزئیہ (particular) مدارج ارتقاء کے سلسلے کے ذریعے کائنات سے ایک جنس (genus) اور نوع (species) کے طور پر حاصل ہوتا ہے - جان سکوٹس اریجینا (John Scotus Erigena) نے جو قرون وسطی کے مدرسی (scholastic) فلسفے کا مؤسس ہے ، اس قیاس کو حقیقی رنگ سے ملون کر دیا - خدا کو دنیا اور کائنات کا جوہر ، جنس ، نوع اور فرد بنایا دیا - اتنی کثیر صورتیں جو فی‌الواقع سلسلہ وار چلی آتی ہیں - اکہارٹ (Meister Eckhart) نے جو چودھویں صدی کا جرمن فلسفی ، نیز دیونیسس کا شاگرد ہے اور جسے عموماً جرمن فلسفے کا باوا آدم کہتے ہیں ، بعض تصورات پیش کیے ، جنہیں اس کے بعض متبعین نے وحدت‌الوجود کے رنگ میں ترقی دی - اکہارٹ کی یہ رائے تھی کہ مخلوقات ابدی طور پر خدا کے تصور یا خیال میں ہے - اس تصور نے کل اشیاء کی انواع کے تصورات کے ابدی وجود کے وحدت الوجودی عقیدے کی صورت اختیار کرلی - برونو نے ابی کیورس اور لیو قرائطس کی طرح یہ تعلیم دی کہ تمام جواہر واحد یا مولاد (Monads) کل موجود اشیاء کے عناصر ہیں ، لیکن ''وہ'' مولادوں کا مولاد ہے ، کم سے کم کیونکہ تمام اشیاء اس سے ماوراء ہیں ، زیادہ سے زیادہ کیونکہ تمام اشیاء اس کے اندر ہیں - وہ عاملوں کی تخلیق آزادانہ طور پر کرتا ہے ، لیکن اپنی فطرت کے اندرونی تقاضے کے ذریعے ، تمام عالم فطرت متأثر ہیں ، لیکن خدا فطرت مؤثرہ ہے - سیارے ان روحوں کے ذریعے حرکت کرتے ہیں جو ان کے اندر رہتی ہیں - خدا تمام چیزوں میں ہے ، اس وجود کی طرح جو ان تمام اشیاء میں ہوتا ہے ، جو موجود ہیں ، یا ان چیزوں میں حسن کی طرح ہے جو حسین ہیں (انسائیکلو پیڈیا امریکنا ، بذیل مادہ pantheism) -

فلسفے اور الہیات میں وحدت الوجود کا نظریہ یہ ہے کہ ''خدا ہی سب کچھ ہے اور سب کچھ ہی خدا ہے'' ، یہ کائنات خدا سے جداگانہ کوئی مخلوق نہیں ہے ، نہ یہ خدا کا جزو ہی ہے ، نہ خدا کائنات

سے باہر یا ماوراء ہی ہے ، نہ یہ (خدا) کائنات کا ایک حصہ یا اس کا ایک محیط کل پہلو ہی ہے ۔ خدا کائنات ہے اور کائنات خدا ہے ۔ محدود قلوب ، محدود جزیں عام انسانی مشاہدے کے تمام معروضات خدا کے محض شیٔون ، مظاہر یا اجزا ہیں جو ان میں ہر ایک سے اور ان کے مجموعے سے کہیں بڑا ہے ۔ الغرض یہ ہیں وحدت الوجود کے مجملاً معنی (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ، بذیل مادہ) ۔

جہاں تک اسلام میں وحدت الوجودی عقیدے کا تعلق ہے ، ابن عربی اس کا زبردست علم بردار تھا اور اس کی حرکی شخصیت اور پرزور خطبات و تحریرات سے یہ عقیدہ عوام و خاص میں بہت جلد مشہور و مقبول ہو گیا ، نیز اس نے اسلامی تصوف میں اپنے لئے ایک اہم ترین مقام بھی حاصل کر لیا۔ ابن تیمیہ نے اس عقیدے کو معیوب سمجھ کر رد کر دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ابن سینا بھی وحدت الوجودی تھا اور امام غزالی بھی جب اس پر اسماعیلی رنگ غالب تھا ، اس عقیدے کا نقیب تھا ۔ وحدت الوجودی دبستان کے نزدیک روح ایک جوہر ہے جو واحد و بسیط ہے ، اور نور آفتاب کی طرح ہر شے میں سرایت کرکے مختلف صورتوں میں جلوہ نما ہوتی رہتی ہے ۔ یہی صورتیں ہیں ، جنہیں انسان کہتے ہیں اور جس کی موت کے بعد روح عالم قدس میں مل جاتی ہے جو اس کا اصلی مسکن ہے ۔ گویا وجود مطلق یا اللہ تعالی انسانی صورت میں وجود مقید ہے ، لیکن کلی حیثیت میں ایک واحد شے ہے ۔ اس کی مثال ایک ہندسے کی ہے ، جو بمنزلۂ خدا واحد ہے ، لیکن ان گنت اعداد وجود میں آتا ہے ، بعینہ خدا کی وحدت سے کائنات کی کثرت ظہور پذیر ہوتی ہے ، جس طرح روح جسم کے تمام اعضاء و جوارح میں جو مختلف ہیں ، ساری ہوتی ہے ، اسی طرح وہ کائنات کی تمام مختلف بوقلموں اشیاء میں جاری و ساری ہے ۔ چنانچہ جب کوئی شے فنا ہوتی ہے ، تو یہ روح اسی بحرناپیدا کنار میں مل جاتی ہے جس کا یہ قطرہ تھی ، جیسے قطرات سمندر سے اٹھتے ہیں ، پھر اسی میں فنا ہو جاتے ہیں ۔ تمام کائنات وجود مطلق کا پرتو ہے اور اصل کے بغیر پرتو کا وجود قائم نہیں رہ سکتا (دیکھیے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ، لائڈن ، بذیل مادہ تصوف) ۔

وحدت الوجود کے اس تاریخی پس منظر کی روشنی میں ایک بار پھر غالب کے مفصلہ ذیل اشعار پر غور کرتے ہیں اس سے اس کے نظام فکر کو جامع

طور پر سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی -

کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوہ نے
کرے جو پرتو خورشید عالم شبنمستان کا

ہے تجلی تری سامان وجود
ذرہ بے پرتو خورشید نہیں

شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

اس بات پر زور دینے کی چنداں ضرورت نہیں کہ غالب ابن عربی کے وحدت الوجودی تصورات سے دیگر عجمی شعراء کی طرح ازبس متأثر تھا - چنانچہ وہ اس کائنات کو حسین تو سمجھتا ہے لیکن کائنات اور اس کے حسن دونوں کو حسن مطلق کا جلوہ خیال کرتا ہے - وہ بارکلے (Georage Berkeley (1685-1753 کی طرح نہایت لطیف نکتہ بیان کرتا ہے کہ یہ کائنات اپنی ہستی یا وجود کے لئے نظر کی رہین منت ہے اور یہ "نظر" جسے نظر انسانی کہتے ہیں ، درحقیقت خود حسن مطلق ھی کی نظر ہے - دوسرے لفظوں میں اللہ تعالی نہ صرف حسن مطلق ہے بلکہ حسن بین بھی ہے ، لہذا اس نے اپنے حسن ذات کا مشاہدہ کرنے کے لئے انسان کو پیدا کیا اور اس میں نظر بن کے سما گیا - چنانچہ انسان کی نظر دراصل حسن مطلق کی نظر ہے ، جو بظاہر غیر و کثرت کی صورت میں اپنے حسن کا مشاہدہ کرتی ہے :

دھر جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبین

اس فلسفۂ نظر کو مولانا رومی نے نہایت بصیرت افروز انداز میں اس طرح بیان کیا ہے :

آدمی دید است باقی پوست است
دید آں باشد کہ دید دوست است

جملہ تن را در گداز اندر بصر
در نظر رو ، در نظر رو ، در نظر

ان اشعار کی جمالیاتی رنگ میں اس طرح توضیح کر سکتے ہیں کہ جمالیاتی مشاہدہ کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے حسن نظر سے حسن مطلق کا مشاہدہ کرے ، اور یہ مشاہدہ ہی مقصود زندگی اور مطلوب فطرت ہے ، یہی کامرانی حیات ہے اور کیف و سرور کی جنت ابدی ۔

اس میں شک نہیں کہ غالب بعض صوفیائے کرام کی طرح وحدت الوجودی ہے ، لیکن وہ ایک آزاد خیال مفکر بھی تھا ، لہذا وہ اس مقام پر پہنچ کر بھی کا نہیں ہو رہتا ، بلکہ وہ اپنی پرواز فکر میں اس مقام پر پہنچ جاتا ہے ، جسے فلسفے میں موضوعیت subjectivism کہتے ہیں - اس کی نظر میں کائنات اپنے حسین نظاروں سمیت محض طلسم خیال بن کے رہ جاتی ہے اور وہ ایک انتہا پسند موضوعیت پسند فلسفی کی طرح پکار اٹھتا ہے :

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

جمالیات میں موضوعی مکتب فکر اپنے اثر و نفوذ کی وسعت و گہرائی کے سبب ازبس شہرت و اہمیت رکھتا ہے - اس پر تسلسل تاریخی کے لحاظ سے غور کریں تو ہم لا محالہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ افلاطون کا نظریۂ اعیان (Theory of Ideas) ہی اس کا اصلی ماخذ ہے - افلاطون کے نزدیک اس کائنات کی چیزیں حقیقی نہیں مجازی ہیں اور مجاز کا ایک عین ہے ، جو اس عالم ہستی کے ماوراء ایک ایسے عالم میں موجود ہے ، جسے عالم اعیان سے تعبیر کیا جاتا ہے - یہ عالم اعیان مجموعی لحاظ سے بذات خود ایک ازلی و ابدی تصور ہے - افلاطون نے اگرچہ اس بات کا اعتراف تو نہیں کیا ، البتہ قرائن سے پتا چلتا ہے کہ وہ عالم اعیان کو ایک الوہی تصور خیال کرتا تھا - اس کے اس "تصور ازلی" کو کانٹ "شئے قائم بالذات" (Thing-in-itself) اور ہیگل "تصور مطلق" (Absolute Idea) کہتا ہے - یہی صورت حال بارکلے کے نظریے کی بھی ہے ، لیکن اس کا نظریہ کانٹ اور ہیگل کے نظریے سے اس بات میں مختلف ہے کہ اس کی رائے میں یہ کائنات ایک تصور تو ہے لیکن یہ تصور خدا کا ہے - اپنی مطلق حیثیت میں یہ خدا اصل شہود ہے

اور یہ شہود ازلی و ابدی ہے ، جس کی وجہ سے اس کائنات اور حسن کو بقائے دوام حاصل ہے (یہ تصور افلاطون سے مختلف ہے ، وجہ یہ ہے کہ بارکلے کائنات کے وجود کو کسی مشاہدے سے وابستہ نہیں سمجھتا بلکہ اسے معروضی خیال کرتا ہے) - اس کے برعکس کانٹ اور ہیگل وغیرہ کا تخیل بارکلے کے تخیل کی طرح ارفع نہیں ، کیوں کہ ان کے نزدیک یہ کائنات اور اس کا حسن بذات خود کوئی شے نہیں (افلاطون کے برخلاف) ، بلکہ اس کی ہست و بود محض تصور انسانی (نہ کہ شہود الوہی ، جیسا کہ بارکلے کا خیال ہے) پر موقوف ہے - یہ فرق بظاہر معمولی کیوں نہ نظر آئے ، حقیقت میں بہت بڑا فرق ہے اور اس سے موضوعی مکتب فکر کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے - بہرحال ، جب ہم غالب کے اس شعر پر غور کرتے ہیں :

دھر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

تو اس کے اور بارکلے کے تصور میں گہری مشابہت نظر آتی ہے - بہرحال ، غالب اور بارکلے میں بنیادی فرق یہ ہے کہ بارکلے فلسفی ہے اور غالب شاعر - لہذا بارکلے کے تصورات میں ایک فلسفی کی طرح ایک منطقی تسلسل و توافق پایا جاتا ہے اور غالب کے تصورات میں ایک شاعر کی طرح بوقلمونی پائی جاتی ہے اور بحیثیت فنکار کے اسی میں اس کی عظمت کا راز مضمر ہے - بہرحال ، غالب کے نزدیک یہ کائنات چونکہ اپنا کوئی حقیقی وجود نہیں رکھتی اور اس کا حسن بھی ذاتی نہیں ، بلکہ حسن مطلق کا محض جلوہ ہے ، اس لئے یہ حسین صورتیں اور ان کا جمال و جلال محض فریب نظر ہے - تصور فلسفہ و جمالیات کا ایک ناقص نظریہ ہی سہی لیکن اس فنکار کے فکر کے سانچے میں اس طرح ڈھل کر نکلا ہے کہ اس کی دلکشی اور اثرانگیزی سوا ہوگئی ہے :

صبحدم دروازۂ خاور کھلا — مہر عالمتاب کا منظر کھلا
خسرو انجم کے آیا صرف میں — شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا
وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود — صبح کو راز مہ و اختر کھلا
ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ — دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

اپنے اس تصور کی بنا پر کہ یہ عالم ہستی اور اس کا حسن محض وہم و خیال ہے ، غالب ایک قنوطیت پسند و متشکک مفکر کی طرح تمام ہنگامہ حیات ہی کو لغو و لا یعنی سمجھنے لگتا ہے :

ہر زہ ہے نغمہ زیر و بم ہستی و عدم
لغو ہے آئینہ فرق جنون و تمکین
نقش معنی ہمہ خمیازۂ عرض صورت
سخن حق ہمہ پیمانۂ ذوق تحسین
لاف دانش غلط و نفع عبادت معلوم
درد یک ساغر غفلت ہے چہ دنیا و چہ دین
مثل مضمون وفا بار بدست تسلیم
صورت نقش قدم خاق بفرق تمکین

اس میں شک نہیں کہ علامہ اقبال کا جمالیاتی نظریۂ "معروضی موضوعی" (Subjective-objective) ہے ، یعنی وہ حسن کو موجود فی‌الخارج اور موجود فی الباطن تسلیم کرتا ہے ، اور غالب کی طرح اس کائنات کو "نمود سیمیائی" سے تعبیر کرتا ہے ، لیکن دونوں کے فکر میں ایک لطیف فرق ہے :

اک تو ہے کہ حق ہے اس جہاں میں
باقی ہے نمود سیمیائی

(بال جبریل ، ص ۷۹)

اسی تصور کو علامہ نے فارسی میں اس طرح بیان کیا ہے :

ہر چہ از محکم و پایندہ شناسی ، گذرد
کوہ و صحرا و برو بحر و کراں چیزے نیست
از خود اندیش و ازین بادیہ ترسان مگذر
کہ تو ہستی و وجود دو جہاں چیزے نیست

(زبور عجم ، ص ، ۱۶۹)

اقبال اور غالب کے محولہ بالا تصورات کے موازنے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ غالب اس عالم کو فریب نظر سمجھتا ہے اور حقیقت کو فقط ذات الٰہی میں دیکھتا ہے ، اور اقبال گو ذات الٰہی ہی کو حق سمجھتا ہے ، لیکن وہ اس کائنات میں بھی حقیقت کو "عالم خودی" میں مضمر

دیکھتا ہے ۔ وجہ یہ ہے کہ یہ خودی ہی ہے جو اس کے نزدیک ہمارے تصورات و تخیلات اور جذبات و امیال کے مطابق ہمارے لئے اس عالم کی تخلیق کرتی ہے ۔ لہذا اس کائنات میں جو کچھ نظر آتا ہے وہ انسان کی آرزو ہی کا پیدا کردہ ہے ۔ (مفصل بحث کے لئے دیکھیے مصنف کی کتاب اقبال اور جمالیات ، ص ۹۳ ببعد) ۔

اس میں شک نہیں کہ غالب نے حسن پر فلسفیانہ انداز میں بحث نہیں کی اور نہ یہ اس کا منصب ہی تھا ، بلکہ اس نے ایک مفکر کی طرح حسن کا مشاہدہ کیا اور ایک عبقری فنکار کی طرح اس کا اظہار کیا ۔ اس کے کلام کا جمالیاتی نقطہ نظر سے مطالعہ کرنے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کا ذوق حسن نہایت ارفع و لطیف تھا اور اس کی جمالیاتی حس زندہ و بیدار تھی ۔ وہ حسن کائنات کا شیدائی ہے ، لیکن وہ صنف نازک کے حسن سے بہت زیادہ متاثر نظر آتا ہے اور اس نے ایک عبقری فنکار کی طرح اس کے مختلف پہلوؤں کی نہایت دلکش انداز میں شبیہ آرائی کی ہے ۔

مرزا غالب ۔۔ اپنے کلام کے آئینے میں

ڈاکٹر ناظر حسن زیدی

جس طرح کسی کی آواز سنتے ہی ہم اس شخص کو پہچان لیتے ہیں اسی طرح صاحب طرز ادیب یا شاعر کا کلام سن کر ہمیں اس کے مزاج ، ماحول اور ذاتی حالات کا اندازہ ہو جاتا ہے ۔ ولی سے حسرت موہانی تک ہر شاعر کے کلام میں یہ خصوصیات اس طرح جلوہ گر ہیں کہ اگر ان کے اشعار سے ان کے ذاتی حالات اور مزاجی رجحانات کا پتہ لگانا چاہیں تو بہ آسانی لگا سکتے ہیں ۔ سب کے کلام میں اپنے اپنے علاقوں اور زمانوں کا رنگ جھلکتا ہے اور بعض دفعہ یہ کیفیت اس صفائی کے ساتھ نمایاں ہوتی ہے کہ صرف ایک مصرع بلکہ چند الفاظ یا فقط ایک ترکیب سن کر یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ الفاظ فلاں شاعر کی فکر کا نتیجہ ہیں ۔ مرزا غالب بھی اسی قاعدے کے تحت آتے ہیں ۔ چونکہ ان کی شخصیت بہت پہلودار تھی اس لئے ان کی خصوصیات اردو اور فارسی کلام میں بخوبی نمایاں نظر آتی ہیں ۔

مرزا غالب کا زمانۂ حیات انیسویں صدی میں بسر ہوا۔ (۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء تا ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء) ۔ اس زمانے میں مغلوں کی سلطنت اپنے زوال کے آخری دور سے گزر رہی تھی ۔ انگریزی حکومت بنگال اور بہار سے بڑھ کر ممالک متحدہ آگرہ و اودھ تک پھیلتی چلی آتی تھی ۔ اس غیر ملکی سامراج نے اپنے مفاد کی حفاظت کے لئے ہمارے بہت سے قاعدوں اور ضابطوں کو ختم کر دیا ، بعض کو اپنی مصلحتوں کے لئے باقی رکھا ۔ چنانچہ مغلوں کے زمانے کا جاگیرداری نظام اس طرح برقرار رہا کہ ہندوستان کے طول و عرض میں جا بجا دیسی ریاستیں قائم رکھی گئیں ، چھوٹے تعلقے اور زمینداریاں موجود رہیں تا کہ حکومت کو مالیے کی وصولی اور عوام پر قابو رکھنے میں دقت پیش نہ آئے ۔ یہ جاگیرداری نظام اپنے ساتھ بعض خوبیاں اور بعض خرابیاں لایا ۔ خوبیاں تو یہ تھیں کہ ان ریاستوں تعلقہ داریوں اور زمینداریوں سے قدیم ملکی روایات قائم رہیں ۔ دوست داری ،

ارباب کمال اور اہل فن کی پرورش ، شرافت و نجابت کا تحفظ ، وضعداری ، رکھ رکھاؤ ، حفظ مراتب وغیرہ ایسے اوصاف ہیں جو شخصی حکومتوں اور ریاستوں ہی میں زیادہ فروغ پاتے ہیں - عیوب یہ ہیں کہ آبائی جائداد کی وجہ سے نئی نسلیں آرام طلب ، عیش کوش اور بے عمل ہو کر رہ جاتی ہیں - بادہ نوشی ، آوارگی ، اسراف ، قمار بازی اور کتنی ہی دوسری بازیاں ان کا مشغلہ ہو جاتی ہیں - مرزا غالب کا خاندان بھی اسی جاگیرداری نظام سے وابستہ تھا - ان کے والد عبداللہ بیگ اور چچا نصراللہ بیگ دیسی رئیسوں اور سرکار انگلشیہ کے ملازم رہے جس کے صلے میں اس خاندان کو دو پرگنوں کی زمینداری ملی - اگرچہ مرزا کے سر سے ان کے باپ اور چچا کا سایہ بہت جلد اٹھ گیا لیکن ننھیال کی دولت و ثروت کے سبب ان کا بچپن اور نوجوانی بہت فراغت سے گزری - ان کی شادی بھی دہلی کے ایک بہت ممتاز جاگیردار گھرانے میں یعنی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی سے ہوئی جو نواب احمد بخش خاں کے حقیقی بھائی تھے -

ان حالات میں مرزا کی سیرت اور کردار کا جو نقشہ بننا چاہئے تھا ، وہی بنا - ان کا بچپن اور نوجوانی تحصیل علم کے ساتھ ساتھ پتنگ بازی ، شطرنج اور چوسر ، شعرگوئی اور عیش کوشی میں بسر ہوئے - رئیس گھرانوں میں ناز و نعمت، حظ نفس ، جمال پرستی اور رندی و شاہد بازی کے مشاغل عام ہوتے ہیں - مرزا بھی ان خرابیوں سے نہ بچ سکے - آگرے میں اپنے ننھیال کی وسیع حویلیوں کی چھتوں پر وہ راجا بلوان سنگھ کے ساتھ پتنگ لڑایا کرتے تھے - جوانی دیوانی کے ابتدائی دور ہی میں انہیں بادہ نوشی کی وہ منحوس لت لگ گئی جس سے وہ تمام عمر پیچھا نہ چھڑا سکے اور غالباً اسی دور میں (بقول محی‌الدین زور) انہیں قماربازی کا چسکا لگا جس کی بدولت انہیں ایک مدت بعد ۱۸۴۷ء میں قید فرنگ کی صعوبت اٹھانا پڑی -

انیسویں صدی کے اس زوال آمادہ بلکہ زوال زدہ معاشرے میں امیرزادوں کے مشغلے بہت دلچسپ تھے - مرد اپنے وقت کا زیادہ حصہ دیوان خانوں کی خلوت میں یا دوست احباب کی محفلوں میں گذارتے تھے - مشاعروں کی گرم بازاری تھی جن میں ادنیٰ ، اعلیٰ ، امیر غریب ، تعلیم یافتہ ، نیم خواندہ اشخاص شوق سے حصہ لیتے تھے - میلے ٹھیلے ، سیر و تفریح ، جمنا میں تیراکی کے مقابلے ، رقص و سرود کی محفلیں ، علوم و فنون کی مجلسیں جا بجا منعقد ہوتی تھیں - مرزا نے آگرے میں اپنے بچپن اور نوجوانی کا زمانہ انہی زمزموں اور چہچہوں میں گزارا - فارسی ادب

کا ذوق اسی زمانے میں پروان چڑھا ۔ وہ عیش و نشاط کی محفلوں میں شریک ہوئے، آتش نفس موسیقاروں کے گانے سنے ، اپنے دیوان خانے میں خوب خوب بزم آرائیاں کیں اور جوانی اپنے ساتھ جو ارمان لاتی ہے انہیں خوب نکالا ۔ ذیل کے اشعار میں جو رجحانات ہیں انہیں روایتی شعرگوئی نہ سمجھیے بلکہ وہ ان کے ذاتی حالات کے آئینہ دار ہیں ۔ ان میں عیش کوشی ، لذتیت اور کام جوئی کا جو رنگ ہے وہ مرزا کی جوانی کی رنگین داستان بیان کر رہا ہے :

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

بسمل اس تیغ دو دستی کا نہیں بچتا اسد
عافیت بیزار شغل کعبتین اچھا نہیں

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ کوزہ و قدح و ساغر و سبو کیا ہے

بہت سہی غم گیتی شراب کم کیا ہے
غلام ساقی کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

کوئی کہے کہ شب مہ میں کیا برائی ہے
بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں
علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب
گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں

لال ڈگی پر کرے گا جا کے کیا   پل پہ چل ہے آج دن اتوار کا

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہرخواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

حضور شاہ میں اہل سخن کی آزمائش ہے
چمن میں خوش نوایان چمن کی آزمائش ہے

مرزا غالب نے نوجوانی کا کیف پرور زمانہ جس طرح بسر کیا اس کی تفصیل معلوم نہیں - اس عہد کی وضعداری اور رکھ رکھاؤ کا تقاضا یہ تھا کہ عیب تو عیب ، ہنر کا اظہار بھی نامناسب سمجھا جاتا تھا - اگرچہ جدید تحقیقات کی بدولت یعنی مالک رام ، قاضی عبدالودود ، غلام رسول مہر ، امتیاز علی تاج اور پروفیسر وزیرالحسن عابدی جیسے محققوں کی کاوشوں سے حالات منظر عام پر آ چکے ہیں لیکن بہت سی باتیں اب بھی نامعلوم ہیں اور کبھی معلوم نہ ہو سکیں گی - ایکن ان کے رقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے آگرے میں اپنی نوجوانی کا دور بڑی طمانیت اور آسودگی سے گزارا تھا - یہاں انہیں وہ تمام عیش میسر تھے جو دولت فراہم کر سکتی ہے - وہ خود بھی تندرست اور حسین آدمی تھے اور حسن و جمال کے شیدائی تھے - انہوں نے فقط "ایک ستم پیشہ ڈومنی" سے نہیں بلکہ نہ جانے کتنے حسینوں سے محبت و الفت کے رشتے استوار کئے تھے - جن دنوں نواب ضیاءالدین احمد خاں نیر رخشاں آگرے میں مقیم تھے - مرزا غالب نے انہیں دھلی سے خط بھیجا جس میں لکھا تھا کہ (آگرے میں) "دریائے جمنا اور پتھر کے گھوڑے سے میرا سلام کہنا اور اس شہر کے کوچہ و بازار سے احتیاط کے ساتھ گزرنا کیونکہ کسی زمانے میں یہ شہر مجھ جیسے دیوانے کا مسکن تھا - وہ ایسا زمانہ تھا کہ اس بستی کے ہر درخت سے دل اگتے تھے"- (ترجمہ از فارسی) - انہیں فرصت کارو بار شوق خوب میسر تھی - ان کے اکثر اشعار میں حسن انسانی کی جو نازک تفاصیل نظر آتی ہیں وہ ان کے ذاتی مشاہدے پر مبنی ہیں - ان کے ذہن نے ان تمام تفاصیل کو کہیں تشبیہ سے ، کہیں استعارے کے پردے میں اور کہیں سادہ الفاظ میں بیان کر دیا ہے - ملاحظہ ہو :

اسد اٹھنا قیامت قامتوں کا وقت آرائش
لباس نظم میں بالیدن مضمون عالی ہے

بنا آئینہ جام بادہ عکس روئے گلگوں سے
نشان خال رخ داغ شراب پرتگالی ہے

بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پرپیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

چشم خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
سرمہ تو کہوے کہ دود شعلۂ آواز ہے

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا
قیامت ہے سرشک آلود ہونا تیری مژگاں کا

ابھی آتی ہے بو بالش سے اس کی زلف مشکیں کی
ہماری دید کو خواب زلیخا عار بستر ہے

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اسکی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے وقت
ہے نگاہ آشنا تیرا سر ہر مو مجھے

کرے ہے بادہ ترے لب سے کسب رنگ فروغ
خط پیالہ سراسر نگاہ گلچیں ہے

مرزا غالب تورانی نسل کے ترک تھے جس کے گرم خون کو ہندوستان کی آب و ہوا نے اور لذت کوش بنا دیا تھا - لذت پرستی اور حظ لفس کا یہ جذبہ ان میں بدرجۂ اتم موجود تھا - اسی کے زیر اثر بعض مسلسل غزلوں میں انہوں نے حسن کے مشاھدوں اور تلذذ ذھنی کی تمام صورتیں قلمبند کی ھیں - وہ صرف قوت باصرہ سے اپنی اور قاریوں کی روح کو شاداب نہیں کرتے بلکہ تمام حواس خمسہ کو دعوت لذت دیتے ھیں - بعض غزلوں کے اقتباسات یہاں درج کئے جاتے ھیں جن سے شاعر کے جذبۂ تلذذ کی ترجمانی ھوتی ھے :

مدت ھوئی ھے یار کو مہماں کئے ھوئے
جوش قدح سے بزم چراغاں کئے ھوئے
دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ھے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ھوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذر دلفریبی عنواں کئے ہوئے
اک نو بہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغ مے سے گلستاں کئے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے
مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس
زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب
وہ نازنیں بتان خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر
طاقت ربا وہ ان کا اشارہ کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ واہ
وہ بادہ ہائے ناب و گوارا کہ ہائے ہائے

جاگیردارانہ ذہنیت کے زیر اثر مرزا غالب کا مزاجی رجحان عیش دوستی اور لذت طلبی کی طرف تھا لیکن اس کے باوجود آبائی امارت نے انہیں یہ سبق بھی پڑھایا تھا کہ ہر حال میں سلیقے، آداب و آئین اور وضعداری کی پابندی ملحوظ رکھی جائے۔ کسی ایک جگہ دل لگا کر پابند الفت ہو جانا اور کسی بیوفا شخص کے ہاتھوں ذلتیں سہنا انہیں پسند نہ تھا۔ مرزا حاتم علی مہر کو ایک تعزیتی خط میں لکھتے ہیں کہ مجھے شہد کی مکھی بننا اچھا نہیں لگتا جو شہد میں اپنے بال و پر پھنسا لیتی ہے۔ کسی کے ہاتھوں مجبور ہو جانا اور آئین امارت و وضعداری کو ہاتھ سے دے دینا ان کے نزدیک معیوب تھا۔ انہیں تو حجاب پاس وضع اتنی اجازت بھی نہ دیتا تھا کہ وہ بازار میں چلتے چلتے کسی سے عرض حال بھی کر سکیں۔ اگرچہ انہوں نے ایک شعر میں یہ ظاہر کیا ہے کہ ہمارا کیش ترک رسوم ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ خود بھی سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھے۔ اگر کوئی دوست ملنے آتا تو وہ بازدید (جوابی ملاقات) کے لئے

ضرور اس کے گھر جاتے - یادگار غالب میں مولانا حالی نے ان کا یہ فقرہ جو درج کیا ہے کہ مجھے ان صاحب کا "ایک آنا" دینا تھا اس کا مطلب یہی ہے - وہ اپنے زمانے کے رئیسوں کی طرح دھلی میں اور دھلی سے باھر پالکی میں سفر کرتے تھے - چنانچہ رامپور کا سفر پالکی ھی میں طے کیا تھا - شمس العلماء آزاد لکھتے ھیں کہ اس عہد میں شرفا کا دستور تھا کہ علوم متداولہ حاصل کرتے تھے اور خالی وقت میں خوشنویسی کی مشق کیا کرتے تھے - مرزا غالب نے بھی طب ، نجوم ، تصوف وغیرہ کی تعلیم حاصل کی تھی جس کا ذکر ان کے رقعات میں جا بجا اور شاعری میں کہیں کہیں ملتا ہے - مثلاً

طب - رحم کر ظالم کہ کیا بود چراغ کشتہ ہے
نبض بیمار وفا دود چراغ کشتہ ہے

سہل تھا سہل ولے یہ سخت مشکل آ پڑی
مجھ پہ کیا گزرے گی اتنے روز حاضر بن ہوئے
تین دن مسہل سے پہلے تین دن مسہل کے بعد
تین مسہل تین تبریدیں یہ سب کے دن ہوئے

نجوم - ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باھر
زھرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا تحویل

طبیعیات - ھیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہر گردوں ہے چراغ رھگزار باد یاں

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

تصوف - دھر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

موسیقی۔ ڈھونڈے ہے اس مغنی آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برق فنا مجھے

ساقی بہ جلوہ دشمن ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

ع خالۂ عاشق مگر ساز صدائے آب تھا (جلترنگ)

آداب وضعداری۔ واں وہ غرور عزو ناز یاں یہ حجاب پاس وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں
کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی
آئینہ دار بن گئی حیرت نقش پا کہ یوں

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہی کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

دوستوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا ہر زمانے میں اچھا سمجھا گیا ہے ۔ مرزا کے عہد میں یہ رسم جاری تھی ۔ ان کے شاگرد اور احباب ان سے بے حد محبت کرتے تھے ۔ سراج الدین ، میاں داد خاں ، میر مہدی ، سرفراز حسین ، رائے چھج مل ، بالمکند بیصبر ، ہرگوپال تفتہ ، غلام غوث بیخبر ، غلام امام شہید ، احمد حسن مودودی ، عبدالجمیل بریلوی ، عبدالغفور اساخ ، سب کو ان کی دلفریب شخصیت نے مسحور کر رکھا تھا ۔ یہ لوگ خطوط اور تحفوں سے اپنی نیازمندی کا اظہار کرتے تھے ۔ غدر کے پرآشوب زمانے میں بھی ان کے ہندو شاگردوں نے رفاقت کا حق ادا کیا اور مرزا کی خیر خبر لیتے رہے ۔

جون ۱۸۴۷ء میں جب مرزا قمار بازی کے مقدمے میں ماخوذ ہوئے تو ان کے سسرالی عزیزوں یعنی خاندان لوہارو نے اگرچہ بیوفائی کا مظاہرہ کیا لیکن نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ برابر ان کی رہائی کے لئے کوشاں رہے اور ان سے ملنے کے لئے آتے رہے جس کا شکریہ مرزا نے اپنے مشہور فارسی ترکیب بند میں ان الفاظ میں کیا ہے کہ مجھے مرنے کا بھی غم نہیں کیونکہ شیفتہ جیسا دوست اور شاگرد مجھے رونے کے لئے موجود ہے ع

مصطفیٰ خاں کہ دریں واقعہ غمخوار من است
گر بمیرم چہ غم از مرگ ، عزا دار من است

اس کے برعکس بعض نازک موقعوں پر جن دوستوں اور عزیزوں نے بیوفائی کی تھی - اس کا داغ ان کے دل پر تھا - بقول حالی وہ بہت حوصلہ مند تھے اور اکثر محرومی و مصائب کو دستور زمانہ یا مشیت ایزدی کہہ کر بھلا دیتے تھے - سپہگری ان کا آبائی پیشہ تھا اور سپاہی کی حیثیت سے وہ خود بھی آلام و مصائب کا مقابلہ کرتے تھے - متاع بردہ کو رہزن پر قرض سمجھنا اور لٹنے کے بعد چین سے سو کر رہزن کو دعا دینا ان کی خوش مزاجی و استقامت کی دلیل ہے :
لیکن دل ھی تو ھے سنگ و خشت نہیں - جب شدت درد سے ان کا دل بھر آتا تھا تو ان کے ساز غزل سے ایسے دردناک نغمے بھی نکلتے تھے جو ان کے حالات و کوائف کے ترجمان ھیں - ذیل کے اشعار میں یہ گلہ مندانہ انداز انھی حالات کی نشان دھی کر رہا ھے :

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
ھے دل پہ بار نقش محبت ھی کیوں نہ ہو

میں ھوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرز تپاک اھل دنیا جل گیا

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ھوتا ھے

کہوں کیا خوبیٔ اوضاع ابنائے زماں غالب
بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

مرزا نے زندگی بھر اپنے آبائی اعزاز کو قائم رکھنے کی کوشش کی ۔ انہوں نے ناسازگار حالات کے سامنے سر نہیں جھکایا اور ہر محرومی و مصیبت میں ہمت مردانہ کے ساتھ اصلاح حال کی کوشش کی ۔ جہاں وہ بالکل مجبور ہوگئے وہاں بھی سپرانداز ہونے کے بجائے انہوں نے اظہار ہمت اور تاب مقابلہ کا مظاہرہ کیا ۔ اس حوصلہ مندی کے پس پشت ان کی نسلی اور ملکی خصوصیات کارفرما تھیں۔ تورانی خون اور سو پشت کی سپہگری نے انہیں مقاومت اور جد و جہد کا حوصلہ بخشا تھا جو ان کے اشعار کے آئینے میں صاف نظر آتا ہے :

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

مجھے معلوم ہے جو تو نے میرے حق میں سوچا ہے
کہیں ہو جائے جلد اے گردش گردون دوں وہ بھی

ہے موجزن اک قلزم خوں کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

زمانہ سخت کم آزار ہے بجان اسد
وگر نہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

بیگانگی خلق سے بد دل نہ ہو غالب
کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

مرزا کی شخصیت بہت ہی پہلودار ، متنوع اور تابناک ہے ۔ حالی ، مالک رام ، عرشی اور وزیرالحسن عابدی نے ان کی سیرت کے اکثر پہلو بے نقاب کئے ہیں ۔ لیکن غالباً ان کے اپنے کلام میں ان کی سیرت کے نقوش جتنے روشن ہیں کسی اور تحریر میں اس سے زیادہ واضح نظر نہ آئیں گے ۔

اے کاش کبھی معرض اظہار میں آوے

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

ادھر یہ تاکید کہ "ایک ہزار الفاظ کے اندر اندر یہ بیان کر دیا جائے کہ غالب نے آپ کی ذہنی فکری اور جذباتی زندگی کو کس عنوان سے متاثر کیا ہے ادھر اظہار خیال کرنے والوں کو غالب کی یہ تہدید کہ

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

بڑی کٹھن منزل ہے لیکن تاثر بھی تو ایسی چیز نہیں جسے آدمی چھپا کا مفہوم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے سب اس کے اظہار پر مجبور ہیں اور اسی مجبوری کے ہاتھوں مجھے کہنا پڑتا ہے کہ میں غالب کے اس دعوائے ثبوت پر

گر شعر سخن بہ دھر آئین بودے دیوان مرا شہرت پروین بودے
غالب اگر این فن سخن دین بودے آں دین را ایں کتاب آئین بودے

اس وقت ایمان لایا ہوں ع

"کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوار دبستان پر"

ہوا یہ کہ تعلیم و تربیت کے ابتدائی دور سے لے کر سن بلوغ تک گھر اور گھر کے باہر مجھے جس قسم کا ادبی ماحول میسر آیا اس میں غالب کا ذکر اتنی شدت اور اتنی کثرت سے سننے کو ملا کہ وہ ذہن کے لاشعوری خانے کا اہم جزو بن گئے جیسے جیسے شعر و سخن کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی اہلیت بڑھتی گئی - میرا ایمان ان کی ثبوت شعری پر پختہ ہوتا چلا گیا اور ایک دن وہ آیا کہ زندگی اور ادب کی اکثر منزلوں میں وہ میرے راہنما اور مشکل کشا بن گئے - اگر تعلی سے تعبیر نہ کریں تو یوں سمجھ لیجئے کہ اردو شاعری کی دنیا میں ہر تیز رو کے ساتھ تھوڑی دور چلنے کی زحمت میں نے نہیں

اٹھائی بلکہ آغاز سفر ہی میں راہبر کو پہچان لیا تھا ۔ اس راہبر نے میری جذباتی فکری اور ذہنی دنیا کو کس کس انداز سے متاثر کیا ہے ۔ اس تفصیل کی یہاں گنجائش کہاں ۔ مجملاً اس قدر عرض کرونگا کہ زندگی اور شعر و ادب کے باب میں جتنا کچھ میں نے غالب سے سیکھا ہے اردو و فارسی کے کسی اور شاعر سے نہیں سیکھا ۔

شاعری قافیہ پیمائی نہیں معنی آفرینی ہے ۔ حمزہ کا قصہ نہیں دل گداختہ کی تفسیر ہے ۔ لڑکوں کا کھیل نہیں جزو میں کل کی نمائش ہے قد و گیسو کی آرائش نہیں دارو رسن کی آزمائش ہے دشنہ و خنجر یا بادہ و ساغر کا تذکرہ نہیں ۔ مشاہدہ حق کی گفتگو ہے ۔ شعر و ادب کے سلسلے میں اس طرح کی بہت سی باتوں کا شعور و احساس ابتداً مجھے غالب ہی سے ملا ہے ۔

فلسفۂ جدلیات اور کرشمۂ اضداد اور زندگی و ادب کے رشتوں کے متعلق ہیگل اور میتھو آرنلڈ سے لے کر علامہ اقبال و مجنوں گورکھپوری تک پڑھنے کو تو کیا کچھ نہ پڑھا تھا لیکن ذہن سے بڑھ کر دل میں بات اس وقت اتری جب غالب کے اس نوع کے شعر سامنے آئے :

کشا کشہائے ہستی سے کرے کیا سعی آزادی
ہوئی زنجیر موج آب کو فرصت روانی کی

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئنۂ باد بہاری کا

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

محاکات شعری اور تخیل کی گلکاری و رسائی کے بارے میں مقدمہ شعر و شاعری اور شعرالعجم میں بہت کچھ پڑھا تھا لیکن ذوق کی تشفی اور ذہن کی سیرابی کا سامان اس وقت میسر آیا جب غالب کے اس قسم کے اشعار نظر سے گزرے ۔

لیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشان ہو گئیں

رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتن گلہائے ناز کا

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

زندگی کی گہما گہمی اور کار جہاں کی درازی کی خبر دوسرے شاعروں نے بھی دی تھی لیکن اس خیال کا سچا لطف اس شعر کے بعد نصیب ہوا:

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

معاشی عدم مساوات کی لعنتوں، مزدور پر سرمایہ دار کی سختیوں اور کسان پر جاگیردار کی زبردستیوں کے قصے صرف یہی نہیں کہ پڑھے یا سنے تھے بلکہ اس قسم کے واقعات آنکھوں سے دیکھے تھے لیکن جب تک غالب کا درج ذیل شعر نظر سے نہ گزرا تھا۔ افلاس و ناداری پر دولت و سرمایہ کے جبر و استبداد کا پورا احساس نہ ہوا تھا:

غارت گر ناموس نہ ہو گر ہوس زر
کیوں شاہد گل باغ سے بازار میں آوے

وفائیت کے انتہا پسند مبلغوں نے زندگی کو یکسر نشاط اور قنوطیت کے ازلی طرفداروں نے اسے یکسر غم ثابت کر دکھانے کی کیا کیا نہ کوشش کی تھی لیکن جب غالب کے اس قسم کے اشعار سامنے آئے:

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
درماندگی میں ہر کوئی نالے سے ناچار ہے

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

تب اندازہ ہوا کہ فطرت انسانی اور لازمۂ بشریت سے دونوں بے خبر ہیں ۔ زندگی حقیقتاً ایک سی نہیں غم اور خوشی دونوں سے عبارت ہے ۔

ایجاز و اختصار اور معنی خیزی و معنی آفرینی کی تعریفیں پہلے بھی پڑھی تھیں لیکن اس قسم کے اشعار سے پہلے :

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

یہ سمجھ میں نہ آیا تھا کہ کوزے میں سمندر بند کرنا کسے کہتے ہیں ۔ اور محذوفات و مقدرات شعر کی تاثیر کس طرح بڑھا دیتے ہیں ۔

حیات و کائنات اور اس کے ارتقا کے متعلق ڈارون اور دوسرے مفکرین کے توسط سے کیا کچھ نہ سن رکھا تھا لیکن یہ راز کہ غزل میں ان خیالات کا حیات افروز اور نشاط خیز مصرف کس طرح ہونا چاہئے ۔ ذیل کے اشعار سے منکشف ہوا :

زمانہ عہد میں اس کے ہے محو آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

فلسفیانہ طرز فکر اور حکیمانہ اسلوب کے متعلق یہ تو سن رکھا تھا کہ ایک عظیم شاعر جو کچھ کہتا ہے استدلال کے ساتھ کہتا ہے ، جو دعویٰ کرتا ہے ثبوت

کے ساتھ کرتا ہے لیکن شنیدہ کو دیدہ کی حیثیت کچھ اس قسم کے اشعار کے بعد نصیب ہوئی :

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمہی تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

طنز و ظرافت کے سلسلے میں جعفر کی زٹلیات ، سودا کی ہجویات اور انشا و مصحفی کی خرافات سبھی کچھ نظر سے گزری تھیں لیکن اس طرز خاص کی حلاوت و حذاقت اور لطافت و افادیت اس وقت سمجھ میں آئی جب مرزا نوشہ کے اس نوع کے اشعار مطالعہ میں آئے ۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد سر گشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو منظور تنک ظرفیٔ منصور نہیں

گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے

شنیدۂ کہ بہ آتش نہ سوخت ابراہیم
بہ بیں کہ بے شور و شعلہ می توانم سوخت

یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی
گر بگڑ بیٹھے تو میں لائق تعزیر بھی تھا

لفظ و معنی کے ربط باھمی پر بہت کچھ پڑھا تھا اور شاعری میں رعایت الفاظ کی حسن خیزی کے متعلق "حذائق السحر" سے لے کر "العجم" تک بہت کچھ سمجھا تھا لیکن جب تک یہ اشعار

شور پند ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزہ پایا

تم کون سے ایسے تھے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

عرض کیجئے جوھر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

نظر سے نہ گزرے تھے رعایت لفظی کو عیب کے سوا ھنر کہنے کو جی نہ چاھتا تھا - رجائیت اور رجانی نقطہ نظر کے متعلق فلسفہ و نفسیات کی بحثوں اور اقبال کے سلسلے کی کتب و مقالات میں بہت کچھ پڑھا تھا لیکن یہ نقطہ کہ شعر و ادب میں اس نقطۂ نظر کو کس طرح اور کس انداز سے دخیل ھونا چاھئے - غالب کے ان اشعار کے بعد سمجھ میں آیا :

کیا فرض ھے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ھم بھی سیر کریں کوہ طور کی

بے تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلاست
قعر دریا سلسبیل و روئے دریا آتش ست

غرض کہ غالب اور کلام غالب نے جو فکر و فن کے ان گنت لکتے سمجھائے ھیں - ذھن کے نہ جانے کتنے گوشوں کو منور کیا ھے اور

"چشم کو چاھئے ھر رنگ میں وا ھو جانا"

کی معرفت میری فکری اور جذباتی زندگی کو کسی ایک عنوان سے نہیں سینکڑوں عنوان سے متاثر کیا ھے -

لیکن یہ تاثر

"اے کاش کبھی معرض اظہار میں آوے"

غالب کی انفرادیت کے چند پہلو

انور سدید

غالب کی صد سالہ برسی دنیا بھر میں احترام و احتشام سے منائی جا رہی ہے اس سے ایک احساس یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی بڑے شاعر کی قدر و قیمت کے تعین کے لئے وقت بھی ایک پیمانہ ہو سکتا ہے - بادی‌النظر میں دیکھئے تو وقت صرف ایک تصور ہے اور صبح و مسا کی گردش اس کا ایک فرض پیمانہ ہے جو موجود اشیا کے تصور کو شعور کی سطح پر زندگی بخشتا ہے - گویا وقت ایک خیال یا ذہنی کیفیت ہے جس سے مکانی اشیا کی حدود کے تعین میں معاونت ملتی ہے - جس طرح مادی اشیا کے لئے مکان یہ کائنات ہے- اس طرح خیال تصورات کے لئے مکان انسان کا داخل ہے (اسے سہولت کار کے لئے لا مکان کہہ لیجئے) جہاں سے تصورات مرئی یا غیر مرئی صورت میں متشکل ہوتے ہیں - وہ شاعر جو صرف موجودات کو موضوع فکر بناتا ہے اس کی نظر محدود اور سطحی ہوتی ہے اور وہ موجود اشیا کی نسبتی ترتیب کے خلط ملط ہوتے ہی معدوم ہو جاتا ہے - غالب کے گرد و پیش میں ذوق ، شاہ نصیر اور ناسخ وغیرہ اس قبیل سے تعلق رکھتے ہیں - ان شعرا میں سے بیشتر نے لفظی آرائش ، قافیہ و ردیف کی صنعت گری اور جسم کے صرف ظاہری حسن کو ہی موضوع شعر بنایا ہے اور جہاں کہیں ان کی توجہ معروضی ہوئی ہے وہیں بات بنی نہیں اور اجنبی پن صاف ظاہر ہوگیا ہے - یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے تمام شعرا توجہ خاص سے جلدی محروم ہوگئے - حتیٰ‌کہ آج ان کا نام صرف ادبی تذکروں کی یادگار ہو کر رہ گیا ہے - اس کے برعکس وہ شاعر جو جسم کی معروضی حیثیت کے اعتراف اور گرد و پیش کی اشیا سے تاثر حاصل کرلینے کے باوجود ذہن کی موضوعی حیثیت کو فوقیت دیتا ہے وہ موجود اشیاء کی نسبتی ترتیب اور وقت کے رومانی تصور سے ماورا ہو جاتا ہے بلکہ اشیا کی ہر نئی ترتیب اور وقت کا ہر نیا نظام اس کے فکر کے سانچے کو پوری معنویت سے قبول کرتا ہے - دوسرے لفظوں میں وقت کی فرضی تقسیم اس کے افکار پر اثر انداز

نہیں ہوتی۔ غالب ایک ایسا شاعر ہے جو وقت کی ہر قید سے بلند ہے۔ وہ وقت کی گردش کو خاطر میں نہیں لاتا۔ بلکہ وہ ایک ایسی فعال قوت کا مالک ہے جس سے وقت کو اپنا تابع فرمان بنا لیتا ہے۔ پھر اس کے فکر کا سارا سفر داخل سے لامکاں میں طے پاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ غالب کو اس صفحۂ ہستی سے گزرے ہوئے تو سو سال ہو چکے ہیں لیکن اس کے کلام کی تازگی میں کوئی فرق نہیں آیا اور آج جب اس کی دریافت نو دنیا بھر کے ممالک میں ہو رہی ہے تو اس کے فن کی اتنی جہتیں سامنے آرہی ہیں کہ جن پر اس سے پہلے شاید کبھی روشنی نہیں ڈالی گئی۔

مثال کے طور پر یہ دیکھئے کہ غالب کی شاعری میں فلسفے کا گہرا شعور زندگی کا عمدہ ادراک اور حسن سے متاثر ہونے کا پختہ ذوق ملتا ہے۔ لیکن اس نے فلسفے کے کسی مروجہ نظام فکر کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے نہ ہی کسی متوازی اساس پر کسی مخصوص پروگرام کے مطابق شاعری کی ہے۔ مشکل پسندی اس کے مزاج کا ایک غالب رجحان ہے۔ تقلید سے وہ نفرت کرتا ہے۔ اس کا ذہن خلاق، دماغ متجسس، دل سکون ناآشنا ہے اور وہ زندگی کی ہموار سڑک کو چھوڑ کر اسپتاً مشکل راہ اختیار کرتا ہے۔ ہموار اور سیدھا راستہ منزل کی طرف انبوہ کی راہنمائی کر سکتا ہے لیکن انبوہ میں فرد کی اکائی قائم نہیں رہتی۔ غالب ایسا شخص ہے جو اپنی انفرادیت کے تحفظ کے لئے انبوہ کے ساتھ مرنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ اس لئے اس دور میں جب رواج کی تقلید سکۂ رائج الوقت بن چکا تھا۔ مغل تہذیب و تمدن کی بجھی ہوئی شمع کو دیکھ کر عامتہ الناس کی وفاداریاں متزلزل ہورہی تھیں۔ ریاکاری عوامی رجحان بن چکا تھا۔ غالب نے مقاومت کمترین کی راہ اختیار نہیں کی بلکہ اپنی لئے مشکل راستہ ڈھونڈا۔ یہ مشکل راہ پگڈنڈی کا تھا۔ پگڈنڈی کھلے میدان کے کشادہ سینے میں مڑی تڑی ناہموار سی لکیر ہوتی ہے جس پر چلنے کے لئے دماغ حاضر اور حواس بیدار رکھنے پڑتے ہیں۔ یہ ٹیڑھا میڑھا راستہ زود یا بدیر منزل پر پہنچا تو دیتا ہے لیکن اس تمام عرصے میں منزل کی تلاش کے لئے سوچ کو متحرک رکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ پگڈنڈی کا راستہ صرف وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جن کی نگاہ تیز، اختراع کی قوت زیادہ اور انفرادیت مسلم ہو۔ جو شخص اس راستے پر عزم راسخ

سے رواں دواں ہو جاتا ہے فطرت اس پر اپنے بوقلموں خزینوں کے منہہ کھول دیتی ہے - بنات النعش گردوں اپنے سینے عریاں کر ڈالتی ہیں اور زندگی کی تمام مخفی حقیقتوں کے راز آشکار ہونے لگتے ہیں - غالب کی خوبی یہ ہے کہ وہ ان مخفی حقیقتوں کے ادراک اور اظہار کے لئے جب تخلیق شعر کا فریضہ قبول کرتا ہے تو اپنے کسی معاصر یا پیش رو سے تحریک حاصل نہیں کرتا بلکہ روایت کی تقلید کی بجائے اپنے نجی تجربے کو زیادہ اہمیت دیتا ہے - شاید یہی وجہ ہے کہ اس نے کسی مروجہ فلسفے کو قبول نہیں کیا بلکہ فلسفے کے ہر زاویئے پر اپنے تجسس کو تازہ کیا اور فطری تشکیک سے ایک نئی معنی آفریں دنیا آباد کی - اور جب اس کا تعقل اور تجربہ اس تشکیک کا کوئی جواز پیدا نہ کر سکا تو خود ایک مجسم سوال بن گیا -

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں غمزہ و عشوہ وادا کیا ہے ؟
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے ؟

اس تشکیک سے غالب ہستی کی موجود حیثیت کو بھی تحیر سے دیکھتا ہے اور ایک طرح سے بے دلی کے جذبات کو پرورش دیتا ہے -

اسد سودائے سرسبزی سے ہے تسلیم رنگیں تر
یہ کشت خشک اس کی ابر بے پردا خرام اس کا

ہاں کھائیو مت فریب ہستی ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

اس بے دلی کے باوجود غالب کا وحدت کا تصور اس کے فکر کا ایک نمایاں زاویہ ہے - مثال کے طور پر یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں -

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

لیکن جب وہ اس جہاں رنگ و بو پر نظر ڈالتا ہے تو وہ اسے کائنات کی یہ غیر مرتب کثرت حیقت عظمیٰ کا مظہر نظر آتی ہے - شاید یہی وجہ ہے کہ غالب کی شاعری میں کائناتی زندگی کے احترام کا مثبت پہلو زیادہ واضح ہے - اور اس نے تسکین قلب کے لئے مادی وسائل کو ہی ذریعہ بنایا ہے - جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے -

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے
حوران خلد میں تری صورت اگر ملے

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

غالب کے زمانے میں معاش جس شکست و ریخت کا شکار ہو رہا تھا اس نے عامتہ‌الناس میں بے یقینی کی ایک عام فضا پیدا کر رکھی تھی - ہر چند اس زمانے میں مغرب میں مادیت کا فروغ ترقی پر تھا لیکن مشرق اس کی بے وقعت حثیت کو تسلیم کرکے باطن کی دنیا میں پناہ تلاش کر رہا تھا - اس دور کے بیشتر شاعروں نے مادیت کے خلاف بلند آواز اٹھائے ہوئے فیض کے اسباب تلاش کرنے کی جو تلقین کی ہے وہ دراصل زندگی کی نفی اور تصوف کے واسطے سے حقیقت عظمیٰ کو تلاش ہی کا سبق ہے - غالب نے بھی ادراک حقیقت کے لئے تصوف کی اہمیت کو قبول کیا - تصوف کے فلسفے پر فکری شاعری کی - لیکن اسے تزکئیہ نفس کا ذریعہ نہیں بنایا - اس کی ایک بڑی وجہ یہ کہ غالب زندگی کی نفی نہیں کرتا بلکہ زندگی کو اس کی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ قبول کرتا ہے اور پھر رعنائیوں میں پوری طرح شرکت (Participate) کرتا ہے - اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نے غائتوں کی غائت دوئی کو پہچاننے کے لئے بھی مادیت ہی کا دل فریب اور نظرافروز چمن آراستہ کیا - اور تصوف کے وحدت الوجودی پہلو کو زیادہ اہمیت دی - پھر اس کا ایقان یہ بھی تھا کہ حقیقت عالم کا ادراک مادی کثافت کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا -

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ باد بہاری کا

دھر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوئے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

مغرب میں فلاطینوس اس وحدت وجودی فلسفے کا حامی ہے - اس کے مطابق مادی موجودات کائنات مطلق سے اس طرح پیدا ہوتی ہیں جس طرح آفتاب سے روشنی - خدا خود نور ازل ہے اور جب اسے اپنی صورت کا مشاہدہ منظور ہوا تو کائنات وجود میں آگئی -

منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی
قسمت کھلی ترے قدو رخ کے ظہور کی

جلوں ازبس کہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہر آئینہ بھی چاھے ہے مژگاں ہونا

مایا کا نظریہ بھی یہی ہے کہ اصل ہستی برھم کی ہے اور باقی سب سراب ہے - شنکر اچاریہ کے مطابق وحدت حقیقی صرف ایک ہے اور مایا کی تمام کثرت اس ایک ھی حقیقت کے بکھرے ہوئے روپ ھیں - ارتقائے کائنات کو ملحوظ رکھئے تو ابتدا میں ہستی صرف ایک تھی اور باقی سب کچھ بے جان تھا [۱] - سورج کی حرارت اور روشنی نے زمین کے اس بے جان مجسمے میں زندگی کے آثار پیدا کئے - غیر نامیاتی شے کو نامیاتی شے میں تبدیل کرنے کی طرف یہ پہلی جست تھی - پھر امیوبا پیدا ہوا جس میں نر اور مادہ دونوں کے خواص موجود تھے - نر اور مادہ کے الگ الگ وجود کی افزائش یا دوسرے لفظوں میں آدم اور حوا کی پیدائش اس تقسیم کا اگلا قدم ہے - گویا انسان کے معرض ہستی میں آنے کی داستان دراصل کائنات کے تقسیم کے عمل میں پوشیدہ ہے - لطف کی بات یہ ہے کہ تقسیم کی کثرت ھی حرف آخر نہیں بلکہ بکھرنے کے بعد اس میں سمٹنے کا جذبہ بھی اس طرح موجود ہے - انسان میں سمٹنے کی یہ خواھش دراصل حسن ازل میں دوبارہ سما جانے کا ھی جذبہ ہے - غالب نے کائنات کے اس دائروی عمل کو شدت سے موضوع فکر تو نہیں بنایا لیکن اس نے کائنات اور اس کے لوازمات کے بارے میں بڑے

۱- تفصیل کے لئے ڈاکٹر وزیر آغا کا گرانقدر مقالہ "تخلیقی عمل کا حیاتیاتی پہلو مطبوعہ "اردو زبان" سرگودھا دسمبر ۶۸ دیکھئے -

توانا سوالات ابھارے ھین جو اس بات کو ظاھر کرتے ھین کہ وہ موجودات کی حقیقت جاننے کے لئے کتنا مضطرب تھا -

جب کہ تجھ میں نہیں کوئی موجود پھر یہ ھنگامہ اے خدا کیا ھے
یہ پری چھرہ لوگ کیسے ھین غمزہ وعشوہ دادا کیا ھے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ھین ابر کیا چیز ھے ھوا کیا ھے ؟

ھستی ازل میں دوبارہ مدغم ھونے کا جذبہ جو بنیادی طور پر (Eternal Return) یا دائمی مراجعت کا جذبہ ھے اس کے ان اشعار سے واضع ھوتا ھے -

پر تو خود سے ہے شبنم کوفنا کی تعلیم
میں بھی ھوں ایک عنائت کی نظر ھونے تک

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ھو جانا
درد کا حد سے گزرنا ھے دوا ھو جانا

اوپر کی بحث کا ایک نتیجہ یہ ھے کہ نامیاتی اور حیوانی سطح پر زندگی کے ظہور سے پہلے کائنات صرف غیر نامیاتی اشیا کا مجموعہ تھی اور ھستی مطلق صرف ایک تھی - یہ حالت گویا روحانی سکون کا نقطۂ عروج تھی - فطرت انسانی کا جائزہ لیجئے تو سکون کے اس عووج کو دوبارہ حاصل کرنا انسان کی سب سے بڑی خواھش ھے - یہی وہ جنت گم گشتہ ھے جس کو دوبارہ پانے کے لئے انسان کبھی بطن ماھی میں جاتا ھے اور کبھی اپنے اندر کے گہرے سمندروں میں غوطہ لگاتا ھے - دوسرے لفظوں میں یہ غوطہ اس حرکت کو جسے ھم زندگی کہتے ھین یکسر روک دیتا ہے اور انسان کو اس غیر نامیاتی حقیقت سے آشنا کرتا ہے جو یکسرسکون ھے اور ھمہ‌تن مسرت ھے - مادے کی متحرک زندگی میں ٹھہرے ھوئے مناظر فطرت (Static Scenary) سے انسان شاید اس لئے زیادہ اکتساب سرور کرتا ھے کہ خد و خال کے غیر دوامی حسن کی بہ نسبت حسن فطرت خالق حسن سے زیادہ قریب ھے - بلکہ یہ حیات انسانی کے معرض وجود مین آنے کے وقت سے بھی کہین زیادہ قدیم اور دوامی ھے - غالب خد و خال کے حسن کا ھی خراج داں نہین بلکہ وہ فطرت کے مناظر میں حسن کو بے نقاب دیکھ کر بے پایاں سرمستی اور بے پناہ سرخوشی

محسوس کرتا ہے۔ شاید حسن ازلی کی تلاش میں یہ مناظر غالب کو نور حقیقت کے قریب تر کر دیتے ہیں۔

صبحدم دروازۂ خاور کھلا مہر عالم تاب کا منظر کھلا
سطح گردوں پر پڑا تھا رات کو موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا
صبح آیا جانب مشرق نظر اک نگار آتشیں رخ سر کھلا

پھر اس انداز سے بہار آئی کہ ہوئے مہروماہ تماشائی
دیکھ اے ساکنان خطۂ پاک اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہوگئی ہے سر تا سر روکش سطح چرخ مینائی

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے
طاقت کہاں کہ دید کا ساماں اٹھائیے

غالب کی انفرادیت کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس نے نجی تجربے کے اظہار کو روش زمانہ کی تقلید کا ذریعہ نہیں بنایا۔ ہر چند غالب کے فکری اظہار کی صنف تو غزل ہی ہے لیکن موضوعی اعتبار سے اس کی غزل اپنے زمانے سے بہت آگے اور مستقبل کے نئے ادبی شعور کی آئینہ دار ہے۔ اس زمانے میں جب اس کے تمام ہم عصر ظاہر کے صریری پردوں کو شاعری کا موضوع بنا رہے تھے۔ غالب نے داخل کے اضطراب کو موضوع فکر بنایا اور اپنی چھوٹی سی قندیل ہواؤں کے مخالف رخ روشن کی۔ اس سطیحت کو بالائے طاق رکھ کر تفکر کو برانگیختہ کیا۔ غالب کسی محدود زمانے یا ماحول کا شاعر نہیں بلکہ اس کی آفاقیت آنے والے کئی زمانوں کا احاطہ کر رہی تھی وہ اپنے زمانے میں جدیدیت کا اولین داعی تھا جس نے ٹھہرے ہوئے فکر کو تحرک اور زندگی دی۔ معاشرے کو نئے سماجی تقاضوں کے مطابق پرکھا۔ سیاست کے بدلتے ہوئے رجحانات کو مثبت زاویۂ نظر سے قبول کیا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ وہ وقت کی قید سے ماورا ہوگیا اور اس کا تتبع بعد میں آنے والے تمام شعرا کرنے لگے۔

غالب کے اپنے زمانے میں اس کا قاری غالب صدیوں سے پیچھے تھا۔ اور اسی لئے وہ اس کی عمق فکری اور ژرف نگہی کا ساتھ نہ دے سکا۔

غالب کو سمجھنے کی اولین سنجیدہ کوشش مولانا الطاف حسین حالی نے کی - ہر چند حالی نے جذباتیت سے الگ ہوکر کلام غالب پر نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے لیکن ان کی فطری کمزوری اس خواہش پر غالب نہیں آ سکی اور وہ اسداللہ خان سے اپنے جذباتی تعلق کو الگ نہیں کر سکے - تاہم بقول ڈاکٹر وزیر آغا حالی کی تنقید غالب کو ادب میں بحال کرنے کی اولین کامیاب کوشش ہے اور اس تنقید کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے - حالی کی اس تنقید نے ادب کے ایک ٹوٹے ہوئے تارے کو مکمل بنا دیا ہے - اس سے ذرا آگے بڑھئے تو عبدالرحمان بجنوری نے غالب کو آفاقی مقام دینے کی عمدہ کاوش کی لیکن جذباتیت سے وہ بھی دامن نہ بچا سکے - بجنوری کا صرف ایک جملہ کہ ”ہندوستان کی مقدس کتابیں صرف دو ہیں مقدس وید اور دیوان غالب“ ادب کی سطح پر موضوع گفتگو تو بن گیا لیکن اس کا نقصان یہ ہوا کہ غالب پر صحیح عملی تنقید سالوں پیچھے جا پڑی - بجنوری کے اس انتہا پسندانہ جذباتی انداز نظر کا رد عمل ڈاکٹر عبداللطیف، نیاز فتح پوری اور کسی حد تک اختر کی تنقید کی صورت میں ابھرا جس سے متزکرہ مثبت زاویوں کے مقابلے میں اسی جذبے کے انتہا پسندانہ منفی پہلو منظر عام پر آگئے - تنقید کی یہ دونوں زاویے یک طرفہ ہیں - شاید اسی لئے غالب اپنے صحیح Perspective میں سامنے نہیں آسکا - بیسویں صدی میں نئے علوم کی دریافت اور فروغ نے ادبی تنقید کا رخ ہی بدل ڈالا ہے - انتھروپالوجی اور سائیکالوجی نے اب انسان کے باطن میں غوطہ لگا کر شخصیت کے درآب دار برآمد کرانا آسان کر دیا ہے - آفاقی شاعر وقت سے ماورا ہوتا ہے اور یہ نیا علم اپنی روشنی میں اس کے فکر کی بالکل نئی پرتیں سامنے لاتا ہے - اس لئے میری ناقص رائے میں غالب پر تنقید لکھنے، اس کے فکر کی جہتیں دریافت کرنے اور اس کی شخصیت کے باطن میں جھانکنے کا صحیح وقت شاید اب آیا ہے - اور غالب کی دریافت نوکا کام دنیا بھر میں شروع ہو گیا ہے تو یہ کچھ اچنبھا نہیں ہے -

غالب کے اسلوب نثر نگاری کا مسئلہ

نصیر احمد زار

غالب کے مکتوبات اردو نثرنگاری کی تاریخ میں ایک ایسا سنگ میل ہیں جس پر ٹھہرے ٹھٹکے اور جس کی بےساختہ مدح کے بغیر اردو ادب کا مسافر آگے قدم بڑھانے سے قاصر ہے۔ اور جب آگے بڑھ جاتا ہے تو ان مکتوبات کی شیریں یاد ہمیشہ کے لئے اپنے ساتھ لے جاتا ہے جس کی جگہ کوئی دوسری چیز نہیں لے سکتی۔ طالب علمان ادب کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ غالب نے مکتوب نگاری کا یہ نرالا اسلوب کہاں سے پایا؟ آج کی گفتگو اسی ایک سوال کے سلسلے میں تفحص اور تحقیق تک محدود ہے۔

سب سے پہلے مولانا حالی مرحوم کی رائے اس بارے میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ یادگار غالب میں حالی مرحوم نے غالب کی اردو مکتوب نگاری اور اس طرز خاص کے اختیار کرنے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ غالب جس زمانے میں بادشاہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے تھے اور خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھنے کا کام ان کے سپرد ہوا تھا اس زمانے میں حد سے بڑھی ہوئی مصروفیت کے باعث زمانے کی وضع کے مطابق فارسی میں پورے آداب کے ساتھ مکتوب تحریر کرنے کا نہ ان کے پاس وقت رہا تھا اور نہ حوصلہ۔ لہذا وہ اپنے ذاتی دوستوں کے نام بےتکلفی سے اردو ہی میں لکھ دیتے تھے اور اس بہانے سے زاید محنت اور وقت کے خرچ سے محفوظ ہو جاتے تھے۔ اور یہ وہ رائے ہے جسے مولانا حالی سے منسوب ہونے کی وجہ سے مابعد کے نقادوں نے بلاتحقیق قبول کر لیا۔

اس رائے سے جو نتائج مرتب ہوتے ہیں وہ یہ ہیں: اول یہ کہ غالب کی اردو میں مکتوب نگاری محض اتفاقی امر تھا۔ دوم یہ کہ ایسی مکتوب نگاری فارسی زبان میں پرتکلف خطوط لکھنے کی نسبت کمتر درجے کی چیز تھی اور

سوم یہ کہ مکاتیب غالب کا یہ سہل اسلوب فقط حادثاتی تھا جسے بعد کے لوگوں نے حامل قدر و قیمت قرار دیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے آیا ان نتائج کو داخلی یا خارجی شواہد سے پایہ ثبوت تک پہنچایا جا سکتا ہے یا نہیں؟

سب سے پہلے ہم داخلی شواہد کا جائزہ لیتے ہیں۔ اردو مکتوب نگاری اور ان مکاتیب کے انداز خاص کے بارے میں خود مکاتیب کے اندر ایسی عبارتیں مل جاتی ہیں جن سے ایک صحیح تر رائے قائم کرنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ چنانچہ مرزا حاتم علی بیگ مہر کو لکھتے ہیں:-

"مرزا صاحب میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔"

مرزا تفتہ کے نام ایک خط میں تحریر کرتے ہیں:-

"بھائی مجھ میں تم میں نامہ نگاری کاہے کو ہے مکالمہ ہے"

نواب انوارالدولہ شفق کے نام نامہ میں فرماتے ہیں:-

"یہ خط لکھنا نہیں ہے باتیں کرنی ہیں اور یہی سبب ہے کہ میں آداب و القاب نہیں لکھتا۔"

اور میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں تو عام روش مکتوب نگاری اور اپنے انداز خاص کا تقابلی مطالعہ کرکے اپنے انداز کی برتری جتاتے ہیں:-

"تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ لفافہ کو کریدا کرو۔ مسودہ کو بار بار دیکھا کرو۔ یعنی تم کو وہ شاہی روشیں پسند ہیں۔ "یہاں خیریت ہے۔ وہاں عافیت مطلوب ہے۔ خط تمہارا بہت دن کے بعد پہنچا۔ جی خوش ہوا۔ مسودہ بعد اصلاح کے بھیجا جاتا ہے۔ برخوردار میر سرفراز حسین کو دینا اور دعا کہنا۔ اور ہاں حکیم میر افضل علی کو بھی دعا کہنا۔ لازمۂ سعادتمندی یہ ہے کہ ہمیشہ اسی طرح خط بھیجتے رہا کرو۔" کیوں سچ کہیو اگلوں کے خطوط کی تحریر کی یہی طرز تھی، ہائے کیا اچھا شیوہ ہے جب تک یوں نہ لکھو وہ خط ہی نہیں۔ چاہ بے آب ہے۔ ابر بے باراں ہے۔ خانہ بے چراغ ہے۔ چراغ بے نور ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تم زندہ ہو۔ تم جانتے ہو کہ ہم زندہ ہیں۔ امر ضروری لکھ دیا۔ زوائد کو اور وقت پر موقوف رکھا۔ اگر تمہاری خوشنودی اسی طرح کی نگارش پر منحصر ہے تو بھائی ساڑھے تین

سطریں ایسی بھی میں نے لکھ دیں ۔ کیا نماز قضا نہیں پڑھتے اور وہ مقبول نہیں ہوتی ؟"

ان اقتباسات سے اور کچھ نہیں تو یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ مرزا غالب نے یہ انداز تحریر حادثتاً نہیں بلکہ ارادتاً اختیار کیا تھا ۔ اور مزید یہ کہ وہ اس انداز تحریر پر فخر بھی کرتے تھے اور اسے اپنی ایجاد خاص قرار دیتے تھے اس کے علاوہ وہ مکتوب نگاری کے بارے میں مرزا مرحوم کا اپنا ایک خاص نقطۂ نظر ہے جس کی وضاحت پنج آہنگ میں بھی ملتی ہے ۔ یہاں صرف ضروری حصوں کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے :۔

"ادا شناس جانتے ہیں کہ میرے طریقہ تحریر میں یہ ہے کہ جب قلم اور کاغذ ہاتھ میں لیتا ہوں تو مکتوب الیہ کو اس لفظ کے ساتھ جو اس کی حالت کے موافق ہو ، صفحہ کے شروع میں پکارتا ہوں ۔ اور اس کے بعد مطلب لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔ القاب و آداب اور خیریت گوئی اور خیرو عافیت طلبی زائد و بیکار ہیں ۔ اور تجربہ‌کار زواید کی وقعت نہیں کرتے۔ اور عقلمند لوگ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اس معاملے میں کیا ساحری کی جا سکتی ہے ۔ اور اس طریقہ میں ادائے مطلب کی گنجائش کہاں تک ہے ؟۔

اے سخن شناس عقلمند جان کہ خط لکھنے والے کو چاہئے کہ تحریر کو تقریر سے دور نہ لے جائے اور تحریر میں تقریر کا رنگ پیدا کرے ۔ مطلب کو اس انداز سے ادا کرے کہ اس کے سمجھنے میں دشواری نہ ہو ۔ اگر چند مطلب رکھتا ہو تو تقدیم و تاخیر میں بڑی ہوشیاری سے کام لے اور اس سے بچے کہ الفاظ پچیدہ ہو جائیں اور مطلب کے اجزا ایک دوسرے سے مل جائیں ۔ اور رقیق استعارے اور مشکل ونامانوس لغات عبارت میں کبھی نہ لائے اور ہر تحریر میں مکتوب الیہ کا مرتبہ نظر میں رکھے ۔ اور جہاں تک ممکن ہو تحریر کو طول نہ دے ۔ ایک ہی لفظ کو بار بار لکھنے سے بچے اور زیادہ تر زمانے کے لوگوں کے مذاق کے موافق الفاظ لکھے ۔ اور جو قواعد قوانین کہ ایسے لوگوں نے بنا دئے ہوں ان سے باہر نہ جائے ۔ لیکن اسی کے ساتھ خوبیٔ زبان کو ہاتھ سے نہ جانے دے ۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مرزا مرحوم مکتوب نگاری کا ایک خاص نظریہ رکھتے تھے اور اسی کی پیروی انہوں نے اپنے اردو مکاتیب میں کی ہے ۔

اب صرف اتنی بات اور رہ جاتی ہے کہ مکاتیب کی زبان فارسی کی بجائے اردو اختیار کرنے کی وجہ کیا تھی ۔ مولانا حالی مرحوم اسے فارسی مکتوب نگاری اور اس کے سخت آداب سے بچنے کا بہانہ بتاتے ہیں ۔ اور فرماتے ہیں کہ مرزا مرحوم نے خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھنے کے زمانے میں عدیم الفرصتی کے باعث ایسا کیا ہے ۔ لیکن اتفاق سے یہ بات خارجی شواہد سے ثابت نہیں ہوتی ۔ مرزا مرحوم کے سپرد تاریخ نویسی کا کام جولائی ۱۸۵۰ء میں ہوا تھا جس کا ثبوت خود ان کے ایک مکتوب سے ملتا ہے ۔ چنانچہ ۲ جنوری ۱۸۵۱ء کو منشی نبی بخش حقیر کے نام لکھتے ہیں :-

”ہاں صاحب ! اب بابر بادشاہ کا حال تمام لکھ چکا ہوں ۔ اب مجھ کو یہ لکھ بھیجئے کہ وہ جو میں نے آپ کو بھیجا ہے وہ کہاں تک ہے ۔ خاتمہ کا فقرہ یا شعر جو کچھ ہو وہ لکھ کر بھیج دو تاکہ میں وہاں سے لکھ کر تم کو بھیج دوں ۔ اب چھ مہینے پورے ہو چکے ۔ جولائی سے دسمبر ۱۸۵۰ء تک ۔ اب میں دیکھوں یہ ششماہہ مجھے کب ملتا ہے اور اس کے ملنے کی اگر آئندہ ماہ بماہ کر دیں گے تو میں لکھوں گا ورنہ اس خدمت کو میرا سلام ہے ۔“

لیکن اردو میں لکھے ہوئے خطوط اس تاریخ سے بہت پہلے کے بھی ملتے ہیں ۔ چنانچہ انہی منشی نبی بخش حقیر کے نام اردو میں لکھا ہوا پہلا خط ۹ مارچ ۱۸۴۸ء کو تحریر کیا گیا ہے ۔ ظاہر ہے کہ اردو میں مکتوب نگاری کی وجہ تساہل پسندی کے علاوہ کچھ اور بھی ہے ۔ کہ مرزا مرحوم کو جو عبور اردو لکھنے پر تھا اس سے کم عبور فارسی لکھنے پر نہ تھا ۔ لہذا یہ بہانہ سرے سے کچھ اہمیت ہی نہیں رکھتا ۔ دراصل مکتوب نگاری کا زمانہ وہی ہے جب غالب شاعری میں طرز بیدل چھوڑ کر اپنا مخصوص آسان اسلوب اختیار کر چکے تھے ۔ چنانچہ اردو نثر میں بھی اس اسلوب کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے ۔ اس کے ساتھ ہی میرا خیال ہے کہ اس میں فورٹ ولیم کالج کی تحریک اردو نثرنگاری کو کافی دخل ہے ۔ غالب صاحبان عالیشان کی خوشنودی کو ہمیشہ نگاہ میں رکھتے تھے اور جب کلکتے کے سفر نے ان پر ان صاحبان کے نظریات و منشا واضح کئے ہوں گے تو انہوں نے اردو میں نثر لکھنے کو ترجیح دینی شروع کر دی ہوگی ۔ اس کے لئے راقم کو گو تاریخی شہادتیں میسر نہیں آسکیں لیکن ان خطوط پر کام کرنے کی ابھی بہت گنجائش ہے ۔

غالب کی شاعری میں مذہبی عقائد کی جھلکیاں

ڈاکٹر عبیداللہ خاں

غالب کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت جہاں غالب کے دوسرے افکار ہمارے سامنے آتے ہیں وہاں اُن کے مذہبی افکار اور عقائد کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے - یہ مذہبی افکار اردو شاعری میں کم لیکن فارسی شاعری میں زیادہ ہیں -

غالب جیسے رند ، بادہ پرست اور شاھد باز انسان کی شاعری میں مذہبی لگاؤ کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے - کہ جو شخص یہ کہتا سنائی دیتا ہو -

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر

اور جس شخص کا اوڑھنا بچھونا مے پرستی و بادہ خواری ہو ، جس کو اپنی رند مشربی اور آزاد خیالی پر فخر ہو۔ وہ کس طرح حمد ، نعت ، منقبت ، تصوف اور وحدۃالوجود جیسے مسائل پر قلم اُٹھا سکتا ہے - لیکن اگر ہم اُس ماحول کو پیش نظر رکھیں جس میں غالب کا شباب گذرا تھا اور بڑھاپا گذر رہا تھا ، جن لوگوں سے اُس کی راہ رسم تھی اور دلی کے جن علماء و فضلاء سے اُن کا ربط ضبط تھا ، ملک کے جن مذہبی لوگوں سے اُن کی عقیدتمندی تھی ، ملک کی جو مذہبی تحریکیں اُن کے سامنے تھیں تو ہمارے اس تعجب کا جواب ہمیں خود بخود مل جاتا ہے کہ غالب اپنی رند مشربی اور بادہ پرستی کے باوجود شعر میں کیوں مذہبی خیالات کا اظہار کرتے ہیں - مذہب سے غالب کے تعلق میں نہ اُن کی تربیت کو دخل ہے نہ خاندانی روایات کو ، بلکہ زندگی کے اس پہلو میں ، صرف اُن کا ماحول اور دلی کی معاشرت دخیل معلوم ہوتی ہے - لیکن اس مذہب پرستی میں بھی ، اُنھوں نے اپنے مزاج کے مطابق روایتی مذہب سے کنارہ کشی اختیار کرکے اپنے لئے ایک الگ راہ متعین کی ہے - یہ راہ انسان دوستی اور مخلوق خدا سے محبت کی راہ ہے - اُن کے نزدیک مختلف ادیان و ملل

مرکز (یعنی خدا تعالیٰ) تک پہنچنے کے جدا جدا راستے ہیں - لیکن ان سب کا اتصال جب ایک مرکز پر ہوتا ہے تو اختلاف کی بنیادیں خود بخود منہدم ہو کر مرکز سے جا ملتی ہیں اور دین اور ملتیں ھواللہ کے دامن میں سمٹ کر آ جاتی ہیں - غالب ایک ایسے موحد ہیں جو رسوم کے ترک کرنے اور ملتوں کو باطل اور محو کرنے میں ہی اپنے ایمان کی تکمیل سمجھتے ہیں اپنے اسی عقیدہ کی بنیاد پر کہتے ہیں -

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

آن کے موحد ہونے کا یہ انداز اس لئے ہے کہ وہ سارے مذاہب کا سر چشمہ اور مرکز صرف ایک ذات کو سمجھتے ہیں - آن کے نزدیک ہر مذہب کے ماننے والے چونکہ انسان ہیں - اور اس لحاظ سے ایک ہی برادری کے افراد ہیں - اس لئے ایک دینی مسلک پر چلنے والا دوسرے دین کے پیرو سے نفرت نہیں کر سکتا - غالب کے نزدیک محبت دین کی اساس ہے - لیکن حسن مسلک کی اساس توحید ہے- وہ غالب کے نزدیک سب سے زیادہ مضبوط اور مستحکم ہے- دین کی اپنی اس تعبیر کی روشنی میں وہ اپنے آپ کو موحد سمجھتے ہیں ، لیکن آن کے اس موحد ہونے میں رواج اور مذہبی پابندیوں کا کوئی دخل نہیں ایک خاص مذہب سے تعلق کے باوجود آن کے عقائد میں لچک ہے - اسی لچک نے یہ بات ممکن بنا دی ہے کہ آن کی انا بھی مجروح نہ ہونے پائے اور آن کی آزاد منشی بھی قائم رہے - اس لچک کا اظہار اس شعر میں ہوا ہے --

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

اس آزاد منشی اور مسلک کی انفرادیت کے باوجود غالب اپنے آپ کو آن مذہبی عناصر سے علیحدہ نہیں کر سکے جنہیں آن سے پہلے کے شعراء اور صوفیاء اپنا چکے تھے - یہی وجہ ہے کہ جب ہم آن کی اردو اور فارسی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو جا بجا تصوف کے مسائل کا ذکر ملتا ہے - لیکن ان مسائل سے آن کی وابستگی بھی صرف اس وجہ سے ہے کہ یہ مسائل آن کے مسلک سے قریب تر ہیں اور آن کے عقیدے کی تکمیل میں آن کے معاون بنتے ہیں - وہ وحدۃالوجود کے اس لئے قائل ہیں کہ انہیں خدا تعالیٰ کا جلوہ ہر چیز میں جاری و ساری نظر آتا ہے - اور وہ ایک ایسا وجود ہے جو تمام چیزوں پر

جلوہ فگن ہو رہا ہے ۔ چونکہ تمام مخلوقات اس کا پرتو اور عکس ہیں اس لئے وہ طرح طرح سے اپنے جلووں کی نمود کر رہا ہے ۔ اور مختلف شکلوں میں رونما ہو رہا ہے ۔ اور غالب میں چونکہ معرفت حق کا جوہر موجود ہے اس لئے وہ ذات باری تعالیٰ کے جلوؤں کو ہر رنگ میں پہچان لیتا ہے اور کہتا ہوا سنائی دیتا ہے کہ ؎

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

فارسی میں یہ بات اور زیادہ واضح انداز میں بیان ہوئی ہے ؎

مقصود ما ز دہر و حرم جز حبیب نیست
ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد

غالب کو دیر و حرم سے غرض نہیں ۔ دوست کا وصال اور اس کی پرستش ان کا مقصود ہے ۔ جہاں اس کے نقوش نظر آتے ہیں وہ وہاں اپنی جبین کو خم کر کے ناصیہ فرسائی شروع کر دیتے ہیں ۔ تلاش حبیب انہیں دیر و حرم کی تفریق کی مہلت ہی نہیں دیتی ۔ ان کا مسلک محبت اس تفریق کی اجازت ہی نہیں دیتا لیکن اس مسلک کو سمجھنا اور اپنانا ہر آدمی کے بس کی بات نہیں ۔ غالب کے نزدیک اس نکتہ کو وہی سمجھ سکتا ہے جس نے غالب کی طرح حبیب کے لئے سب کچھ قربان کر دیا ہو اور اس کا مقصد حیات جلوۂ حبیب بن کر رہ گیا ہو، جو کائنات کے ذرہ ذرہ میں رقصاں و جنباں نظر آتا ہو ۔ اپنے اس نظریہ کو وہ شعر میں یوں پیش کرتے ہیں ۔

چشم و دل باختہ ام ، داد ہنر خواہد داد
آنکہ چوں من ہمہ دان و ہمہ بین تو شود

اپنے مسلک کو اور زیادہ واضح کرنے اور لوگوں کو غلط فہمی کا شکار ہونے سے بچانے کے لئے وہ کہتے ہیں کہ میرا تعلق دنیا کی چیزوں سے صرف اس لئے ہے کہ ان میں جلوۂ دوست ضیا پاشیاں کرتا دکھائی دیتا ہے ۔ سورج اور چاند سے مجھے اس لئے لگاؤ ہے کہ اس میں عکس خداولدی نظر آتا ہے ۔

ہم بہ سودائے تو خورشید پرستم آرے
دل ز مجنوں برد آہو کہ بہ لیلیٰ ماند

اگر میں سورج کی پوجا کرتا ہوں تو وہ صرف اس لئے ہے کہ وہ جلوۂ خداوندی کا پرتو ہے -

غالب اپنے اس مسلک اور عقیدۂ احدیت ذات پر ہر چیز کی قربانی کرنے کو تیار ہیں - حتیٰ کہ دنیا کی ہر چیز اُن کی نظر میں ہیچ بن کر رہ جاتی ہے - اور وہ کہتے ہیں ؎

رفت و باز آمد ہما در دام ما باز سردادیم و عنقا خواستیم

ہما یعنی دولت دنیا ہمارے ہاتھوں سے نکلنے کے بعد پھر ہمارے پاس آ گئی لیکن ہم نے اُس کی ذرا بھی پروا نہ کی بلکہ اُسے چھوڑ کر عنقا یعنی احدیت ذات کو پانے کی کوشش میں لگے رہے - اور اپنے اس مسلک کی تکمیل اور عقیدہ کی تلقین کے لئے ایک قدم اور آگے بڑھے اور کہا کہ ؎

تا چند ناز مسجد و بتخانہ کھینچئے چوں شمع دل بخلوت جانانہ کھینچئے

دیر و حرم کی ناز برداری اور پابندی کی بجائے یہ زیادہ بہتر ہے کہ علیحدہ ایک گوشہ میں بیٹھ کر محبوب سے ہمکلام ہوا جائے - مسجد و بت خانہ کا پابند رہ کر یقیناً وہ مسائل پیدا ہوں گے جو ان کے راستہ میں حائل ہو کر انہیں محبوب سے دور رکھیں گے اور مقصد کی تکمیل میں خلل انداز ہوں گے -

غالب نے وحدۃالوجود کے مسلک کو ایسی مضبوطی سے اپنا عقیدہ بنایا ہے کہ وہ دنیاوی چیزوں کو دیکھ کر جھنجھلا اٹھتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ جب وجود ایک ہے اور اُس وجود کے جلوے ساری کائنات کو اپنی ضیا پاشیوں سے منور کر رہے ہیں تو پھر کائنات کی یہ چیزیں انسانوں کو اپنی طرف کھینچ کر دعوت نظارہ کیوں دیتی ہیں اور زندگی میں ہنگامہ آرائی کا سبب کیوں بنتی ہیں - ان کی اس دلفریبی کا اثر ہے کہ انسان سکون قلب کے ساتھ ذات باری کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا - اپنی اس جھنجھلاہٹ اور بے چینی کا اظہار غالب نے اس طرح کیا ہے ؎

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکن زلف عنبریں کیوں ہے نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے
لالہ و گل کہاں سے آئے ہیں ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

اُن کی اس جھنجھلاہٹ اور بے چینی نے شکوہ کی صورت اختیار کر لی ہے کیونکہ وہ اپنے مسلک کی راہ میں ان چیزوں کو رکاوٹ سمجھ کر اُن سے چھٹکارا حاصل کرنے کی سعی کر رہے ہیں۔ عقیدہ کی اس پختگی نے انہیں دوزخ کے عذاب اور جنت کی لذات کی حرص سے آزاد کر کے حضرت رابعہؒ بصری کا ہم نوا بنا دیا ہے۔ وہ ذات باری کو اس لئے احد نہیں مانتے کہ اس کی وجہ سے انہیں شرک سے دور رہ کر دوزخ سے نجات ملے گی اور جنت پانے کا شرف حاصل ہوگا۔ بلکہ اس لئے کہ انہیں جو ذات محبوب ہے وہ اس میں کسی کو شریک نہیں دیکھ سکتے۔ اس لئے وہ خوف و طمع کی اس منزل سے بالاتر ہو کر بڑی جرأت سے یہ نعرہ لگاتے ہیں۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

اور جب وہ اس عقیدہ کو دل میں پوری قوت اور دیانتداری کے ساتھ جگہ دیتے ہیں تو جنت کی کوئی قدر و قیمت اور وقعت اُن کے نزدیک باقی نہیں رہتی۔ بلکہ وہ اسے اپنے طاق نسیاں کا ایک حقیر سا گلدستہ تصور کرنے لگتے ہیں۔

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بےخودوں کے طاق نسیاں کا

وہ اس عقیدہ کے ذریعہ اپنے لئے وہ ماحول پیدا کر لیتے ہیں جہاں انسان فنا فی اللہ کی منزل میں گامزن نظر آنے لگتا ہے اور زبان حال سے کہنے لگتا ہے کہ ؎

دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

اور اس فنا فی اللہ کے مقام کو وہ اپنے لئے راحت کا سامان سمجھتے ہیں کیونکہ جزو کا کل میں مل جانا سکون کی علامت ہوتا ہے۔ یہ کل ایک ایسی ذات ہے جو غیر مرئی ہے اُس کا وجود مجسم شکل میں نظر نہیں آتا۔ کسی چیز کے نظر آنے کے لئے ابعاد ثلاثہ کی قید ضروری ہے۔ لیکن ذات باری زمان و مکان اور اشارات کی قید سے آزاد ہے۔ اسی وصف نے اسے وحدت اور ابدیت بخشی ہے اور ''لیس کمثلہ شیئی'' کا مصداق بنایا ہے۔ اگر اُس جیسا کوئی اور وجود ہوتا تو کارخانۂ کائنات تباہ ہو کر رہ جاتا۔ ''لوکان فیھما الھۃ الا اللہ لفسدتا'' (اگر اس جیسی کئی ذاتیں ہوتیں تو کارخانۂ عالم تباہی کی نظر ہو جاتا) اس لئے یہ بات ہی اُس کے یکتا اور واحد ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

اس شعر میں غالب نے قرآن کریم کی محولہ بالا آیت کی روشنی میں اپنے فلسفۂ وحدۃالوجود کو بڑے منطقیانہ انداز میں پیش کر کے دعوت فکر و نظر دی ہے - غالب کے نزدیک ذات باری کی یکتائی اور احدیت اپنی تجلیات کو کائنات پر جس طرح منعکس کر رہی ہے - اُس سے یہ عالم تاریکی کے پردوں سے باہر آکر ایک عارضی اور فانی سی شکل میں نظر آ رہا ہے گویا ذات باری کی جلوہ گری اس کائنات کے عدم سے وجود میں آنے کا سبب بن رہی ہے -

ہے تجلی تری سامان وجود ذرہ بے پرتو خورشید نہیں

اگرچہ اُس ذات کے جلوے دوسروں کو منور کر رہے ہیں لیکن اُسے انسان کی آنکھ دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتی- موسیٰ علیہ السلام جیسے برگزیدہ نبی کے لئے بھی اُس کا نظارہ برق بن کر اس طرح گرتا ہے کہ انہیں بے ہوش کر دیتا ہے اور قوت دید سلب ہو کر رہ جاتی ہے - اُس ذات کی یہ صفت بھی اُس کی احدیت کی دلیل ہے کہ سب پر حاوی و غالب ہے اور اُس کے سامنے کوئی چیز نہیں ٹھہر سکتی -

ناکامیٔ نگاہ ہے برق نظارہ سوز تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

اور اسی بات کو غالب نے دوسرے شعر میں اس طرح ادا کیا ہے -

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

وہ ذات ایسی برق نظارہ سوز ہے جس کے پرتو شمس و قمر ہیں - جب سورج کی تپش اور تمازت کے سامنے انسان کی نگاہیں خیرہ ہو کر رہ جاتی ہیں تو اُس کے جلووں کے سامنے کس طرح ٹھہر سکتی ہیں - اس کلیہ پر اعتراض ہو سکتا تھا کہ جب ذات باری کے جلووُں سے انسان پوری طرح فیض حاصل نہیں کر سکتا تو اسے پرتو بنانے اور اس کی تخلیق میں کیا حکمت پوشیدہ تھی اس کا جواب غالب نے اس طرح دیا ہے

دھر جزو جلوۂ یکتائی معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

گویا اس کائنات کی تخلیق اس وجود واحد کی خود بینی کا ایک ذریعہ ہے اگر اسے اس یکتائی کو دیکھنا مقصود نہ ہوتا تو اس کائنات کو پیدا ہی نہ کیا جاتا گویا یہ دنیا اس ذات کے لئے ایک آئینہ کی مانند ہے جس میں وہ اپنی احدیت کا جمال دیکھنا چاہتی ہے - دوسری طرف جب ایک عارف دنیا کی چیزوں پر نظر ڈالتا ہے تو اسے یہ تمام کائنات وجود واحد کا پرتو نظر آتی ہے اور اس کائنات کا شیرازہ اس ذات واحد کی بدولت بندھا ہوا دکھائی دیتا ہے - کائنات کی چیزوں میں غیریت نہیں دکھائی دیتی اس لئے یہ عارف ان چیزوں میں اپنی ذات کو شامل کر کے نغمۂ اناالحق گانے لگتا ہے - غالب اپنے اس نظریہ کو اس طرح پیش کرتے ہیں -

از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

لیکن غالب نغمۂ انا الحق کے گانے میں بھی ایک وقار قائم رکھنا چاہتے ہیں - وہ برملا اناالحق کا نعرہ لگانا عالی ظرفی کے خلاف سمجھتے ہیں- اس لئے وہ اپنے مسلک کو ایسے دھیمے انداز میں پیش کرنا چاہتے ہیں کہ ان کے دل کی تسکین بھی ہو جائے اور دوسروں کو انگشت نمائی کا موقع بھی نہ ملے -

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن ہم کو تقلید تنک ظرفیٔ منصور نہیں

غالب اپنی اس آزاد منشی ، عقیدہ کی تعین اور مذہبی اعمال کی قیود سے آزادی کے باوجود توحید باری تعالیٰ ، میں یقین رکھتے ہیں اور حضور اکرمؐ اور اہل بیت کی محبت کو وسیلۂ نجات سمجھتے ہیں - اپنے ان عقائد کو انہوں نے فارسی کے قصائد اور مثنویوں میں کچھ اس طرح پیش کیا ہے کہ غالب کا کردار ایک کٹر مسلمان کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتا ہے - کلیات فارسی کے پہلے قصیدہ کا آغاز ہی اس طرح ہوتا ہے -

اے ز وہم غیر غوغا در جہاں انداختہ گفتہ خود حرفے و خود را در گماں انداختہ
نقش بر خاتم ز حرف بے‌صدا انگیختہ شور در عالم ز حسن بے نشاں انداختہ
عاشقاں در موقف دار و رسن وا داشتہ غازیاں در معرض تیغ و سناں انداختہ
دے بہ‌رستاخیز دار و مار قوم ناسپاس جان اژدر در تن چوب شباں انداختہ

اسی طرح مثنوی "ابر گہر بار" میں حمد و ثنا کو ایسے انداز سے پیش کیا ہے کہ یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ ایک کٹر مسلمان پورے عجز و انکسار

کے ساتھ خدا تعالیٰ کے سامنے سر بسجود ہوکر اپنی تقصیرات کا اعتراف کر کے مغفرت کا طالب ہے ۔ وہ مثنوی کی ابتدا شکر کے ساتھ کر کے عفو کے امید وار بننا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں ۔

سپاسے کزو نامہ نامی شود — سخن در گذارش گرامی شود
سپاسے کہ قالب ازو کام یافت — روان ہا بدان رامش آرام یافت
سپاسے دوئی سوز، کثرت ربا — سپاسے دل افروز بینش فزا
مناجاتیان پیش دے در نماز — خراباتیان را بد و چشم باز
اگر کافرانند ز نهاریش — دگر مومنان در پرستاریش
ہوالحق سرایان او غیب جو — اناالحق نوایان او تلخ گو
خدایا زبانے کہ بخشیدۂ — بہ نیروئے جانے کہ بخشیدۂ
دمادم بہ جنبش گر آید همی — ز راز تو حرفے سراید همی
بہ روزے کہ مردم شوند انجمن — شود تازہ پیوند جاں ہا بہ تن
رواں را بہ نیکی نوازندگاں — بہ سرمایۂ خویش نازندگاں
گہر ہائے شہوار پیش آورند — فروہیدہ کردار پیش آورند
بہ بخشائے ہرنا کسی ہائے من — تہی دست و در ماندہ امروائے من
بدوش ترازو منہ بار من — نہ سنجیدہ بگذار کردار من
بہ بند امید استواری فرست — بہ غالب خط رستگاری فرست

غالب تمام منازل شکوہ و شکایت سے گذر کر خدا تعالیٰ سے یہی کہتے دکھائی دیتے ہیں کہ میں جو کچھ ہوں جیسا ہوں ۔ تیری نظر کرم کا امیدوار ضرور ہوں اس لئے تو میری نجات کا پروانہ جاری کر ہی دے ۔

حمد کے ساتھ ساتھ غالب نے جا بجا نعت پر قلم اٹھایا ہے اور عشق رسولؐ میں ڈوب کر ذکر رسول سے اپنے کلام کو آب و تاب بخشی ہے ۔ آنحضرتؐ سے اُن کی محبت و عقیدت کا اظہار اردو اور فارسی کی شاعری میں نئے نئے انداز سے ملتا ہے ۔ ایک جگہ حضورؐ کی ذات بابرکات کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں ۔

فخر بشر، امام رسل، قبلہ امم — کز شرع اوست قاعدۂ دانش استوار
تقدیر از وجود تو شیرازہ بستہ است — مجموعۂ مکارم اخلاق کردگار

دوسرے شعر میں شاعر نے قرآن کریم کی اس آیت "انک لعلی خلق عظیم" اور

حدیث نبوی "بعثت لا تمم مکارم الاخلاق" کی طرف اشارہ کیا ھے - پھر اپنی محبت اور عشق کی اُن چنگاریوں کا ذکر جو سینہ میں بھڑک رہی ھیں اور در حضور پر حاضری کی جو خواھش سینہ کے اندر کروٹ لے رھی ہے ، اُسے یوں بیان کیا گیا ھے :-

ایا بود کہ از اثر اتفاق بخت دیوانہ را بہ وادیٔ یثرب فتد گذار
سایم بر آستان رسول کریم سر جاں را بہ فرق مرقد پاکش کنم نثار

وہ آنحضرتؐ کی عظمت اور اولیت کے دل سے قائل ھیں - اسی لئے ایک جگہ کہتے ھیں کہ موسیٰ علیہ السلام میں اور اُن میں یہ فرق ہے کہ موسیٰ علیہ السلام رب ارنی کا ورد کر کے دیدار خدا کی تمنا کرتے ھیں اور آپ کو اللہ تعالیٰ خود اپنے دیدار ملاقات کے لئے اپنے پاس آنے کی دعوت دیتا ھے :-

ترا خواستگارست یزداں پاک ھر آئینہ از لن ترانی چہ باک
توئی کانچہ موسیٰ باو گفتہ است خداوند یکتا بتو گفتہ است
توی آنکہ تا مہ ترا خواندہ اند دریں رہ گزر گرد بنشاندہ اند

غالب نے جہاں واقعہ معراج کا ذکر کیا ھے ، اس سے بھی اُن کے اس عقیدہ کا اظہار ھوتا ہے کہ وہ صرف روحانی معراج ھی کے قائل نہیں ھیں بلکہ روحانی اور جسمانی دونوں حیثیتوں کے قائل ھیں - وہ حضورؐ کو مختلف افلاک سے گذار کر ایسے مقام پر پہنچا دیتے ھیں جہاں زمان و مکان کی قید باقی نہیں رھتی - اس لئے کہتے ھیں -

ز گفتن شنیدن جدائی نداشت نمودن زدیدن جدائی نداشت

غالب نے حضورؐ کے انسان کامل ھونے کے تصور کو مختلف انداز سے پیش کیا ہے ایک جگہ کہتے ھیں کہ تجلی کو اپنا نور دکھانے کے لئے آپ کے جسم مبارک کا انتظار تھا کہ ایسی پیاری اور پر وقار شکل ملے تو اُس میں وہ ظاھر ھو - چنانچہ جب آپ کا قد و رخ اُسے مل گیا تو اُس نے اپنا ظہور کر دیا -

منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

غالب کو آپ کی ذات سے ایسا لگاؤ ھے کہ آپ کا نام لے کر اُسے سکون اور راحت نصیب ھوتی ھے اور ایسا کیوں نہ ھو جب کہ ساری کائنات آپ کے

صدقہ میں پیدا کی گئی ہے - اور کائنات کی یہ شکل اور شیرازہ بندی آپ ہی کے وجود کی مرھون منت ہے -

اے خاک درت قبلۂ جان و دل غالب   کز فیض تو پیرایۂ هستی است جهان را
تا نام تو شیرینیٔ جان داده بگفتن   در خورش فرو برده دل از مهر زبان را

غالب نے اپنی اس عقیدت کا اظہار ایک غزل میں کیا ہے - جو نعت کا رنگ لئے ہوئے ہے - اس غزل کو انہوں نے خون جگر سے تحریر کیا ہے اسی لئے اسے اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ ہر خاص و عام کی ورد زبان بن گئی ہے :-

حق جلوہ گر ز طرز بیان محمد است   آرے کلام حق بہ زبان محمد است
آئینہ دار پرتو مہر است ماھتاب   شان حق آشکار ز شان محمد است
دانی اگر بہ معنی لولاک وا رسی   خود ہر چہ از حق است ازآن محمد است
واعظ حدیث سایۂ طوبیٰ فرو گذار   کاینجا سخن ز سرو روان محمد است

غالب ثنائی خواجہ بہ یزداں گذاشتیم
کاں ذات پاک مرتبہ دان محمد است

غالب اپنی اس عقیدت میں اپنے عجز کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ کی جس طرح ثنا خوانی کرنی چاہئے تھی ان سے اس کا حق ادا نہیں ہو سکا - اس لئے کہ آپ کے مقام کا پہچاننا آسان کام نہیں - انسانی عقل اس کے پہچاننے سے قاصر ہے - خدا تعالیٰ ہی اپنے محبوب کے مقام اور مرتبہ کو پہچان سکتے ہیں - اس لئے غالب یہ فریضہ بطریق احسن ادا کرنے کے لئے خدا تعالیٰ پر چھوڑ دیتے ہیں - لیکن چونکہ آپ عاشق رسول ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اس لئے ثنا خوانی میں کوتاہی کے باوجود وہ خواجہ یثرب سے شفاعت کی توقع رکھتے ہیں اور اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ چونکہ انہوں نے حضور اقدس کا دامن تھام لیا ہے اس لئے ان کے کسی کام میں کوئی رکاوٹ واقع نہیں ہوگی اور ہر کام آسانی سے انجام پذیر ہو گا -

اس کی امت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالب گنبد بے در کھلا

غالب کو حضورؐ سے جو تعلق خاطر ہے اس کی وجہ سے وہ آپ کی قدمبوسی اور محبت کو اپنے لئے نجات کا باعث سمجھتے ہیں لیکن جب اپنی

حالت‌زار پر نگاہ ڈالتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ حضور کی نظر خاص اُن پر نہیں پڑ رہی - چنانچہ وہ خدمت اقدس میں عرض کرتے سنائی دیتے ہیں :-

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے لعل و زمرد ، زر و گوہر نہیں ہوں میں
رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ رتبہ میں مہروماہ سے کمتر نہیں ہوں میں
کرتے ہو مجھ کو منع قدمبوس کس لئے کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

غالب کو جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم سے عشق ہے اسی طرح وہ حضرت علی علیہ السلام کے عشق میں غرق نظر آتے ہیں بلکہ اُن کا یہ عشق جنون کی حد تک پہنچ گیا ہے - اپنی اس کیفیت کا خود اس طرح اظہار کرتے ہیں -

عاشقم لیکن ندانی کز خرد بیگانہ ام ہوشیارم با خداؤ با علی دیوانہ ام

اُن کے اس عشق و محبت اور جنون نے اُنہیں حضرت علی علیہ السلام کا اس طرح گرویدہ بنا دیا ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ نبی ؐ کی نبوت اور خدا تعالیٰ کی توحید کو اُنہوں نے ان کے پیمان اور ایمان کے ذریعہ سے پہچانا ہے -

نبی را پزیرم بہ پیمان او خدا را پرستم بہ ایمان او

اور جذبۂ عشق سے سرشار ہو کر کہتے ہیں کہ میں حضرت علی علیہ السلام کو خدا تو نہیں کہہ سکتا لیکن اُنہیں اپنا آقا تو کہہ کر دل کو سکون پہنچا سکتا ہوں -

خدائش روا نیست ہر چند گفت علی را توانم خداوند گفت

اُن کی محبت کی یہ انتہا ہے کہ مرنے کے بعد بھی حضرت علی کی قربت چاہتے ہیں اور اس لئے یہ خواہش کرتے ہیں کہ اُنہیں سر زمین نجف میں دوگز زمین مل جائے تو یہ اُن کی سب سے زیادہ خوش قسمتی ہوگی -

کہ دل خستۂ دہلوی مسکنے ز خاک نجف باشدش مدفنے

جب سے غالب میں شعور پیدا ہوا ہے اُنہوں نے حضرت علی سے اس طرح لو لگائی ہے کہ ساری جوانی کو اُن کے خیال میں بسر کر دیا ہے -

جوانی بریں در بسر کردہ ام شبے در خیالش سحر کردہ ام

غالب کے لئے حضرت علی ؑ خدا تعالیٰ تک پہنچنے کا ایک وسیلہ ہیں - اور

اُن کا نام لئے بغیر غالب کو ایک لمحہ چین نصیب نہیں ہوتا ۔

نیا ساید اندیشہ جز با علی   ز اسما نیندیشم الا علی

اور اسی بات کو دوسری جگہ اس طرح کہتے ہیں

نیست ز اسمائے الٰہی بر زبانم جز علی   بیخودم پاس محبت برنتابم پیش ازیں

اور اسی عقیدت کو ایک جگہ کتنے حسین پیرایہ میں تشبیہ کا لباس پہنا کر پیش کیا ہے ۔

چوں برگ گل زباد سحرگاہم زباں   رقصد بنام حیدر کرار در دہن

پھر اپنی اس محبت اور عقیدت کی بڑی اچھی توجیہہ پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میری یہ عقیدت ، عبادت خداوندی کا ایک ذریعہ ہے ۔ حضرت علی سے لو لگانے کو میں عبادت خداوندی تصور کرتا ہوں ۔ اس لئے اُن کی بندگی میں غرق رہتا ہوں۔ کوئی میری اس بندگی کو غلط معنی نہ پہنانے لگے ۔

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست   مشغول حق ہوں بندگیٔ بوتراب میں

پھر یہ جو غلاف کعبہ خوشبوؤں میں بسا ہوا ہے ۔ وہ اس لئے نہیں کہ وہ کسی ناف غزال کی وجہ سے معطر ہو رہا ہے بلکہ اس لئے کہ حضرت علی کی ولادت نے مشک آگیں بنا دیا ہے اور اُس میں یہ مہک اُن کے دم قدم کی برکت سے ہے ۔

مشکیں لباس کعبہ علی کے قدم سے جان   ناف زمین ہے نہ کہ ناف غزال ہے

غالب کے چاروں طرف دنیاوی تکالیف کے ہجوم نے گھیرا ڈال رکھا ہے ۔ لیکن وہ ان تمام مصائب اور تکالیف کا خندہ پیشانی سے اس لئے مقابلہ کر رہے ہیں کہ اُنہوں نے اپنا ہاتھ اک ایسی ہستی کے ہاتھ میں تھما دیا ہے جو ساقی کوثر ہیں اس لئے اُن کی غلامی میں شمولیت کی وجہ سے جو شراب طہور پینے کو ملے گی اُس سے سب غم دور ہو جائیں گے ۔

بہت سہی غم گیتی شراب کم کیا ہے   غلام ساقیٔ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

وہ اپنی اس عقیدت اور جذبہ کو دین کی حیثیت دیتے ہیں اُن کا یہ جذبہ کسی دنیاوی لالچ کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس میں محض اُن کا جنون اور

عشق کارفرما ہے۔

ہزار آفریں برمن و دین من   کہ منعم پرستیست آئین من
چراغ کہ روشن کند خانہ ام   تو گوئی منش لیز پروانہ ام

غالب کا یہ جذبۂ عشق جب اور شدت اختیار کرتا ہے تو وہ "یا علی" کو اسم اعظم کا درجہ دینے لگتے ہیں اور یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اُن کا وظیفہ، علی ابن ابی طالب ہے اور اسی سے اُن کی زندگی کا چراغ روشن ہے۔

ورد من بود غالب یا علی بو طالب   نیست بخل با طالب اسم اعظم از من پرس

اور جب وہ ایک قدم اور بڑھ کر فنا فی الامام کے مقام پر پہنچتے ہیں تو وہ اپنے آپ کو اسداللہی کہنے لگتے ہیں۔ اور یوں اپنے آپ کو مذہب کی قیود سے آزاد کر لیتے ہیں۔

غالب نام آورم نام و نشانم مپرس   هم اسداللهیم هم اسداللهیم

حمد، نعت اور منقبت کے علاوہ غالب نے دوسرے اماموں کی منقبت کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اور تمام اماموں کو خراج عقیدت پیش کیا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ اولیاء اللہ سے بھی اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ اور بعض ایسے نازک اور مختلف فیہ مسائل کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دی ہے جو آگے چل کر امت کے مختلف فرقوں میں نزاع کا باعث بنے رہے ہیں اور جن کا آج تک فیصلہ نہیں ہو سکا۔ لیکن مولانا فضل حق کے سمجھانے سے اپنے بعض عقائد میں اصلاح بھی کی ہے۔

غالب کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد ہمارے سامنے اُن کے جو مذہبی عقائد اُبھر کر آتے ہیں اُن میں ایک تضاد ضرور پایا جاتا ہے اور اس کی وجہ میرے نزدیک غالب کے مزاج میں جذباتی شدت کا وجود ہے۔ جذبات جب شدت اختیار کرتے ہیں تو وہ منطق کے پابند نہیں رہتے۔

غالب جدید تنقید کی نظر میں

صدیق کلیم

ایک شاعر کا استحسان دو عوامل پر منحصر ہے ۔ ایک تو اس کا کلام اور اس کے متعلق علمی تحقیق اور دوسرے اس عہد کا ادبی مذاق جس میں کہ اس شاعری کا تجزیہ کیا جا رہا ہے ۔ غالب کا شاعرانہ مقام ایک عرصے سے متعین ہو چکا ہے لیکن ہمارے لئے اہم تنقیدی سوال یہ ہے کہ آج غالب کا کلام ہمیں کس نوعیت کا تجربہ پیش کرتا ہے ۔ اس لحاظ سے مرے نزدیک غالب کی ہم عصریت مسلم ہے ۔

جدید ادبی تنقید نے بعض شاعرانہ صفات ۔۔ ابہام ۔ ذو معنویت اور طنز ۔۔ کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے ۔ ان صنائع کا رمزیہ تصاویر سے گہرا تعلق ہے کہ یہی ایک نظم کی ساخت کو بروئے کار لاتی ہیں بلکہ ایک ہی نظم کے مختلف پہلوؤں کو بھی عضوی وحدت میں سموتی ہیں ۔ یہ طریقۂ شعرگوئی نہ صرف ظاہر و باطن کے فرق کو سامنے لاتا ہے بلکہ تجربے کی مختلف سطحوں کو بھی ۔ اور خود شعری تجربے کے وزن اور گمبھیرتا کا بھی ۔ اردو شاعری کی اس روایت (جو اس حالت میں موجود نہیں تھی جو اس بیان سے ظاہر ہوتی ہے) سے غالب نے مکمل طور پر استفادہ کیا ہے بلکہ اپنی تخلیقی صلاحیت کے سبب اسے روایت کا درجہ دیا ہے ۔ اپنے شعری تجربے میں غالب نے اکثر دو متضاد حقیقتوں کا ہی نہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کے مختلف اور متضاد پہلوؤں کو آپس میں مدغم کیا ہے وہ اکثر رمزیہ تصاویر کا وظائفی استعمال کرتا ہے نہ کہ تزئینی ۔ اور اکثر اس کے معانی تک رسائی اسی راستے سے ہوتی ہے اور اسی طرح ہم اس کے تجربے کے سانچوں کا علمی تجزیہ کر سکتے ہیں اور اس کا فکری نظام تشکیل کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں ۔ بعض نقادوں نے غالب کا انگریزی شاعر ڈن (Donne) سے موازنہ کیا ہے اور ان کی شعری تکنیک کسی حد تک ایک ہی طرح کی ہے ۔ اگر ہم اس کی رمزیہ تصاویر کا اس جدید طرز

تنقید کی روشنی میں تجزیہ کریں تو شاید ہم غالب کی شاعری پر مزید روشنی ڈال سکیں ۔

غالب کی رمزیہ تصاویر کا اس کی زبان اور بحروں سے گہرا تعلق ہے ۔ غالب نے بالعموم مشکل انداز میں بات کی ہے ۔ اس کے جملوں کے ٹکڑے اور ترکیبیں فارسی میں ہیں ۔ لیکن اپنے فکری سانچوں اور ان کے متعلقات کی ادائیگی کے لئے شاید یہ اسلوب ہی موزوں تھا ۔ غالب نے دراصل دو قسم کے اسلوب میں لکھا ہے ۔ ایک تو سراسر مفرس اور دوسرے اردو ۔ نہ کہ مشکل اور سادہ زبان میں ۔ شروع کے دور میں مشکل زبان شعر پر حاوی ہے اور آخری دور میں سادگیٔ اظہار ۔ مگر غالب کے کلام کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے شروع میں مفرس اردو استعمال کی ہے اور بعد میں فقط اردو (جو فارسی کی گہری چھاپ کے باوجود فارسی معلوم نہیں ہوتی) سادہ اسلوب یا سہل ممتنع تیسرا اسلوب قرار دیا جا سکتا ہے جہاں ابہام یکسر غائب ہے ۔ دوسرے اسلوب میں ابہام تکنیک کی خوبی ہے مگر پہلے یعنی فارسی زدہ اسلوب میں ابہام ایک رکاوٹ معلوم ہوتی ہے ۔ مزید یہ کہ اس نے بعض جگہ ہلکا پھلکا طنزیہ انداز بھی اختیار کیا ہے جو اس کی طبیعت کی رنگینی اور مزاح کے سبب دل میں سمو جاتا ہے اور اس بات کا غماز ہے کہ حساس طبیعت ابتلا کو کس طرح برداشت کرتی ہے ۔۔

ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

مرزا کے اس کلام میں جو بیدلانہ طرز میں نہیں بلکہ ان کے اپنے مخصوص اردو اسلوب میں ہے کئی عوامل شعری یک جا جمع ہو گئے ہیں ۔ ان اشعار میں جذبات کی گہرائی اور شدت ہے ۔ خیالات کی وسعت اور بلندی ہے ۔ وہ محبت اور روزمرہ زندگی کے تجربات سے متاثر ہوکر اور حقائق کو پہچان کر حقیقت کے دل تک اتر جاتے ہیں ۔ تخیل کی پرواز اور ذہن کی رسائی سے ان میں چھپے ہوئے رشتے اور معانی ڈھونڈتے ہیں ۔ زبان کے تمام پہلوؤں پر انہیں کامل قدرت حاصل ہے ۔ تشبیہ و استعارہ کو معانی میں سمو دیتے ہیں ۔ غیر ضروری صنعت کاری سے پرہیز کرتے ہیں ۔ وہ اکثر ایسے الفاظ اور اس قسم کی رمزیت استعمال کرتے ہیں جس کے ساتھ تاریخی اور ثقافتی روایات وابستہ ہیں ۔ جو ان کے تجربات کو عمومیت اور گمبھیرتا بخشتی ہیں ۔

شوق ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا
بوئے گل ، نالۂ دل ، دود چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

مرزا اپنے کرب کو نظم و ضبط کے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں اور اس کے باوصف ان کے اشعار میں ایک طرح کی شان و شوکت پیدا ہو گئی ہے ۔ ان کے مصرعوں کے بحور بارہا درباری راگ کا ترنم پیدا کرتے ہیں ۔ ان میں مغلیہ ثقافت کی وہ گمبھیرتا وہ وقار پیدا ہوتا ہے کہ ان کا دکھ ، ان کی ابتلا گراں نہیں گذرتی بلکہ نئے معانی اختیار کر لیتی ہے :۔

سادگی و پر کاری ، بیخودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرات آزما پایا
غنچہ پھر لگا کھلنے ، آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا ، گم کیا ہوا پایا

یہاں بات میں الجھاؤ معلوم نہیں ہوتا اگرچہ یہ اشعار ان تمام تکنیکی صفات سے متصف ہیں جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے ۔ یہ سہل ممتنع کے قریب ہے ۔ یہ اپنے اندر کئی کروٹیں اور آہٹیں لیئے ہے ۔ اس طرز میں وہ بعض مواقع پر بات کو نہایت نزاکت سے کہہ جاتے ہیں کہ سامع یا تو چونک اٹھتا ہے یا اسے سوچنا پڑتا ہے ۔

ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

بعض دفعہ وہ ایک طنزیہ انداز میں یا ظرافت کے پہلو میں یا تبسم پنہاں کے ساتھ حرف مطلب بیان کرتے ہیں ۔ یہ تبسم زیر لب کی کیفیت نہایت خوش گوار اثر پیدا کرتی ہے ۔ نہایت دکھ بھری بات کو وہ ہلکی شوخ لے میں کہہ جاتے ہیں :۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
سر گشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

یا

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

علاوہ ازیں ان میں رندی و سرشاری کا بھی ایک پہلو تھا جو ان کی شوخی اور نازک بیانی سے مل کر انہیں زندگی کے مصائب کا مقابلہ کرنے کی ہمت دیتا تھا - یہاں ان کی رند مشربی اور روایتی اخلاق سے انحراف انہیں زندگی سے یک گونہ لطف حاصل کرنے میں مدد دیتا ہے --

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

یا

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہؤا تھا

غالب کے اسالیب کا یہ ارتقا اس سبب ہے کہ وہ ایک منزل پر پہنچ کر اپنے آپ کو فارسی شعر کی دنیا سے منقطع کر لیتا ہے - اور اس کی طرف متشکک انداز اختیار کرتا ہے - پہلا دقیق اسلوب ایک ایسے ذہن کی پیداوار ہے جو ایک ثقافت کی عظمت اور گمبھیرتا کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے - یہ مغلیہ ثقافت کی عظمت کی نشان دہی ہے کہ وہ فارسی شعر کو عظیم ادبی قدر سمجھتا ہے اور اپنی شعر گوئی کے لئے فارسی ہی کو موزوں ذریعۂ اظہار سمجھتا ہے - غالب کے اکثر پیشرووں اور ہم عصروں کو یہ مسئلہ درپیش نہیں تھا - وہ اردو شعر لکھنے میں مصروف تھے اور اردو زبان کو بیک وقت اس کے ہندی اور فارسی لوازمات سے آزاد کر رہے تھے - غالب نے ہندوستان میں مغلیہ ثقافت کی اقدار اور گمبھیرتا کو اپنے میں سمو لیا تھا مگر اسے جب تغیر کا احساس ہوتا ہے تو متشکک انداز ابھر آتا ہے جو اپنے ساتھ طنز اور ذو معنویت لاتا ہے - اس لئے وہ اپنے لئے شعری تجربے کے لئے نیا اسلوب تخلیق کرتا ہے - مغلیہ ثقافت میں سرشاری جواب غیر شعوری ہے اور روز افزوں تشکک جو شعوری ہے مدغم ہو کر ایک نیا تجربہ تخلیق کرتے ہیں - اس لئے طنزیہ ابہام اور ذو معنویت کا استعمال اس کی شاعری کو تازگی عطا کرتے ہیں اور ایک نیا مزاج بھی - اس شاعری کی بحراں بھی با وقار اور گمبھیر ہیں - یہ شاعری تکلف کی روایت کے بوجھ دبی ہوئی معلوم نہیں ہوتی - یہ عظیم شاعری ہے -

غالب کی شاعری میں دو تین علامات مستقل حیثیت اختیار کر گئی ہیں - جن کا ذکر یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے - "موجۂ گل" - "موجۂ خیال" - "گذرگاہ خیال" جہاں بھی استعمال ہوئی ہیں ان کی ذہنی حالت کا پتہ دیتی ہیں - "دل گذرگاہ خیال مے و ساغر ہی سہی، مے و ساغر کی طلب - اس کی وقتی نا حصولی - اور گذشتہ شیریں و تلخ سب ایک ساتھ مل کر دل کی گذرگاہ سے ہو کر تخیلی تجربہ بن جاتی ہیں - اس کے شعر کی عام طور سے جذباتی کیفیت بھی ہے - اتھاہ کرب کے ساتھ رنگینی کی ایک ہلکی سی لہر - اور اس کے ساتھ زندگی کرنے کا پر وقار فن - میرے نزدیک اس کے شعر کی روح اسی میں مضمر ہے ---

دل تا جگر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب
اس رہ گزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

یا

موجۂ گل سے چراغاں ہے گذرگاہ خیال
ہے تصور میں ز بس جلوہ نما موج شراب

ان علامات کے علاوہ "شمع" اس کے کلام میں مستقل علامت ہے جو زندگی، اس کے اندھیرے اور روشنی کو اپنے دامن میں سمیٹے ہے -

ع شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

غالب کی شاعری کا بنیادی موضوع حسن و عشق ہے مگر جیسے میں نے ابھی عرض کیا - یہ تقریباً دو سو سال کی ثقافت کو عصری ابتلا سے گوندھ کر ایسے نغمے کی صورت میں پیش ہوئی ہے جس میں درد بھی ہے اور متانت بھی - اس کی غزلیاتی شاعری کی کئی سطحیں ہیں - غالب نے کہا تھا :

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت بقدر لذت آزار بھی نہیں

غالب کی غزل کی ایک سطح اور کیفیت ان غزلوں میں ملتی ہے جس کی نمائندہ وہ غزل ہے جس کا مطلع درج ذیل ہے :

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں

یہ اس سماج کی یاد دلاتی ہے جہاں دونوں جنسوں کی ملاقات محال تھی - جہاں خود شاعر کا ذہن یا دونوں کا ذہن درمیانی رکاوٹیں پیدا کرتا تھا - مرزا کے کلام میں اس لحاظ سے رومانی یا افلاطونی عشق کی کوئی جھلک نہیں لیکن وہ ترکیب ذہنی ضرور ہے جو اس کی تخلیق ہے یعنی محبوب کو تخیل ہی میں پیار کرنا اس لئے

میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دل وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

دوسرے موڈ کی وہ غزلیں ہیں جن میں سرخوشی اور رندی زیادہ اور کرب کم ہے - جس کی نمائندہ یہ غزل ہو سکتی ہے :

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوش قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

تیسرے اہم موڈ کی تخلیق وہ تمام غزلیں ہیں جن میں یہ دونوں پہلو بہم دگر مل گئے ہیں - جہاں حقیقت شناسی نہایت اعلیٰ سطح پر پہنچ گئی ہے - جہاں ایک ایک مصرع جانے محسوسات کی کتنی کروٹوں اور جذبات کے کتنے گوشوں اور خیالات کے کتنے شائبوں کو جمع کر دیتا ہے - یہی وہ کلام ہے جسے انہوں نے خود "نوائے سروش" کا نام دیا تھا - مثلاً یہ غزلیں جن کے مطلع یہ ہیں

۱- تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے
حوران خلد میں تری صورت اگر ملے

۲- آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

۳- پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

۴- نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

چوتھے موڈ کی وہ تمام غزلیں ہیں جو ذاتی تلخیوں اور محرومیوں کے ساتھ ساتھ اس وقت ادبار اور ابتلا کو بھی شامل کرتی ہیں اور جہاں لوا نہایت تلخ ہو جاتی ہے - اور جہاں منفی نفسیاتی کیفیات حاوی ہو جاتی ہیں - مثلاً یہ غزلیں

۱- بے اعتدالیوں سے سبک سب سے ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

۲- فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابند نے نہیں ہے

۳- ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے

اس بحث سے یہ نمایاں ہوتا ہے کہ غالب کا شعری تجربہ کن مختلف اور متضاد عناصر سے وجود میں آتا ہے - یہ تجربہ مثالیت کی ہلکی سی فضا بھی تعمیر کرتا ہے جو اس عظیم ثقافت کی روح سے ابھرتی ہے جو اس تجربے کی بنیاد ہے - اور یہ ایک ایسے اسلوب کی تخلیق کرتی ہے کہ شعری تجربے کے فلسفیانہ ہونے کا احساس پیدا ہوتا ہے - اس لحاظ سے غالب کے تجربے میں خود اعتمادی ، غرور و تمکنت اور رجائیت ایسے انداز ابھرتے ہیں - مگر اس عظیم پیکر کی شکستگی اس بنیادی سانچے میں داخل ہو کر اسے جلا دیتی ہے اور یکسر ایک نئے تجربے میں ڈھال دیتی ہے - اس لحاظ سے غالب کے تجربے سے اندھیرا ، انتشار اور قنوطیت ایسے انداز ابھرتے ہیں اور سب سے بڑھ کر تشکک - یہ صورت حال پرانی اقدار کی شکست و ریخت سے پیدا ہوتی ہے اور آج ہم لوگ جو ایسے ہی معاشرے میں زندگی گزار رہے ہیں اس سے روحانی طور پر اطمینان حاصل کرتے ہیں - یہ صورت حال ہمیں میتھیو آرنلڈ کی شاعری کی یاد دلاتی ہے -

''دو دنیاؤں کے درمیان گھوم رہا ہوں - ایک مردہ
اور دوسری ابھی جنم نہیں لے سکی -''

لیکن غالب اور آرنلڈ کی شاعری کا مقام اتصال فقط یہی ہے - آرنلڈ عظیم شاعری کی سطح سے دور ہے - میرے خیال سے غالب کی شاعری کا مزاج اور ماحول شکسپیئر اور ابسن (Ibsen) کی تصانیف کی روح سے مماثل ہے جو ایسے ہی تاریخی ادوار میں پیدا ہوئے اور جہاں ایسی ہی کشمکش اور الجھن تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانی جوکہ غالب کو درپیش تھی -

جدید ادبی بے معنویت کی تحریک بھی غالب کی اہمیت کا احساس دلاتی ہے - جب زندگی کا ارتقا سمت سے محروم ہو جائے تو انتشار اور پراگندگی کی سی کیفیات پیدا ہوتی ہیں لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ غالب پر بے معنویت چھائی ہوئی ہے

البتہ تشکک کسی حد تک ضرور حاوی ہے مگر زندگی کرنے اور اس سے لطف حاصل کرنے کی خواہش کبھی بھی مدھم نہیں پڑتی - بعض نقاد اسی سبب غالب کو رجائی کہتے ہیں - میرے خیال سے یہ وجودیاتی (Existential) نقطۂ نظر ہے اور جدید ذہن کے لئے اس کی قدر و قیمت مسلم ہے - ایسے نقطۂ نظر سے انتشار میں معنویت ہی نہیں سمت بھی متعین ہوتی ہے - یہ انداز فکر اس کی شاعری کو ہمہ دردناکی سے بچاتا ہے اور ہمہ تشکک سے بھی - اس کے شعری تجربے کا یہ اہم عنصر اسے دلچسپ اور زندگی بخش بناتا ہے -

چنانچہ آج ہم غالب کی شاعری کا تجزیہ اور استحسان اپنے مذاق سخن کی راہ سے کرتے ہیں - اس سے یہ مراد نہیں کہ جدید شاعر غالب کا تتبع کریں- غالب اپنے دور کے انتشار کا احساس حاصل کر رہا تھا مگر وہ اس کی عظمت کو اپنی روح میں سمو چکا تھا - ہم اپنے اس دور کی شکستگی کا مکمل تجزیہ کر چکے ہیں اور نئے دور کی پہلی کرن کو طلوع ہوتا دیکھتے ہیں - ہمارے اور غالب کے دور میں قدر مشترک فقط انتشار اور الجھاؤ ہے - ہمیں غالب کی طرح ماضی کی طرف نہیں دیکھنا بلکہ مستقبل کی جانب - اس لئے ہم غالب کی تکنیک اور اقبال کے فلسفۂ ارتقا سے بیک وقت مستفیض ہو سکتے ہیں - لیکن میری مراد یہ بھی نہیں کہ ہم اقبال کے تجربے کا تتبع کریں - مگر جدید شاعر ان دونوں عظیم شاعروں اور روایات شاعری سے استفادہ کر سکتا ہے اگرچہ اس کی شاعری اس کی اپنی جدت کی تخلیق ہوگی -

ہمارے لئے غالب کی حیثیت

جیلانی کامران

نئی شاعری کی بدلی ہوئی ادبی اور فکری آب و ہوا میں غالب کی حیثیت کا سوال بہت حد تک نظریاتی ہے ۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غالب اور نئی اردو شاعری کے درمیان فاصلہ کم ہو رہا ہے ۔ غالب زندگی کو معیار کے طور پر قبول نہیں کرتا ۔ اور نہ اس کی شاعری ہی کو زندگی کے معیاروں سے ناپا جا سکتا ہے کیونکہ غالب زندگی کی نفی کرتا ہے ۔ غالب زندگی کے شیشے میں جھانک کر اپنا عکس نہیں دیکھتا ۔ بلکہ زندگی غالب کے آئینے میں اپنا عکس ڈھونڈتی ہوئی نظر آتی ہے ۔ غالب جس زندگی سے آشنا ہے وہ زندگی ٹوٹی ہوئی اور شکستہ ہے ۔ تجربہ محرومی کے دباؤ سے برآمد ہوتا ہے اور 'واردات' یادداشتوں اور تمناؤں کے کھچاؤ سے صورت پاتی ہے ۔ زندگی کے اس نظارے کو ٹھہرے ہوئے پانیوں میں پتھر پھینک کر تھرتھراتے ہوئے عکسوں کی شکل میں بیان کیا جا سکتا ہے ۔ اور ظاہر ہے کہ تھرتھراتے ہوئے عکس کو منعکس ہوتی ہوئی شئے کا معیار نہیں قرار دیا جا سکتا ۔ غالب کی شاعری میں زندگی کا درہم برہم ہوتا ہوا (تھرتھراتا ہوا عکس) نظارہ دکھائی دیتا ہے ۔ شاعری کی زبان میں زندگی کے درہم برہم ہوتے ہوئے نظارے کو موت کہا جاتا ہے ۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ ۱۷۹۷ء سے لے کر ۱۸۶۹ء تک کا عرصہ ہماری کلاسیکی تاریخ کا عالم نزع ہے ۔ جہاں آخری سانس بالآخر موت کی ہچکی میں ختم ہوتے ہیں ۔ اس سچائی کو تسلیم کرتے ہوئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ عالم نزع کو صحت کا معیار قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ غالب کی شاعری عالم نزع کو معیار کے طور پر قبول نہیں کرتی ۔ اور اس طرح اس زندگی کو رد کرتی ہے جس کے الفاظ تاریخ کی کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں ۔

غالب کی شاعری میں فن زندگی کی رہبری قبول نہیں کرتا کیونکہ زندگی موت کی ہم شکل بن چکی ہے ۔ بلکہ ایسی موت نما زندگی فن کی رہبری میں

دوبارہ جی اٹھنے کی آرزو میں بے تاب دکھائی دیتی ہے ۔ غالب کی شاعری دوبارہ جی اٹھنے کی آرزو کی شاعری ہے ۔ اور اس آرزو کے اردگرد غالب کا شعری اور فکری نظام پھیلا ہوا ہے ۔

اگر عالم نزع ، موت اور دوبارہ جی اٹھنے کی خواہش کو ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ غالب کی شاعری عالم برزخ کی شاعری ہے ۔ جہاں جسم اور روح الگ الگ ہو چکے ہیں ۔ اور ان دونوں کے درمیان موت وارد ہو چکی ہے ۔ موت کی ایسی صورت کے خاتمے کے لئے اور جسم کو روح کے تعلق سے دوبارہ زندہ کرنے کے لئے غالب مجاز و حقیقت کے فلسفے کا استعمال کرتا ہے ۔ یہ فلسفہ غالب کی شاعری کا منطقی اور لازمی حصہ ہے ۔

تنقید کے جس رجحان کو عموماً قبول کیا گیا ہے یہ ہے کہ شاعری زندگی کی عکاسی کرتی ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب کی شاعری اس تنقیدی مفروضے کی کھلی نفی کرتی ہے ۔ کیونکہ غالب کی شاعری میں زندگی یکسر ناپید ہے ۔ جسے ہم غلطی سے زندگی کہتے ہیں وہ دراصل نفسیاتی مرض ہے ۔ اور چونکہ ہمارا باطن صدیوں سے نفسیاتی مرض میں مبتلا ہے اس لئے ہم مرض کو صحت اور موت کو زندگی سے منسوب کرتے رہے ہیں ۔ غالب کی شاعری زندگی کی عکاسی نہیں کرتی زندگی کی تلاش کرتی ہے ۔ غالب زندگی کو دنیا میں نہیں مٹیا فزکس میں دریافت کرتا ہے ۔

غالب کی شاعری کا طلسمی لفظ استعارہ ہے جس کے ادا ہوتے ہی جسم اور روح کا تعلق قائم ہو جاتا ہے ۔ اور دوبارہ جی اٹھنے کی آرزو اپنا سفر طے کرنے لگتی ہے ۔ یہ استعارہ ماضی حال اور مستقبل کے غیر مرئی پردوں میں گردش کرتا ہے ۔ اور اس طرح وقت کے نظام ترتیب کو ایک لمحاتی صورت دیتا ہے ۔ اور یوں لمحے اور ہمیشگی کے درمیان لفظ کی قدرتوں کا اعلان کرتا ہے ۔ استعارے کی ایسی صلاحیت ہی کے باعث مجاز و حقیقت کا فلسفہ ، دنیا کی تنگ وادیوں سے اور موت کی صورت حال سے آزاد ہونا سکھاتا ہے ۔ اضافتوں کا استعمال اسی مقصد ہی کی تائید کرتا ہے اور اس مقصد کو پورا کرتا ہے ۔

غالباً اردو کی ادبی تاریخ میں غالب پہلا شاعر ہے جس نے شاعری کو اپنی زمینی زندگی کا لائحہ عمل بنایا اور اپنی زمینی زندگی کو اس لائحہ عمل کے تابع کر کے اپنی ذات کی تکمیل کی ۔ ایسا کہتے ہوئے مجھے وہ نقاد یاد آتے ہیں

جو غالب کی محرومی اور ذات کی شکستگی کا خاص طور پر ذکر کرتے ہیں۔ تاہم جو کچھ میں نے کہا ہے اس کی دو صورتیں دکھائی دیتی ہیں۔ ایک کا تعلق غالب کی سوانح عمری کے ساتھ ہے۔ جس میں غالب، دلی کا باشندہ بھی ہے اور شاعر بھی۔ اور جو کچھ دلی کے باشندے پر وارد ہوتا ہے اسے شاعر اپنے تجربے اور لفظ میں بدل دیتا ہے۔ دلی کا باشندہ کچے مال کا سبب بنتا ہے اور شاعر اس خام جنس کو شاعری میں منتقل کرتا ہے۔ ذات کی تکمیل اس راستے سے بھی پوری ہوتی ہے۔ لیکن دوسری صورت جس کی طرف میں بالخصوص اشارا کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ غالب وہ پہلا شاعر ہے جس نے اپنے فن کو ایک منزل سمجھا، اور اس کی انشالیوں کو اپنی شاعری اور زندگی کی قسمت بنایا۔ غالب کا دیباچہ غالب کی شاعری کا دستاویزی لائحہ عمل ہے۔ اور اس سے پہلے غالباً کسی اردو شاعر نے دیباچے کے اصولوں کی روشنی میں شاعری کو لائحہ عمل کے طور پر قبول نہیں کیا تھا۔ جو لوگ شاعری کے اصل کاروبار سے تعلق رکھتے ہیں جانتے ہیں کہ تخلیقی افتاد طبع کو کسی لائحہ عمل کے تابع کرنا کس قدر مشکل ہے۔ غالب پہلا شاعر ہے جس نے اپنی شاعری کے لئے دیباچہ قلمبند کیا۔ اور اپنی شاعری کو دیباچے میں بتائے گئے ارادوں کی شہادت کے لئے پیش کیا۔ غالب کے بعد صرف نئے اردو شاعروں میں لائحہ عمل اور شاعری کا رشتہ ظاہر ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ لائحہ عمل سے میری مراد مینی‌فیسٹو یا منشور نہیں ہے۔

اگر غالب کی شاعری کو 'واردات' کہا جائے تو معلوم ہوگا کہ غالب کی شاعری وارداتوں اور تجربوں کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ اس کی شاعری ان واردات اور تجربوں کی نفی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ غالب کی غزلیات میں ایک سفر دکھائی دیتا ہے جہاں ہر واردات ظاہر ہوتی ہے اور شامل سفر ہو کر سفر سے منہا ہو جاتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس تفریق مسلسل سے سفر کس منزل تک پہنچتا ہے۔ اور اس منزل کی واقفیت کے لئے غالب نے لفظوں کے تعمیر کئے ہوئے کون کون سے نشانات راہ دیئے ہیں۔ زندگی ایک زمینی سفر ہے اور کبھی بے معنی نہیں ہوتا۔ غالب کی غزل بھی بے ربط نہیں ہے۔ اور اس کے معنی سفر کے تسلسل سے اخذ ہوتے ہیں۔

غالب کی شاعری کا درخت گناہ کی زمین میں اگتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس گناہ کی صورت کیا ہے؟ غالب کی سوانح عمری میں ایسی باتوں کا ذکر ہے

کہ وہ با شرع مسلمان نہ تھا - نماز روزے کی پابندی اُس کے لئے دشوار تھی - شراب پیتا تھا ، طوائفوں کے پاس جانے میں اُسے کوئی عار نہ تھی ، زکواۃ کا اُس کی زندگی میں کوئی حصہ نہ تھا - اور یہ بھی ثابت ہے کہ اُسے حج بیت اللہ شریف کی کوئی خواہش نہ تھی - دوسرے لفظوں میں ایک خالص مسلم معاشرے میں اُس کی حیثیت ملامتی کی تھی - لیکن اُسے رسول اللہ سے بے حد محبت تھی ، اور اُسے اس پر ناز بھی تھا - خود کو غلامان حضرت علی میں شمار کرتا تھا اور نجف اشرف میں دفن ہونے کی آرزو اُسے بے چین رکھتی تھی اُس کے نام کی نسبت شیر خدا سے تھی جن کی صفت غالب ہے - معراج پر اُسے پورا اعتقاد تھا - یہاں جو سوال پریشان کرتا ہے یہ ہے کہ بقائے دوام کا جو سہرا اُسے نصیب ہوا ہے اُس کا تعلق کس خوبی سے ہے؟ کیا خدا گنہگاروں کو عزت اور عظمت دیتا ہے اور پاکباز لوگوں کو نظر سے گرا دیتا ہے؟ دوسرے لفظوں میں یہ سوال یوں ہے کہ گناہ کیا ہے؟

شاید گنہگار اُسے کہتے ہیں جسے اپنے گنہگار ہونے کا احساس نہیں ہوتا - گناہ ، احساس گنہ سے اگر اثباتی صورت اختیار نہیں کرتا اپنی نفی ضرور کرتا ہے - گنہگار کا احساس ، گنہ کی نفی کرتا ہے - اور اس طرح گنہ ، جرم و سزا کے ترازو میں بے وزن ہو جاتا ہے اور تزکیۂ نفس کا باعث بنتا ہے - غالب کا گناہ اس اعتبار سے گنہ کے زمرے میں شامل نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ غالب احساس گناہ کے تجربے سے بہرہ مند تھا لیکن اُس کا زمانہ اس تجربے سے کلیتاً بے بہرہ تھا - زمانے اور غالب کے مابین گنہ کی قدر اُلٹ چکی تھی - لوگ شرع اور ثواب کی باتیں ضرور کرتے تھے اور نیک اور پاکباز بھی تھے - لیکن گناہ کے کالے اور منحوس بادل سے بری طرح گھر چکے تھے - اس بادل سے ٹوٹتی ہوئی بجلیوں کا شکار اُس زمانے کی اسلامی تہذیب تھی - حقیقت یہ ہے کہ لوگ مظلوم نہ تھے تہذیب مظلوم تھی - اور اس کی عیادت اور خبرگیری کے لئے گناہ کے راستوں سے گزرنا ضروری تھا - احساس گنہ کے بغیر اُس دکھ میں شرکت ممکن نہ تھی جس دکھ سے مسلمانوں کی تہذیب دو چار تھی - غالب کی شاعری میں گناہ کا احساس جس قدر شدید ہوتا ہے اُسی شدت سے اُس کی وہ محبت بھی ظاہر ہوتی ہے جو اُسے مسلمانوں کی تہذیب کے ساتھ تھی - غالباً یہ کیفیت غالب کے لئے اس قدر واضح نہ تھی - لیکن اُس کی سوانح عمری میں یہ ایک سوال بن کر اُبھرتا ہے کہ "جب مجھ میں مسلمانوں کی کوئی بات نہیں ہے تو پھر انگریز مجھے مسلمان کیوں سمجھتے ہیں؟" اس سوال کا جواب میجر

اینڈرسن کے پاس تھا ۔ جس طرح بہادر شاہ ظفر ، اسلامی ہندوستان کی حاکمیت کی علامت تھا ، اور بخت خاں عسکری مزاحمت کا مظہر تھا ، اسی طرح غالب بھی اپنی تہذیب کی واضح علامت تھا ۔ اور انگریز فوجی افسر اس رشتے سے بخوبی باخبر تھے ۔ گناہ کے بتائے ہوئے شرعی نشانات سے گزرتے ہوئے غالب گنہگاروں کی تہذیب بن چکا تھا ۔ گناہوں کو گلی کوچوں میں جتے ہوئے خون نے دھو ڈالا ، اور گناہوں کے روغن سے درختوں کی ٹہنیوں پر لاشوں کے پھل اگنے لگے ۔ جو شئے بچ گئی وہ تہذیب تھی اور اس کی انسانی صورت غالب تھا ۔ جس کی آواز نوحے کی تھی اور جس کا سوز گم ہوتے ہوئے قافلے کا سوز تھا ، آواز کی ایسی رنگت غالب کو گناہ کے دوزخ میں جلنے سے بچا گئی اور اسے وہ بارگاہ نصیب ہوئی جہاں خوش بخت انسان ہمیشہ کی زندگی پاتے ہیں اور موت سے آزاد ہوتے ہیں ۔

غالب مغلوب

محمد منور

برعظیم پاک بھارت کے فلک بوس قصر ادب میں دو شیش محل ہیں -
اقبال اور غالب - - - دونوں کی بیشتر شہرت شعری آئینہ کاری کے باعث ہے -
ان پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کی بدولت ملک کے ادبی خزینوں میں وسیع
اضافہ ہوا ہے - - - - - اس اعتبار سے اب ان دونوں میں سے کسی پر بھی
قلم اٹھانا بڑی ذمہ داری یا ممکن ہے غیر ذمہ داری کی بات ہو ، تاہم عذر
کے لئے گنجائش موجود ہے وہ یہ کہ بقول حالی -

بڑی وسعت ہے میری داستاں میں لیا ہے لیجئے جب نام اس کا
لگے ہاتھوں صاحب کا ایک شعر بھی سن لیجئے :

صدسال میتواں سخن از زلف یار گفت!
در بنداین مباش که مضموں نمانده است مرزا صاحب

محبت کے قصے داستانیں باسی نہیں ہوئیں کان ہر بار نئی لذت محسوس کرتے
ہیں حسن کے مناظر کی دلکشی کو تکرار کے باوصف قرار حاصل ہے وہی چاند
بار بار طلوع ہوتا چلا آ رہا ہے - وہی بہاریں بار بار روپ دکھاتی آ رہی ہیں
نہ چاند کی دل آویزی کو تکرار نے کم کیا ، نہ بہار کی ساحری کو ، - - -
اس اعتبار سے غالب کا تذکرہ بھی ایک دلچسپ داستان اور ایک حسین منظر
ہے ، اس داستان کی سماعت اور اس حسن کا نظارہ جب بھی میسر ہو
لطف آجاتا ہے ، اس حوصلے پر غالب کے بارے میں کچھ کہنے کی جرأت کر
رہا ہوں -

میں نے اس تحریر کا عنوان "غالب مغلوب" رکھا ہے یہ ترکیب خود غالب
ہی کی طبع اختراع پسند کی ساختہ پرداختہ ہے -

مثلاً ناسخ کے نام ایک فارسی خط میں انہوں نے لکھا "یکے از ستمگران
خدا ناترس کہ بعذاب ابدی گرفتار باد ولیم فریزر صاحب بہادر راکہ ریزیڈنٹ

دھلی و غالب مغلوب را مربی بود اور شب تاریک بضرب تفنگ کشت و مراغم مرگ پدر تازہ کرد ۔"

اس ترکیب نے ذھن میں غالب کی کشمکش حیات کی عبرتناک فلم پھیلا دی ۔ ولیم فریزر علم دوست انگریز تھا ۔ مگر غالب کا یارانہ محض اس کی علم دوستی پر مبنی نہ تھا ۔ غالب کی پنشن کا مقدمہ چل رہا تھا ، وہ مقدمہ جس نے غالب کی زندگی کو جہنم بنا دیا ، ولیم فریزر سے امداد کی توقع تھی ، اس کے قتل سے مایوسی کا دامن اور وسیع ھو گیا ۔ مگر غالب کی حالات کے ھاتھوں مغلوبیت کا عالم یہ ھے کہ وہ فریزر کی موت کو مرگ پدر سے تشبیہہ دے رہے ھیں ۔

آج کے ماحول میں یہ انگریز دوستی عجیب سی معلوم ھوگی لیکن غالب کی مجبوری یہ تھی کہ ان کی ظاھری وجاھت بڑی حد تک انگریز کی خوشنودی پر منحصر تھی ، اور انہیں اس امر پر فخر بھی تھا ، آپ کو یاد ھوگا کہ انہوں نے طبیعت کے ھاتھوں مغلوب ھوکر برھان قاطع کے مصنف پر ایسی طنز و تعریض کی تھی کہ جواباً ایک طوفان دشنام اٹھ کھڑا ھوا ۔ اس طوفان کی ایک موج شدید موید برھان تھی جس کے مصنف مرزا احمد علی تھے مرزا احمد علی نے بھی دشنام کا حصہ رسد مہیا کیا تھا ۔ غالب اپنی ایک جوابی کتاب تیغ تیز میں ان کی نسبت لکھتے ھیں ”جتنے الفاظ تذلیل کے ھیں وہ چن چن کر میرے واسطے استعمال کئے اور یہ نہ سمجھا کہ غالب اگر عالم نہیں شاعر نہیں ۔ آخر شرافت و امارت میں ایک پایہ رکھتا ھے ' صاحب عز و شان ھے ، عالی خاندان ھے امرائے ھند روسائے ھند ، مہاراجگان ھند سب اس کو جانتے ھیں ، رئیس زادگان سرکار انگریزی میں گنا جاتا ھے“ بادشاہ کی جانب سے نجم الدولہ کا خطاب ھے ۔ گورنمنٹ کے دفتر میں خان صاحب بسیار مہربان دوستاں القاب ھے ۔ جس کو گورنمنٹ خان صاحب لکھتی ھے ۔

یہ برھان قاطع کا ھنگامہ مرزا غالب کا اپنا پیدا کردہ تھا ۔ انگریزی مقولے کے مطابق انہوں نے بگولے بیج کر آندھی کی فصل اٹھائی تھی ۔

مگر فی الحال توجہ اس امر پر رھے کہ غالب کو یکے از رئیس زادگان سرکار انگریزی فخر محسوس ھوتا ھے ۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ۔ یہ بھی حالت کی عطا کردہ مجبوری تھی ۔

غالب کے دادا قوقان بیگ خان اپنے والد بزرگوار ترمیم خان سے ناراض ہوکر ہندوستان چلے آئے تھے - آپ کو یاد ہوگا - ظہیرالدین بابر بادشاہ نے ہندوستان فتح کرنے کے بعد اپنے مولد و مرز بوم یعنی ارض سمر قند و فرغانہ کی طرف دعوت عام روانہ کی تھی کہ جو جو مرزا صاحبان آئیں گے زر، منصب اور جاگیر پائیں گے، چنانچہ تورانی امرا وقتاً وقتاً برعظیم پاک ہند کی جانب رخ کرتے رہے - - قوقان بیگ کی بدقسمتی کہ وہ اس وقت آئے جب مغلیہ قافلۂ اقتدار نگاہوں سے اوجھل ہو رہا تھا، قافلہ کم دکھائی دیتا تھا اور غبار زیادہ - - محمد شاہ کا دور آخر ہوگا، کئی سال نظامت لاہور میں قیام رہا جب دلی میں وارد ہوئے تو شاہ عالم ثانی کا زمانہ تھا - جن کی حکومت آخر از دهلی تا پالم رہ گئی تھی - شاہ عالم نے بہرحال جاگیر سے نوازا، قوقان بیگ کے دو فرزند تھے، نصراللہ بیگ خان اور عبداللہ بیگ خان - قوقان بیگ کی طرح یہ دونوں بھی مہم پسند اور شمشیر فروش تھے -

شمشیر فروش اس طرح کہ بازار جہاں میں ان کا زرمبادلہ شمشیر ہی تھا، توران سے یہ لوگ شمشیر کے بھروسے پر نکلے تھے - جب یہاں شمشیر خریدنے والی مرکزی قوت ٹوٹ گئی تو پھر جس نے بھی خریدنا چاہا پالیا، ایسے عالم میں وفاداریوں کا جھنجھٹ پیدا نہیں ہوتا، نصراللہ بیگ خان نے مرہٹوں کی ملازمت میں اکبر آباد آگرہ کی حکومت بھی سنبھالی، یہ عرصہ یقیناً محدود ہوگا - پھر انگریزی فوج میں سالار ہوگئے اور جاگیر پائی - - عبداللہ بیگ خان کبھی لکھنو میں آصف الدولہ کے یہاں رہے، کبھی حیدرآباد میں کبھی جے پور میں اور آخر مہاراجہ الور کی خدمتگذاری میں مارے گئے - نہ مسلمانوں کا قومی اجتماعی شعور بیدار تھا نہ ہندوں کا، قسمت آزمائی کا زمانہ تھا، جدھر حالات بہتر نظر آتے سپاهی منش شمشیر زادے ادھر کو ہو جاتے تھے -

اپنے والد کی وفات کے وقت غالب پانچ برس کے ہوں گے - چچا متولی تھے، جنھوں نے اپنی وفاداری انگریز سے وابستہ کر دی، چنانچہ انگریز کی عطا کردہ جاگیر سے ان کے ورثا متمتع ہوتے رہے، انہی میں غالب بھی تھے - ظاهر ہے کہ جب غالب نے آنکھ کھولی تو جو امارت و جاگیریا اعتبار و وقار میسر تھا وہ زیادہ تر انگریز کے باعث تھا، اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ کا رسمی احترام بجا، اس مٹتی ہوئی شان کے ساتھ بھی ظاهری ربط میں ایک طرح کی

شان تھی لہذا اس شان کو حاصل کرنے کی بھی مرزا غالب بڑی بے قراری سے کوشش کرتے رہے ، اور بڑی لجاجتوں اور زاریوں کے بعد جو ان کے کئی قصائد سے عیاں ہو رہی ہے ان کا ۱۸۵۰ میں بہادر شاہ کے دربار سے بھی باضابطہ تعلق قائم ہو گیا - تاہم انگریز کے نمک خوار وہ پانچ برس کی عمر سے تھے ، بہادر شاہ سے تنخواہ ۵۳ برس کی عمر میں پانے لگے ، مزاج میں آبائی سپاہی منشی رچی تھی ، چنانچہ وفاداری کے اصولاً شدت سے قائل ہونے کے باوصف عملاً زیادہ قائل نہ تھے - وفاداری بشرط استواری کا دعویٰ ایک طرف مگر دوسری طرف حاتم علی مہر کو لکھتے ہیں ''محبت میں شکر کی مکھی بنو شہد کی مکھی نہ بنو" ان کی بیشتر وفاداری خاندانی وجاہت سے تھی اور وہ کسی نہ کسی طرح اپنے ظاہری وقار کو قائم رکھنا چاہتے تھے - غالب اس جذبے کے ہاتھوں جس قدر مغلوب تھے اور کسی شے کے ہاتھوں نہ تھے - ان کی زندگی کی بیشتر تلخیاں اسی نمائشی بقاء کی پیدا کردہ تھیں - - - مگر ذہن بڑا حقیقت پسند پایا تھا ، یہ اور بھی زیادہ تکلیف دہ بات تھی ، ورنہ وہ کشمکش سے محفوظ رہتے - - - ذہن عقل کے چراغ سے مستنیر تھا اور نئے زمانے کا ساتھ دینا چاہتا تھا نہادو مزاج قدامت پسند اور مڑ مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھنے والا ع کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے یہ تضاد نہیں ، یہ کشمکش ہے ، تضاد وہاں ہوتا ہے جہاں کوئی آدمی قصداً کہے کچھ اور کرے کچھ اور ان دونوں بظاہر ایک جیسی خاصیتوں میں فرق ہے مگر لطیف سا ، غالب کہتے ہیں -

ما لاغریم گر کمر یار نازک ست
فرق است درمیانہ کہ بسیار ناک ست

یہ کشمکش ہر فرد بشر کی ہستی میں موجود ہوتی ہے علم، عقل، روح، ذہن ، دل ، ضمیر 'قوت ارادی' ہوس اور نہ جانے کیا کیا عوارض ہیں جو کبھی باہم متوافق ہوتے ہیں اور کبھی متصادم - نیت اور ارادہ نیک ہوتا ہے مگر مزاج بغاوت کر دیتا ہے - دانش صحیح رہبری کرتی ہے مگر ہوس کا ریلا بہالے جاتا ہے - ضمیر کی آواز صاف ہوتی ہے مگر خمیر اسے اپنے غل غپاڑے میں گوندھ لیتا ہے - گویا ہر فرد بشر ایک ایسا چلتا پھرتا قید خانہ ہے جو باہر سے پختہ و مضبوط دکھائی دے مگر اندر قیدیوں میں مسلسل جوتم پیزار ہو رہا ہو - آدمی بے خبری کی زندگی گذارے تو سب

ٹھیک ہے انگریزی مقولے کے مطابق بے خبری بڑی راحت ہے - لیکن جس نے بھی ذرا سوچا وہ مارا گیا - اسے ہر سانس اعلان جنگ نظر آتا ہے -

نہ دام دانم ولے دانہ این قدر دانم
ز فرق تا بقدم ہرچہ ہست در بند است

یہ اندرونی پیکار محض اندر کی پیداوار نہیں ہوتی - بیرونی مؤثرات باقاعدہ کار فرما ہوتے ہیں وسائل رزق اور ان کی کشاکش ، بندگی و خواجگی کی لذت وکلفت شرع و آئین کی پابندی ، جہنم اور خدا اور نہ جانے کیا کیا ، کئی اندرونی محاذ ، کئی بیرونی محاذ ، پھر یہ کہ موثرات اور حسیات کا تناسب بھی ہر فرد میں یکساں نہیں - چنانچہ تاب و تواں کے فرق نمودار ہوتے ہیں - - کہنے کا مطلب یہ ہے کہ شخصیت کے کئی عوارض و عوامل ہیں - اس لئے شخصیت کا تعین اور اس کی تحدید ناممکن -

اگر اس مجبوری کو سمجھ لیا جائے تو مزاجوں کا اتار چڑھاؤ ایک دلچسپ تماشا ہے - اور جو آدمی اس اتار چڑھاؤ میں جس قدر زیادہ مبتلا ہو اتنا ہی ہمدردی کے لائق ہے - ایسے پیغمبرانہ اوصاف کے مالک کتنے افراد ہوتے ہیں جن کی زندگیاں توازن و اعتدل کا صحیح نمونہ ہوں ، اور پھر معاف کیجئے - اگر سارے آدمی متوازن ہوں تو زندگی حماقتوں سے محروم ہو جائے - حالانکہ زندگی کی رنگا رنگی اور رونق فقط حماقتوں کی وجہ سے ہے - عقل تو بے رس اور خشک شے ہے - جہاں سلامت روی ٹھوکر کھاتی ہے - وہاں رونق پیدا ہو جاتی ہے -

مزی اندر جہانے کور ذوقے   کہ یزداں دارد شیطاں ندارد

آخر غالب بھی تو آدمی ہی تھے ، وہ اس اتار چڑھاؤ کا شکار کیوں نہ ہوتے چنانچہ وہ خود کہتے ہیں -

خوئے آدم دارم آدم زادہ ام   بے محابا دم زعصیاں میزنم

غالب کو اس خوئے آدم نے مغلوب کر رکھا تھا - وہ عمر بھر کشمکش کا شکار رہے کبھی ایک جذبہ غالب آگیا کبھی دوسرا جیسا ان کے شعر میں مزاجی اتار چڑھاؤ ہے - یوں بھی کہتے ہیں کہ -

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم انی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیوں پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

اور یوں بھی کہتے ہیں کہ -

دھوتا ہوں میں جو پینے کو اس سیم تن کے پاؤں
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں

وہی غالب ہیں جن کا ارشاد ہے -

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہو

اور انہی کا قول ہے -

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

ایک جگہ فرماتے ہیں -

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

اور دوسری جگہ اس طرح کہ -

واں وہ غرور و عز و ناز یاں یہ حجاب و پاس وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

اور اس کے ساتھ ہی -

دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

غالب فرہاد پر اس کی سرگشتگی رسوم و قیود کے باعث طعن توڑتے ہیں، اور اپنے پندار کا صنم کدہ ویراں بھی دیکھنا چاہتے ہیں - یہ وہ کشمکش ہے جس سے عمر بھر چھٹکارا نہ پا سکے، آپ کو معلوم ہے کہ انہیں دہلی کالج میں پروفیسری قبول کرنے کے لئے بلایا گیا تھا، وہ گئے، مگر حکومت کے سیکریٹری جو ایک طرح سے انٹرویو لے رہے تھے ان کے استقبال کو نہ آئے - جواب ملا کہ جب آپ رئیس کی حیثیت سے دربار میں آتے ہیں تو ہم

آپ کا استقبال کرتے ہیں ۔ یہاں آپ ملازمت کے لئے آئے ہیں قاعدہ اجازت نہیں دیتا کہ آپ کا استقبال کیا جائے ۔ یہ سن کر حضرت پھر پالکی میں بیٹھے اور گھر تشریف لے گئے ۔ خاندانی رئیسی کی توہین گوارا نہ تھی ۔ خمار رسوم وقیود کے سرگشتہ تھے ، دوسری طرف زندگی کے تقاضوں سے مغلوب ہو کر ہر انگریز حاکم بااختیار کا قصیدہ بھی کہا ، خواہ وہ کوئی گورنر تھا ، سیکرٹری تھا کمشنر تھا ، یا ریزیڈنٹ۔ اور جانتے بھی تھے کہ بھٹئی کر رہے ہیں۔ بارہا اپنے خطوط میں اپنی اس روش کے خلاف احتجاج کیا ہے ۔ یعنی اصول ایک طرف تھا اور اور مجبوری دوسری طرف ، ایک طرف حضرت غالب کھڑے تھے اور دوسری جانب میاں مغلوب ۔ غالب کی اس مزاجی کیفیت کو ان کا یہ شعر بخوبی واضح کر دیتا ہے ۔

سنگ آمد و سخت آمد دردو سرخودداری
مجبور گران جانی معذور سبکساری

(پتھر آیا اور سخت آیا ، درد بھی ہو رہا ہے اور خود داری کا بھی پاس ہے خودداری کا پاس ہے اس لئے کہ ہم تحمل کے مدعی ہیں ، درد کا احساس ہے اس لئے کہ جان کمزور ہے) ۔

ان کے یہاں گر انجانی اور سبکساری ساتھ ساتھ چل رہی تھی ۔

آپ کو معلوم ہے کہ غالب کے ایک دوست نے خط پر پتہ مفصل لکھ بھیجا تھا ، یعنی گلی ، کوچے محلے کا نام تحریر کر دیا تھا ۔ اس پر غالب برافروختہ ہوگئے اور اپنے اس نیاز مند کو ڈانٹ پلا دی کہ میں ایسا گراپڑا اور گمنام نہیں کہ جب تک گلی کوچے محلے کا نام نہ ہو مجھ تک خط نہ پہنچے ، میرا نام اور شہر دھلی کافی ہے ۔ خط نہ ملے تو میرا ذمہ ۔ دوسری جانب اپنے مکتوب الیہہ کو یوں بھی لکھ دیتے ہیں کہ گدائے بے سوال ہوں ، کچھ بھیج دوگے تو رد نہ کروں گا ۔

سوچا جا سکتا ہے کہ آیا غالب اس نمائشی بقا کے قفس کو توڑ نہ سکتے تھے ۔ تخت جاہ سے دستبر دار نہ ہو سکتے تھے ، فیصلہ بظاہر کوئی مشکل نہیں مگر عملاً آسان بھی نہیں ۔ اس زمانے میں جب بارہ آنے میں مکان کرائے پر مل جاتا تھا ۔ اور چار روپے تنخواہ پانے والا شریفانہ وقت گزار سکتا تھا غالب کو ساڑھے باسٹھ روپے وظیفہ ملتا تھا ۔ کوئی لمبا کنبہ نہ تھا ۔ خود اور بیگم

بچے پیدا ہوتے اور کم سنی میں وفات پا جاتے رہے - مگر رئیسوں کی رشتہ‌داری اور ان سے برابری کی ہوس نے مار ڈالا - بھٹی بھی کرتے تھے اور نوابی کی پاسبانی بھی فرماتے تھے گھر سے سوار ہوئے بغیر نکلنا وضعداری کے خلاف تھا - لہذا گھوڑے اور پالکی کا خرچہ لابد - نہ ریاست نہ صندوق زر ، مگر داروغہ موجود ، جو آمد اور محصلات کا حساب رکھنے کی جگہ دو چار شراب کی بوتلوں اور مقروضیت کے تمسنکوں کی چوکیداری کرتا - گھر میں ایک سے زیادہ خادمائیں - باہر ڈیوڑھی پر ایک سے زیادہ خادم - مگر خادم یا ملازم تو عام لوگوں کے ہوتے ہیں مرزا صاحب نواب تھے لہذا وہ نوابوں کی طرح ان ملازموں کو ڈیوڑھی کے سپاہی کہنے پر مجبور تھے - آپ کو معلوم ہے کہ انگریزی دربار سے ان کا خلعت مقرر تھا ، مگر جب اردلی لوگ انعام پانے کے لئے آتے تو بقول حالی وہی خلعت پوشیدہ طور پر بازار میں بھیج دیا جاتا ، اور جو پیسے آتے ان میں سے اردلیوں کو انعام دے دیا جاتا - یہ سارا ذہنی عذاب صنم کدۂ پندار کو آباد رکھنے کی خاطر برداشت کیا جا رہا تھا :- مزاج رئیسانہ ، اموال واجبی - وہ حساس تھے جھلاتے تھے مگر وضعداری کے قید خانے کی سلاخیں اور دیواریں جنہیں خود ہی استحکام بخشا تھا انہیں بے بس کئے ہوئے تھیں - انہیں معلوم تھا کہ وہ غلط دور میں تشریف لائے تھے ، وہ خواہاں تھے کسی ایسے شاہنشاہ کے دور میں ہوتے جو ان کی طباعی کی داد میں اشرفیوں کے ڈھیر لگا دیتا وہ اشرفیاں ہاتھیوں پر لدواتے ، اشرفیاں گرتی جاتیں اور محتاج اٹھاتے جاتے - وہ خطوط میں اس امر پر اظہار افسوس کرتے ہیں کہ اے کاش ان میں سکت ہوتی اور وہ شہر میں کسی کو بھی بھوکا نہ سونے دیتے کم از کم اپنے محلے میں تو ایسا نہ ہونے دیتے ، مگر جہاں خود اپنا آزوقہ خطرے میں ہو وہاں کوئی دوسروں کی کیا مدد کرے لب لباب یہ کہ غالب خودی بیچ کر خودی کی نگہبانی پر مجبور تھے ، خودی کی تعمیر میں تخریب کا مسالہ لگاتے تھے -

ع مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی

وہ اپنی اس صورت حال سے بخوبی آگاہ تھے مگر وضع و عادت کے ہاتھوں مغلوب تھے ، پھنستے چلے جا رہے تھے -

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں -
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

یہ تقابل و تصادم مضحکہ خیز تھا ، وہ خود بھی ہنستے تھے ۔ ایک دوست کو لکھتے ہیں کہ میں نے خود کو اپنا غیر جان لیا ہے کبھی آئینہ سامنے رکھ کر خود سے پوچھتا ہوں اے برقیارق اے سلجوق فلاں کا قرض کیسے اترے گا ، فلاں کی ڈگری کا کیا بنے گا ، بول ۔ مگر بولے کیا ، بے حیا بے شرم ۔ ۔ اپنا اس طرح مذاق اڑا کر اپنی مغلوبیت پر پردہ ڈالتے تھے ۔

وہ لوگ جو سارے مرزا غالب کو ان کے آئینہ کلام میں ڈھونڈتے ہیں خدا جانے سارے غالب کو وہاں پا سکتے ہیں یا نہیں ۔ اس لئے کہ شعر میں فقط آرزو اور جذبہ ھی نہیں ہوتا ۔ تخیل بھی کارفرما ہوتی ہے اور وہ بعض اوقات قافیے کی مجبوری کی پیداوار بھی ہوتی ہے ۔ شعرا حضرات جانتے ہیں کہ ان کے سینکڑوں مضمون ان کی طبیعت اور تمنا کے ترجمان نہیں ہوتے محض قافیوں نے سمجھائے اور عنایت فرمائے ہوتے ہیں ۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ شاعر کی شخصیت کو بعض اوقات اس کی شاعری دھندلا دیتی ہے ۔ غالب کی شاعری پر فکر و تعقل کا غلبہ ہے ۔ تخیل کی ایجاد پسندی جگہ جگہ بہار دکھا رہی ہے مگر عمومی زندگی میں غالب کی فکر و دانش کا حکم کہاں چلتا تھا ۔

آپ نے دیکھا ہے کہ غالب نے آزادہ روی کا بارہا دعویٰ کیا ہے ، رسوم و قیود کے خلاف ہیں ، ساتھ ھی وفاداری بہ شرط استواری کا دم بھی بھرتے ہیں ۔ سرسید نے آئین اکبری کی تصحیح کی ، اور غالب سے تنقیدی تبصرہ لکھوانا چاہا ۔ غالب نے اس ضمن میں ایک مثنوی لکھ دی اور انگریزی ایجادات کی بھرپور تعریف کی ۔ نئے آئین کا استقبال کرنے اور نئے زمانے کا ساتھ دینے کا زور دار مشورہ دیا ، یہاں تک کہہ دیا کہ

ع

مردہ پروردن مناسب کار نیست

اس طرح سرسید کی ناخوشی مول لے لی مگر عملاً خود اپنا تورانی لباس بھی عمر بھر بدل نہ سکے ، "پنج آہنگ" میں خط و کتابت کے اسلوب پر اظہار رائے کیا اور کہا کہ عبارت آسان ہونی چاہئے اور اسلوب ایسا کہ گویا کاتب اور مکتوب الیہ آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہوں مگر عمر بھر اپنے فارسی نثر کے مشکل اسلوب کو آسان نہ کر سکے ۔ روشن خیالی اور ترقی پسندی کے جملہ دعاوی کے باوصف اپنی فارسی کو قدیم لب و لہجہ عطا کرنے پر سارا زور صرف کرتے رہے ، اور ہاں مردہ پروردن مناسب کار نیست کا دعویٰ رکھنے کے

باوصف اور اس دعویٰ کے باوجود کہ

بامن میا ویز اے پسر فرزند آزر را نگر ! !
ہرکس کہ شد صاحب‌نظر دین بزرگان خوش نکرد

ایک مثنوی شروع کی جس میں مفصل تاریخ اسلام بیان کرنی چاہی - اس کے آغاز میں فردوسی پر طعن توڑا - یہ الگ بات ہے کہ وہ مثنوی مکمل نہ ہو سکی اس لئے کہ ایک اور مجبوری کا سامنا تھا جس پر غالب غلبہ نہ پا سکتے تھے وہ یہ ایسی مثنوی میں تخیل کی کارفرمائی اور صنعتکاری کی گنجائش نہ تھی - چنانچہ مثنوی کہ ایسی تیار ہوتی جو غالب کی شاعرانہ شان کے مطابق نہ ہوتی- س احتمال کے باعث خدمت اسلام کا سارا جذبہ سو گیا - ان کے مذہب کے معاملے میں بھی ان کی مغلوبیت بارہا جلوہ گر ہوئی - سارے خاندان کا مذہب اہل سنت والا تھا - مگر غالب اپنے استاد ہرمزد یا دوست اور نسبتی بھائی مرزا علی بخش کی وجہ سے شیعیت کی طرف مائل ہوگئے - ایک بار اپنے دوست میر سرفراز علی کو تلقین کر بھیجی کہ قرآن ، فقہ ، حدیث پڑھ کر مولوی بن جائیگا- علی علی کیا کر اور فارغ‌البال رہا کر - میر سرفراز حسین شیعہ عالم تھے - اس سے قطع‌نظر کہ وہ ایک مذہب کے قائل بھی تھے اور پھر اس کے مبادی اصول کا مطالعہ بھی بے کار جانتے تھے- مشورہ یہ دیا کہ فلسفہ پڑھ ، منطق پڑھ ، ہیئت و نجوم پڑھ جو انسان بنا چاہے وہی بات کہ

کعبہ مرے پیچھے ہے ، کلیسا مرے آگے

ہاں اور اس ضمن میں بھی مجبور حالات یعنی غالب و مغلوب کو کچھ دنیا داری سے کام لینا پڑتا تھا - آپ کو یاد ہے کہ ایکبار بہادر شاہ ظفر کو یہ اعلان کرنا پڑا تھا کہ وہ شیعہ نہیں ہیں اور اس موضوع پر غالب ہی سے مثنوی لکھوائی تھی - اسی طرح ایک بار غالب کو پتہ چلا کہ بہادر شاہ ظفر انہیں شیعہ جانتے ہیں تو غالب نے وہ قطعہ کہہ کر اس امر کی تردید کی جس کا آخری مصرعہ ہے ع شیعہ کیسے ہو ماوراءالنہری

یعنی کوئی دریائے جیحوں کے پرلی طرف کا رہنے والا یعنی ترک کیسے شیعہ ہو سکتا ہے - ظاہر ہے کہ خود بہادر شاہ ظفر بھی ماوراءالنہری تھے - غالب نے جانا کہ یوں وہ زیادہ خوش ہوں گے -

ایک اور معاملہ جس کے ہاتھوں غالب بے بس تھے اور جو ان کے لئے خاندانی وجاہت کی پاسبانی ہی کی طرح نازک تھا ۔ وہ اپنی فارسی دانی کا یقین تھا ۔ وہ ہندوستانی نژاد فارسی دانوں میں سے خواجہ امیر خسرو کے قائل تھے ۔ تھوڑا بہت فیضی کی فارسی کو مانتے تھے ۔ کہتے تھے کبھی کبھی میاں فیضی کی بھی ٹھیک نکل جاتی ہے ۔ باقی کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے ۔ ان کے نزدیک لائق سند فقط ایرانی نژاد سخندان تھے ۔ ہندی نژاد فارسی کو فرہنگ نگار اصحاب کا بری طرح ٹھٹھا اڑاتے تھے ۔ مرزا قتیل کو جن کی بنگال و بہار میں بڑی ''مانتا'' تھی ۔ بہار کا کھتری بچہ کہہ کر رد کر دیتے تھے ۔ کوئی دوست یا عزیز اگر غالب کے کسی موقف کے خلاف کسی قدیم استاد کا حوالہ دیتا تو وہ کہہ دیتے تھے ''کیا اگلے وقتوں میں احمق نہ ہوتے تھے''۔ وہ اس معاملے میں ہرگز پروا نہ کرتے کہ کتنے دلوں کو دکھا رہے ہیں حالانکہ ان کا قول یہ ہے کہ ہر گناہ کر مگر مردم آزاری نہ کر ، مگر یہاں پھر مغلوب تھے ۔ اسی زباندانی کے زعم میں نواب کلب علی خاں کو بھی جو ان کے مربی تھے ناراض کر لیا ۔ بعد میں معافی مانگتے رہے ۔ غالب کا اپنی فارسی دانی کے ضمن میں موقف یہ تھا کہ انہوں نے ہرمزد جیسے ایرانی عالم سے فارسی سیکھی ہے جو دو سال ان کے یہاں مقیم رہا ۔ وہ زرتشتی مذہب چھوڑ کر مسلمان ہو گیا تھا ۔ قدیم فارسی پر اسے کامل قدرت حاصل تھی نیز یہ کہ انہوں نے فارسی کا ذوق مبدأ فیض سے وافر پایا تھا ۔ ۔ لوگ ان کے دعوئ استناد کو تسلیم نہ کرتے تھے ۔ اس لئے کہ غالب ترک تھے ، ایرانی نہ تھے اور پھر یہ کہ ہرمزد کے وجود کو فرضی سمجھا جاتا تھا اگر فرضی نہ بھی ہوتا تو جب بھی غالب کو گیارہ بارہ سال کی عمر میں فارسی قدیم و جدید کے جملہ رموز کس طرح ازبر ہو گئے ۔ ۔ مگر غالب اپنے دعوے سے دستبردار نہ ہوئے ۔ یہاں بھی وہ خود ستائی کے ہاتھوں مغلوب رہے ۔

اسی ذیل میں ان کی ایک اور مغلوبیت کا ذکر ضروری ہے وہ یہ کہ اگر ان سے کوئی فارسی زبان کے موضوع پر خطوط میں بھی بحث تمحیص کرتا تو وہ بعض اوقات تلخ کلامی پر اتر آتے تھے اور جملہ وضع داری دھری رہ جاتی تھی ۔ بعض اوقات معذرت کرتے کرتے الٹا چوٹ کر جاتے تھے مثلاً کلکتے میں جہاں وہ پنشن کے قضیے کے باعث مقیم تھے اور عمر اس وقت تقریباً تیس برس تھی یہی فارسی دانی کا جھگڑا شروع ہو گیا ، اور مخالفوں نے ان کو پریشان کر دیا ، غالب نے معذرت کے طور پر مثنوی باد مخالف لکھی اس

میں رقم تھا کہ کسی کی دلشکنی مرادلہ تھی میں سب کا قدردان ہوں اور یہ اور وہ - - لیکن ساتھ ہی اس سب کچھ کے باوصف لکھدیا کہ یہ کیوں ضروری ہو کہ میں دوسروں کی تقلید کروں -

زلہ بردار کس چرا باشم　　　من ہما یم مگس چرا باشم

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد انہوں نے ایک نئی مصیبت اسی مغلوبیت کے باعث کھڑی کرلی - دلی برباد ہو رہی تھی ، عالی شان عمارات کا نشان مٹایا جا رہا تھا - ہر چوک مقتل تھا ، خود ان کے اعزہ اور دوست مفرور ہورہے تھے یا پھانسی پا رہے تھے مگر اس وقت بھی حضرت کے اعصاب اتنے مضبوط رہے کہ برہان قاطع کی غلطیاں نکالتے رہے اور بعد میں انہیں "قاطع برہان" کے نام سے چھپ دیا ، مصنف برہان قاطع کے خلاف بھی تند و تیز کلمات استعمال کئے ، چنانچہ ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا ، جو آخر مرزا غالب کی طرف سے عدالت تک پہنچا ، خود سخت سست کہتے مگر دوسروں کی تلخ کلامی پر جھلاتے اور توہین محسوس کرتے ، اپنی طرف سے یہ عذر پیش کر دیتے کہ میں سپاہی زادہ ہوں لہذا مجبور ہوں کہ درشت کلامی پر اتر آؤں دوسروں کو کیا حق ہے کہ درشت کلامی پر اتریں -

من سپاہی زادہ ام گفتار من باید درشت
وائے پروے گر بتقلید من اینہا کردہ است

اہل نظر یہ بھی کہتے ہیں کہ ذوق کے ساتھ بدمزگی ہو جانے اور بہادر شاہ ظفر کے برا ماننے پر انہوں نے جو معذرت نامہ پیش کیا اس میں معذرت کرتے کرتے ذوق پر مزید چوٹ کر گئے -

استاد شاہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال　　　یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے
مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات　　　منظور اس سے قطع محبت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو رو سیاہ - مگر کس کا روسیاہ ، غالب کا یا جس کی طرف روئے سخن ہے ، - اور پھر مصیبت یہ تھی کہ ذوق کا رنگ سیاہ تھا گویا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا تھا -

اپنے بنائے ہوئے زنداں توڑ نہ سکنا اور خود ساختہ قید بے زنجیر میں مبتلا رہنا تقریباً ہر آدمی کا مقدر ہے - مگر جو زیادہ حساس اور خودرائے ہو اسے زندگی کی مجبوریوں کا نسبتاً زیادہ مقابلہ کرنا پڑتا ہے چنانچہ ان میں سے بعض میں مغلوبیت زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے - عام آدمیوں کی یہ کشمکش یا اذیت واسے بھی منظر عام پر نہیں آتی -

داغ کا نام سن کے وہ بولے
ایسے اسی ہزار پھرتے ہیں

مگر شاعر ، ادیب ، استاد خطیب ، حاکم ، لیڈر قسم کے افراد کا یہ تضاد نما ابتلا کھل کر سامنے آ جاتا ہے اس طرح یہ طبقہ دوسروں کی بہ نسبت زیادہ قیدی ہوتا ہے - سارتر کی وجودیت میں پائے جانے والے "غیر" کی نظریں اس طبقے کو زیادہ چھیدتی ہیں - اس طبقے میں بھی مقابلتاً اہل قلم ذمہ دار ہوتے ہیں اس لئے کہ ان میں سے بعض کو فقط اپنی ہمعصرنسل ہی کے نہیں مابعد کی نسلوں کے روبرو بھی آنا پڑتا ہے - لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بعد میں آنے والی نسلوں کو ایک سہولت ضرور میسر ہوتی ہے اور وہ یہ کہ ان کو عموماً شاعر و ادیب کے افکار سے واسطہ رہ جاتا ہے ، وہ ان کی شخصیت کو پوری طرح سامنے رکھنے کے اہل نہیں ہوتے لہذا انہیں افکار و جذبات کی رعنائی مقابلتاً زیادہ لطف دے جاتی ہے - پھر یہ کہ ماضی خواہ مخواہ رومانی ہو جاتا ہے اس لئے آنجہانی* اہل قلم حضرات بسہولت "بزرگ" بن جاتے ہیں اور ان کی ہرلغزش ، لغزش مستانہ نظر آنے لگتی ہے - ہمعصر - جن اہل قلم کے دشمن ہوتے ہیں ما بعد کی نسلیں بالعموم ان سے پیار کرنے لگتی ہیں -

ع اے بسا شاعر کہ بعد ازمرگ زاد

اس مصرعے کا ایک معنی شاید وہ ہو جو اوپر بیان ہوا - اور یہی باعث ہے کہ مرزا غالب بمرور وقت عزیز سے عزیزتر ہوتے چلے گئے -

غالب اور اسکا فارسی کلام

ڈاکٹر آغا یمین

جب ہم غالب کے فارسی کلام کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے مراد محض اس کا فارسی کلام ہے - جس نے بھی غالب کے کلام کا مطالعہ کیا ہے وہ اس کے کلام سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا اور غالب کو فارسی شاعری کے میدان میں اساتذہ کی صف اول میں لا کھڑا کیا ہے -

نقشہائے رنگا رنگ

خود غالب کو بھی اپنی فارسی شاعری پر اتنا ناز ہے کہ وہ پکار اٹھتا ہے کہ :

فارسی بیں تابہ بینی اقشہای رنگ رنگ
بگزر از مجموعہ اردو کہ بیرنگ منست

یعنی غالب کو اپنے فارسی کلام میں جو رنگ برنگ نقوش دکھائی دیتے ہیں - ان کے مقابلے میں اس کا اردو کلام خود اسے بیرنگ دکھائی دیتا ہے ، حالانکہ غالب کو جو اردو شاعری میں مقام حاصل ہوا ، وہ فارسی میں نہ ہو سکا -

جواہر آبدار

بات دراصل یوں ہے کہ جس زمانے میں غالب ابھرا وہ فارسی کلاسیکی شاعری کا انحطاطی دور تھا ، بالخصوص برصغیر پاک و ہند میں تو مغلیہ سلطنت کے آخری ٹمٹماتے ہوئے چراغ کے ساتھ ہی فارسی زبان جوکہ صدیوں سے اس ملک میں بولی اور لکھی جاتی رہی ، کا چراغ بھی گل ہوگیا - پہلے فارسی زبان شاہی محلوں ، درباروں اور عام سرکاری دفاتر کی زبان رہی ، یہاں تک کہ مغلیہ دور میں عوام بھی اس میں بات کرنا فخر سمجھتے تھے ، لیکن جب مغلیہ دور کے بعد فرنگی دور آیا تو فارسی کی بجائے آہستہ آہستہ انگریزی نے جگہ لے لی اور اس کے ساتھ ساتھ عام فہم اور آسان ہولیکی وجہ سے اردو بھی فروغ پاتی چلی گئی - یہی

وجہ تھی کہ غالب کے دور سے ہی کلاسیکی فارسی شاعری کے انحطاط کا دور شروع ہوگیا اور اردو شاعری عام ہوتی چلی گئی ، لہذا غالب کا اردو کلام ہر شخص پڑھتا اور لطف لیتا ، اس کے برعکس اس کے فارسی کلام پر کم لوگوں کی نگاہ پڑی اور وہ عام نہ ہو سکا ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ غالب کے فارسی کلام کے رنگا رنگ نقوش فارسی شاعری کی گدڑی میں لعل و گوہر کی مانند دبے پڑے رہے ۔ جو فارسی شاعری کی گدڑی پھرول کر دیکھتا اسے تو غالب کے اشعار کے جواہر آبدار دکھائی دیتے ، لیکن عوام کی آنکھوں سے اوجھل رہے ۔

لہذا غالب کا اردو کلام عام ہونے کی وجہ سے اسے اردو شاعری کے میدان میں جو طرۂ امتیاز حاصل ہوا ، وہ فارسی شاعری میں نہ ہوسکا ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر غالب کے فارسی کلام کو آج بھی تراجم کے ذریعے عام کیا جائے تو اس کا فارسی کلام یقیناً فارسی شاعری کے اساتذہ خیام ، انوری ، خاقانی ، مولانائے روم ، سعدی اور حافظ شیرازی کے کلام سے ہم آہنگ ہے ۔

غالب کی جدت پسندی اور حافظ شیرازی

غالب کا تغزل جس طرح اردو شاعری میں موجزن ہے فارسی غزلیات میں اسی جوش و خروش اور شدت جذبات کے ساتھ دکھائی دیتا ہے ۔ علاوہ ازیں حافظ شیرازی کی جدت پسندی کا جذبہ بھی کارفرما ہے ۔ مثلاً حافظ شیرازی کا یہ شعر ملاحظہ ہو

بیا تا گل بر افشانیم و می در ساغر اندازیم فلک راسقف بشکافیم و طرحی نو در اندازیم
اگر غم لشکر انگیزد کہ خون عاشقان ریزد من و ساقی بہم تازیم و بنیادش بر اندازیم
ص ۲۵۸

اس کے بالمقابل غالب کے ہاں بھی حافظ کا سا جوش بیان اور ندرت خیال کا جذبہ موجزن ہے ۔ مثلاً غالب کا یہ شعر

بیا کہ قاعدہ آسمان بگر دانیم
قضا بگردش رطل گران بگردانیم ص ۵۹۲

اسی طرح غالب کی ایک اور غزل کا مطلع ملاحظہ ہو ۔

رفتم کہنگی ز تماشا بر افگنم
در بزم رنگ و بو نمطی دیگرافگنم ص ۵۷۶

غالب نمطی دیگر یعنی طرح نو ڈالنے کا قائل ہے - اس کی یہی جدت پسندی اسے فارسی شاعری میں انفرادیت کا درجہ بھی عطا کرتی ہے - اس کے ہاں جوش بیان ، شدت جذبات اور ندرت خیال کی ہماہنگی حافظ شیرازی کے انداز فکر سے مماثلت رکھتی ہے - مثلاً میدان عشق میں غالب کی قلزم فشانی مژہ ملاحظہ ہو -

قلزم فشانی مژہ از پہلوی دلست
این ابر را برات بدریا نوشتہ ایم — ص ۵۸۳

اور ادھر حافظ شیرازی اپنے اشک گرانمایہ کو گنجہای لعل و گوھر سے یوں تعبیر کرتا ہے -

من کہ یاقوت و لعل اشک دارم گنجہا
کی نظر در فیض خورشید بلند اختر کنم — ص ۲۳۸

نخل شعر غالب

بہت عرصہ پہلے حافظ شیرازی نے برصغیر پاک و ھند کے شاعر حضرت امیر خسرو دھلوی کے متعلق فرمایا تھا کہ

شکر سکن شوند ھمہ طوطیان ھند
زین قند پارسی کہ تا بہ بنگالہ میرود

حضرت امیر خسرو دھلوی کے بعد اسی سرزمین میں اور بہت سے شعرا فلک شعر پر نمودار ھوئے - جن میں سے فیض فیاضی ، عرفی شیرازی ، نظیری نیشا پوری، حمیدی لاھوری ، طالب آملی ، ملا شاہ بدخشی ، برھمن لاھوری ، ملا منیرلاھوری کے نام لئے جا سکتے ھیں - اور انہیں طوطیان ھند کی فہرست میں غالب کا نام بھی پیش پیش دکھائی دیتا ہے - خود غالب اپنے آپ کو نہ صرف طوطی ھند سمجھتا ہے بلکہ اس کے نخل شعر سے بہت سے طوطی ھند پیدا ھوئے ھیں اور وہ اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ میں فارسی شاعری کا ایک وہ درخت ھوں جو اپنی شاخوں پر بجائے رطب یعنی بجائے تازہ پھلوں کے طوطی یعنی شعرا پیدا کرتا ھو یا میں ایک وہ بادل ھوں جو زمین پر پانی کے قطرات گرانے کی بجائے گوھر شعر نچھاور کرتا ھو - وہ کہتا ہے :

نخلم کہ ھم بجائے رطب طوطی آدرم
ابرم کہ ھم بروئے زمین گوھر افگنم — ص ۵۲۶

غالب کا بادۂ تلخ اور عمر خیام

عمر خیام کا فلسفہ مے نوشی متشرقین کے نزدیک محض ابکوابن کے نظریۂ نشاط طلبی کے مترادف ھے ، حالانکہ خیام کا نظریہ مے نوشی نشاط طلبی کے لئے نہیں بلکہ جد و اجتہاد کا فلسفہ حیات پیش کرتا ھے ۔ خیام اس بات کا قائل ہے کہ ھمیں اپنی زندگی میں جو کچھ بھی کرنا ھے ، کر ڈالیں کیونکہ زندگی ختم ہونے کے بعد پھر پچھتانا پڑیگا ۔ اس کے ھاں شراب ، زندگی کی علامت (Symble) ہے جیسا کہ ذیل کی رباعی سے ظاہر ھے کہ

بر خیز بتا و از برای دل ما
حل کن زرہ لطف ھمہ مشکل ما
یک کوزۂ می بیار تانوش کینم
زاں پیش کہ کوزہ ھا کنند از گل ما ص ۲۰۱

کیونکہ خیام انسانی زندگی سے باخبر ھے اس لئے وہ ھمجنس ھر اس انسان سے محبت کرتا ھے جو زندگی کے راز سے آگاہ نہیں اور اسے بڑے پیار سے بتا یعنی محبوب کا خطاب دے کر فلسفہ حیات سے آگاہ کرتا ھے ۔

غالب کا فلسفہ مے نوشی

غالب کا فلسفہ مےنوشی خیام کے فلسفہ مےنوشی سے ھٹ کر ہے ۔ وہ شراب نشاط طلبی کے لئے نہیں بلکہ غم کو بھلانے کے لئے پیتا ھے ۔ اس کا فلسفہ مےنوشی اردو اور فارسی دونوں اشعار میں ملتا ھے ۔ مثلاً اردو میں وہ خود اس فلسفے کو یوں آشکار کرتا ھے :

مے سے غرض نشاط ھے کس رو سیاہ کو
اک گونا بیخودی مجھے دن رات چاھئے

کیونکہ غالب نشاط طلبی کے لئے نہیں بلکہ غم بھلانے کی خاطر پیتا ھے اس لئے وہ اس بادہ تلخ کا متلاشی ھے جس کا نشہ دیرپا ھو ، اور اس فلسفہ مےنوشی کو اس نے ذیل کے فارسی شعر میں یوں واضح کیا ھے ۔

تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر
بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم ص ۳۵۳

بادہ نوشی کا یہ انداز غالب نے جس اچھوتے طریقے سے کیا ہے شاید ہی کسی شاعر نے کیا ہو - اوپر کے شعر میں وہ کہتا ہے محض اس خیال سے کہ جتنا بھی شراب زیادہ تلخ ہوگی اتنا ہی سینہ زیادہ زخمی ہوگا تو میں اپنا سینہ زخمی کرنے کی غرض سے شراب پینے کے کانچ کے پیمانے کو شراب میں پگھلا کر اپنے ساغر میں انڈیلتا ہوں ، تاکہ ختم ہو جاؤں اور اس غم سے نجات ملے -

غالب کا فلسفہ مےنوشی راستگوئی اور بیباکی پر مبنی ہے - غالب دوسرے شعرا کی طرح شراب کو (Symble) علامت کے طور پر استعمال نہیں کرتا ، بلکہ جب وہ شراب پیتا ہے تو وہ یقیناً شراب مادی ہی پیتا ہے - وہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے مےنوشی کو گناہ بھی سمجھتا ہے لیکن جب غم و آلام کے بادل اس کے ذہن پر چھا جاتے ہیں تو انہیں دور کرنے کے لئے اس کے بغیر اسے اور کوئی چارہ بھی دکھائی نہیں دیتا - وہ کسی پر ظلم و ستم کرنے یا کسی کے مال پر ڈاکا ڈالنے کے مقابلے میں شراب نوشی کو زیادہ گناہ اس لئے تصور نہیں کرتا کیونکہ شراب نوشی سے خود اس کی ذات کو تو نقصان ضرور ہے لیکن وہ بندگان خدا کو دکھ نہیں دیتا - وہ خود کہتا ہے کہ یہ تو تم جانتے ہو کہ میں کافر نہیں ہوں اور نہ ہی آتش پرست ہوں - اور اسے اپنے گناہ مےنوشی کا احساس اور اعتراف بھی ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اسی شراب نوشی کی وجہ سے وہ قبر کی آگ میں جلےگا ، لیکن محض اس لئے کہ غالب اندوھگین کے لئے شراب اندوہ ربا یعنی غم کو دور کرنے والی ہے، وہ پیتا ہے -

غالب نے فلسفہ مےنوشی کے ان افکار کو مثنوی ناتمام موسوم بہ ابر گہر بار میں یوں پیش کیا ہے ،

ص ۱۲۴

پرستار خورشید و آذرنیم	ہانا تو دانی کہ کافرنیم
نبردم ز کس مایہ در رہزنی	نکشتم کسی را باھر یمنی
ہنگامہ پرواز مورم ازوست	مگر مے کہ آتش بگورم ازوست
چہ میکردم ای بندہ پرور خدائی	من اندوھگین و می اندوہ ربای

پھر کہتا ہے کہ اگر شراب نوشی کا حساب لینا ہے تو جمشید ، بہرام اور پرویز ان شاھنشاھان ساسانی ایران سے لے - جنھوں نے محض شراب عیش و نشاط کی خاطر پی ہے ، اور مجھ جیسے سے نہیں جس نے کبھی کبھی پی اور پھر وہ بھی محض غم بھلانے کے لئے رو سیاہ کیا ، اسے یوں بیان کیا ہے :

حساب مے و رامش و رنگ و بوی ز جمشید و بہرام و پرویز جوی ص ۱۴۳
کہ از بادہ تا چہرہ افروختند دل دشمن و چشم بد سوختند
نہ از من کہ از تاب مے گاہ گاہ بدر یوزہ رخ کردہ باشم سیاہ

غالب اور فلسفہ ہمہ اوست

غالب دل سے تو فقیر اور صوفی منش تھا لیکن زمانۂ ناسازگار اور تجربات زندگی نے اسے رند اور مرد بینا بنا ڈالا تھا۔ صوفی منش ہونے کی حیثیت سے وہ فلسفہ وحدت‌الوجود یعنی ہمہ اوست کا قائل ہے۔ جیسے ایک شاعر ہونے کی حیثیت سے اقبال آسمان کی سیر کرتا اور خدا سے باتیں کرتا تھا اسی طرح غالب نے بھی خدا سے باتیں کی ہیں مثلاً ایک قصیدے کا آغاز یوں کرتا ہے کہ:

دوش در عالم معنی کہ ز صورت بالاست عقل فعال سرا پردہ زد و بزم آراست ص ۲۱۵
خوانداز دیدہ وری دیدہ وران را بہ بساط تا بہ بینند کہ اسرار نہانی پیداست
راز ہفت اختر و نہ چرخ پژوہند اینجا در دبستان نتوان گفت کہ پرسش غوغاست
بر لب راز پژوہان اسزد مہر سکوت ساقی میکدۂ ہوش زبان گویاست

جب میں نے میکدۂ ہوش کے ساقی سے یہ سوال کیا کہ کثرت اور وحدت کا کیا فلسفہ ہے تو اس نے بتایا کہ لہر، جھاگ اور گرداب اگرچہ بظاہر جدا ہیں لیکن وہ سب ملا جلا کر ایک سمندر ہے، اور اس فلسفہ وحدت الوجود یعنی ہمہ اوست کو محض ایک شعر میں یوں بیان کیا ہے۔

گفتم از کثرت و وحدت سخنی گوئی ہر مز گفت موج و کف و گرداب ہمانا درپاست ص ۲۱۶

اسی طرح ایک غزل کے مقطع میں غالب نے الف کی منطقی دلیل دے کر بھی فلسفہ وحدت‌الوجود کو یوں ثابت کیا ہے۔

غالب الف ہمان علم وحدت خودست ص ۳۵۸
ہر لاچہ ہر فزود گر الا نوشتہ ایم

غالب نے اسی فلسفہ وحدت الوجود کو مثنوی گہربار میں وضاحت سے یوں پیش کیا۔

نفسہای بسودای او نالہ خیز جگر ہا بہ صحرای او ریز ریز ص ۱۱۴
رگ ابر را اشکباری ازوست دم برق را بیقراری ازوست
زبانہای خاموش گویای او نہان ہای اندیشہ پیدای و ا

زهی هستی محض و عین وجود — که نازد بیکتائیش هست و بود — ص ۱۱۵
بر لب که جوئی نوائی ازوست — بہر سرکه بینی هوای ازوست — ,,
کدا می کشش کاںازاں سوی نیست — بد و نیک را جز بوی روی نیست — ص ۱۱۶
جہاں چیست آئینۂ آگہی — فضای نظر گاہ وجہ اللہی — ,,
نہ ہر سو کہ رو آوری سوی اوست — خود آں رو کہ آوردہ روی اوست — ,,
زہر ذرہ کاری بہ تنہایش — نشاں بازیابی ز یکتایش — ,,
چو این جملہ را گفتۂ عالم اوست — بہ گفت آنچہ ہرگز نیایدھم اوست — ,,

غالب ، رومی اور ''فلسفہ نے''

غالب فطرتاً راستگو ہے اس لئے جب وہ ''فلسفۂ نے'' بیان کرتا ہے تو اقبال کی طرح رومی کو ہی اپنا استاد مانتا ہے - لہذا اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے کہ اس نے یہ ''فلسفہ نے'' رومی سے لے کر ہم تک پہنچایا - مثنوی موسوم بہ سرمۂ بینش کا آغاز یوں کرتا ہے -

من لیم کز خود حکایت میکنم — از دم مردی روایت میکنم — ص ۶۹
از دم فیضی کز استاد آورم — خامہ را چوں نے بفریاد آورم

غالب کا ''فلسفہ نے'' اسی نہج پر قائم ہے جس پر مولانائے روم کا ''فلسفہ نے'' ہے - غالب کی اس مثنوی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں -

نالۂ نے از دم مرد رہست — کاں ہم از ساز و ہم از راز آگہست — ص ۶۹
برنوائی راز حق گر دل نہی — بایدت چون نے زخود بودن تہی

ای کہ از راز نہاں آگہ نۂ — دم مزن از رہ کہ مرد رہ نۂ
دست در دامان مرد راہ زن — لیک رہبر را شناس از راہزن
مرد رہ باید کہ باشد مرد عشق — لب ترنم خیز و در دل درد عشق

بالفاظ دیگر غالب کا تمام ''فلسفہ نے'' فلسفہ خود شناسی پر مبنی ہے ، اس اعتبار سے غالب اور اقبال مولانائے روم کے مکتب فکر کی ایک قطار میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں -

خاقانی ، عرفی اور غالب

جس طرح غالب فارسی شاعری کے میدان غزل میں حافظ کے ساتھ ساتھ چلتا دکھائی دیتا ہے ، اسی طرح قصاید میں بھی خاقانی اور عرفی ایسے جلیل القدر

اساتذہ کے ساتھ ساتھ رواں دواں نظر آتا ہے - مثلاً خاقانی شروانی کا یہ شہرۂ آفاق قصیدہ ملاحظہ ہو :

صبحدم چون کلہ بند و آہ دود آسای من — چون شفق در خون نشیند چشم شب پیمای من ص ۲۸۹
مجلس غم ساختہ است و من چو بید سوختہ — تا بمن راوق کند مژگان می پالای من

اور اسی زمین میں عرفی نے بھی ایک نعتیہ قصیدہ کا آغاز یوں کیا ہے -

صبحدم چون در دمد دل صور شیون زای من — آسمان صحن قیامت گردد از غوغای من ص ۲۵
گوش اہل آسمان و حلقۂ ماہم یکسیت — شیونم تا برکشید آہنگہا یا ہای من

غالب نے بھی اسی زمین میں عرفی کے مصرع ثانی کا حوالہ دیتے ہوئے قصیدہ کہا ہے۔ جس کا مطلع یہ ہے :

زان نمی ترسم کہ گردد قعر دوزخ جای من — وای گر باشد همین امروز من فردای من ص ۴۰۳

غالب کے اس قصیدے کے دوسرے اشعار بھی ملاحظہ ہوں :

بسکہ در بند گرانم تن زہم پاشیدہ است — ص ۴۰۴
روز حشر از خاک خیزد فرد فرد اعضای من

روز گارم را بنا کامی شماری دیگر ست
خود پس از روز شمار آید شب یلدای من
چون جرس کانرا بتاری بستہ آویزان کنند
نالہ می خیزد چو میجنبد دل درد ای من
آن فغان سنج کہ ہم در علم حق پیش از ظہور
خواب از چشم ملائک رفتہ از غوغای من
اینکہ در نطقم روانی دیدۂ دانی کہ چیست !
میخورم خون دل و میرلدد از لبہای من

رند درد آشام غالب نام در ساقیگری — ص ۴۰۴
پارۂ مشک و گلاب افزود در صبہای من

غالب کے فلسفہ غم اور جوش بیان کی وہی کیفیت ہے جو خاقانی شروانی اور عرفی شیرازی کی ، خاقانی شروانی تو اپنی آہ دود آسا کے توسل سے آسمان

ہر صبح کے وقت غم و آلام کے خیمے گاڑتا ہے اور ادھر عرفی شیرازی اپنے صور دل سے نکلی ہوئی چیخ و پکار سے آسمان کو صحن قیامت بنا ڈالتا ہے ان کے بالمقابل غالب غم و آلام کے بند گران سے اتنا چور چور ہو چکا ہے کہ روز حشر اس کے جسم کا ایک ایک ٹکڑا فریادی بن کر اٹھے گا ، اور پھر یہی ہی نہیں بلکہ غالب کی آہ شرر بار میں وہ تاثر ہے کہ فرشتے بھی اس کی آہوں کے شور سے چونک پڑتے ہیں ۔

غالب کا فارسی کلام ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے ، اس قعر دریا میں جو بھی غواصی کریگا ، ابرھای گہربار نکال لائے گا ، اور اس کے چمن شعر میں رنگ برنگ کے نقوش دیکھے گا ، لہذا اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ غالب کا یہ دعویٰ کہ

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ھای رنگ رنگ

غلط نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی ہے ۔

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشک فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

غالب اور بودلیئر کے نغمہ ہائے غم

ڈاکٹر لئیق بابری

غالب اور بودلیئر کی حساس روحیں نیکی اور بدی کے درمیان بہادرانہ کشمکش کے دوران شر کے جال میں جا پھنستی ہیں، اور ان کے دکھ کی آواز ان کے درد، کرب، اور حسرتوں اور یاس کی گونج ان کے اشعار میں جگہ جگہ ملتی ہے -

"خوشیوں سے لبریز دیوی! کیا تمہیں اس کرب اور اضطراب کا علم ہے، کیا تم ندامتوں، حسرتوں، آھوں، بیتابیوں سے واقف ہو، اور ان بھیانک راتوں کے موھوم ظلم کو جانتی ہو، جو دل کو اس طرح پامال کرتی ہیں جیسا کہ کوئی کاغذ کو ھاتھ میں لے کر مسل دے"- (بودلیئر)

اس کرب میں رات دن اپنا فرق کھو بیٹھتے ہیں، اور غالب کے لئے تو یہ دن اتنے ھی سیاہ ہیں جتنا کہ راتیں، وہ ایک ابدی اداسی میں کھو جاتا ہے:

جہاں میں ھو غم و شادی بہم ھمیں کیا کام
دیا ہے ھم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں (غالب)

اس تکلیف دہ مسئلہ کے سامنے کڑواھٹ کا جذبہ جنم لیتا ہے - زندگی آسیب بن جاتی ہے - کرب دونوں شاعروں کی روح میں ڈیرے ڈال دیتا ہے - خود فطرت اڑھکتی ہوئی روحوں کے خلاف سازش پر آمادہ نظر آتی ہے اور ان پر سیاہ سایہ بن کر منڈلاتی ہے:

"اور مردوں سے بھرے ہوئے لمبے چھکڑے، بغیر ڈھول کے، بغیر کسی ماتمی موسیقی کے میری روح میں صف بستہ کھڑے ہیں، مغلوب امید رشک افشاں ہیں اور مطلق العنان ظالم کرب نے میرے خمیدہ سر پر سیاہ جھنڈا گاڑ دیا ہے -" (بودلیئر)

غالب اپنا حال یوں کہتا ہے :

شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر و بال دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

غالب بودلیئر کے ساز غمگین دھنیں الاپتے ہیں - اسی وجہ سے ان پر قنوطیت کا الزام لگایا جاتا ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ فرانسیسی شاعری میں بودلیئر اور برصغیر ہندو پاکستان میں غالب دو ایسی صدائیں ہیں - جن کی یاس اور دردناکی کی مثالیں بہت کم ملیں گی - اور ہمیں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے بودلیئر نے انسانی رنج و غم پر حرف آخر کہہ دیا - مگر یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ یہ نغمہائے غم ان کے جالیاتی اور اخلاقی نصب العین کے عدم حصول کی پیداوار ہیں - یہ ابد کی تلاش میں دو انسانوں کی آواز ہے جن کی امنگیں حادثات کی زد میں ہیں جن کا حسن پرست احساس زخمی ہے - ایسے میں بیزاری اور بے قراری کے نغمے نہ نکلنا ، بلکہ خوشی و مسرت کے گیت اکلنا خلاف حقیقت ہوگا -

"الوداع ، باجے کے گیتو ، بانسری کی آہلو ، خوشبو ، اداس اور روٹھے ہوئے دل پر دستک نہ دو ، میرے لئے بہار کی رعنائی اب مہک کھو بیٹھی ہے -" (بودلیئر)

غالب کو سنیے :

محبت تھی چمن سے ، لیکن اب یہ بیدماغی ہے
کہ موج بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

اور

غم فراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

نصب العین کے فراق میں ان کا جسم ان کی روح کا ہمنوا نہیں بنتا - انسانی طبیعت کی دو رخی ، جسمانی و روحانی متضاد خواہشیں اسے چیر ڈالتی ہیں - غالب اور بودلیئر کی توجہ اس امر پر مرکوز ہوتی ہے کہ ان دونوں دشمن قوتوں میں ہم آہنگی پیدا ہو - لیکن انسانی طبیعت کی کج روی ، شر کی طرف رغبت ، جسم اور روح کے درمیان ایک ناقابل علاج زخم پیدا کرتی ہے - اس کا اظہار اپنے سے بیزاری کی صورت میں ہمیں دونوں شعرا کے ہاں نظر آتا ہے۔ خیر کا دامن پکڑنے

اور شر سے دور بھاگنے کی جستجو انہیں بے قرار رکھتی ہے :

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

یا پھر

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

بودلیئر کی کیفیت اس کے اپنے الفاظ میں ملاحظہ ہو :

"ہر ایک سے بیزار ، اپنے آپ سے بیزار ، میں رات کی خموشی اور تنہائی میں کھو کر ، گناہوں سے نجات پا کر مغرور ہونا چاہتا ہوں ، اے روحو ، جن سے میں نے محبت کی ہے ، جن کے میں نے گیت گائے ہیں ، مجھے تھام لو میری ڈھارس بندھاؤ ، مجھ سے جھوٹ ، اور اس دنیا کی غلیظ ہوا کو دور کر دو ، اور اے میرے آقا ، میرے خدا مجھے چند اشعار لکھنے کی توفیق دے جن سے مجھے یہ ثابت ہو سکے کہ میں سب سے ذلیل انسان نہیں ہوں ، اور میں ان لوگوں سے گھٹیا نہیں ہوں ، جن سے مجھے نفرت ہے"

یا پھر

"آہ خدایا ! مجھے قوت دے ، مجھے ہمت دے کہ میں اپنے دل اور جسم پر بغیر بیزاری کے غور و فکر کر سکوں ۔"

غالب کی شاعری جہاں غم کے ایسے ہی نغموں سے بھرپور ہیں ۔ وہاں اس کے خطوط میں یہ خصوصیت بھی بہت نمایاں ہے کہ وہ ہنسنے کے مواقع پیدا کرتا رہتا ہے ۔ یہ بات شاید اس شخص کی زندگی میں بڑی متضاد معلوم ہو جسے دکھوں کا وافر حصہ ملا ہو ۔ مگر ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ غالب کا قہقہہ ایک زخم خوردہ انسان کا قہقہہ ہے ۔ جو قہقہوں کے پیچھے اپنے دکھ کو چھپائے پھرتا ہے۔ ایسے ہی قہقہوں کے بارے بودلیئر کہتا ہے کہ یہ انسانی غصے کا ایک دھماکہ ہیں ۔ غصے کے اس دھماکے کا نشانہ شاعر کی اپنی ذات ہی بنتی ہے ، غم کی دلدلوں میں پھنس جانے پر غالب کی شخصیت دو حصوں میں بٹ جاتی ہے ۔ اور ایک حصہ دوسرے حصہ کے نفسانی مظاہر کا غیر جانب دار تماشائی بن جاتا ہے ۔

"آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں ، رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے آپ کو اپنا غیر تصور کیا ہے جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں کہ لو غالب کو ایک اور جوتی لگی ، بہت اتراتا تھا کہ بڑا شاعر اور فارسی دان ہے ، آج دور دور تک میرا جواب نہیں ، سچ تو یہ ہے کہ غالب کیا مرا بڑا ملحد مرا ، بڑا کافر مرا ۔"

اپنے اوپر بیدردی سے ہنسنے کی مثالیں غالب کے غم کی لامحدود وسعتوں کا ثبوت ہیں ، یہ غم اور زیادہ مہلک صورت اختیار کر جاتا ہے جب بودلیئر اور غالب کو اس بات کا محکم احساس ہو جاتا ہے کہ کوئی بھی انہیں غم کی اس پکڑ سے نجات نہیں دلا سکتا ، پھر ان کے لئے غم کا موسم ابدی ہے ۔

"پیرس رنگ بدلتا ہے ، مگر میری روح میں کوئی تبدیلی نہیں آتی ۔"
(بودلیئر)

اور بقول غالب :

خزاں کیا فصل گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں ، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

ایک بات جو قابل تعجب ہے وہ یہ ہے کہ غالب بھی بودلیئر کی طرح اپنے دکھ میں ایک لذت محسوس کرتا ہے اور اپنے ہی پھوڑوں کو کریدنے میں خوشی محسوس کرتا ہے ۔

"درد کو ایک حقیقی لذت سے لبریز کرنے کے لئے
اپنے دکھ کو خون سے آلودہ کرو، اپنے زخم کو کریدو" (بودلیئر)

اور بقول غالب :

دوست غمخواری میں مری سعی فرمائینگے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئینگے کیا

خود سزائی کے اس شوق میں غالب ننگے پاؤں کانٹوں پر دوڑنے کے لئے آمادہ ہے :

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یا رب
اک آبلہ پا وادیٔ پر خار میں آوے

چونکہ شاعر کو درد سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کی خواہش ہے تو وہ نہیں چاہتا کہ زخموں کے ہونٹ سل جائیں، زخم مندمل ہوں، اور آرام نصیب ہو، زخموں کو سلانے کی حاجت تو اور زیادہ درد کے نشے میں سرشار ہونے کا ایک بہانہ ہے:

رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سوزن کی
سمجھیو مت کہ پاس درد سے دیوانہ غافل ہے (غالب)

خود سزائی کی ایسی مثالیں بودلیئر کی شاعری میں کثرت سے ملتی ہیں:

"میں خود ہی خنجر ہوں اور خود ہی زخم
خود ہی گال ہوں اور خود ہی طمانچہ
خود ہی پہیہ ہوں اور خود ہی ٹانگ
خود ہی قاتل ہوں، اور خود ہی مقتول"

اور

"انسانی ظلم روپوش ہوا، اور اب میں اپنے ہی ہاتھوں دکھ سہوں گا"

جب نصب العین کی فتح مشکل نظر آتی ہے، اور درد دونوں شاعروں کو ہمیشہ جھنجھوڑتا ہے، تو وہ سوچتے ہیں کہ انسان اس دنیا میں شاید اس لئے بھیجا گیا ہے کہ دکھ کا بوجھ اٹھائے، غالب اپنی تاریخ پیدائش کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"ہر چند قاعدۂ عام ہے کہ آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں، چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں رو بکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا"

بودلیئر جو قضا و قدر میں یقین نہیں رکھتا تھا، جلد ہی اس پر ایمان لے آتا ہے:

"اپنی لکھی ہوئی قسمت میں ہی میرے لئے خوشی ہے، میں اسے لبیک کہوں گا، میں ایک اطاعت شعار شہید، معصوم مجرم ہوں، جس کے شوق کی تپش سزا کو اور تیز کرتی ہے"

وہ سمجھتا ہے کہ خدا نے اُسے مصوری کا پیشہ سونپا ہے ، اور اُس کی قسمت میں انسانی غم کے نقوش بناتا ہے :

"میں ایک مصور ہوں ، جسے ایک لا پرواہ خدا نے اندھیروں پر مصوری کرنے کی سزا دی ہے" ۔

اس مختصر مقالہ میں غالب کے دکھ اور بودلیئر کے غم کے مختلف پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ مشکل ہے ، بہرحال دونوں شاعروں کے غم کی ظاہری صورت میں بعض اوقات قدرے فرق نظر آتا ہے بودلیئر کے غم کو ennui اور Spleen کے الفاظ سے موسوم کیا گیا ہے ، Spleen ایک طرح کی بیماری ہے ، ennui ایک طرح کی نفرت ، Spleen ایک طرح کا روحانی فالج ہے ، ennui ایک درد ہے جس کے ساتھ سوزش بھی شامل ہے ، یہ ایک طرح کا اضطراب ہے ، مگر فرانسیسی زبان میں یہ الفاظ بغیر کسی فرق کے استعمال ہوتے ہیں ، اور دونوں سے ایک جیسی روحانی کیفیت کے بیان کا کام لیا جاتا ہے - بودلیئر کی Spleen میں اعصاب کے کھچاؤ کی کار فرمائی ہے - جیسا کہ وہ خود لکھتا ہے :

"میرے کھچے ہوئے اعصاب پر درد اور بے آہنگ آوازیں دینے لگتے ہیں"

بودلیئر کی سپلین ، جسمانی عارضے سے بھی متعلق ہے ، مگر ہمیں غالب کے ہاں اس قسم کے اعصابی عارضے کی کوئی شہادت نہیں ، مگر دونوں شاعروں کے دکھ کے سرچشمے ایک مستقل گہری مابعدالطبعیاتی بے قراری میں ہیں ، اگرچہ غالب کے غم کی شدت ناقابل بیان ہے ،

آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوز غمہائے نہانی اور ہے

مگر ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ بودلیئر کی Spleen بھی بڑی ہی تند ہے ، اور غالب کے درد سے زیادہ کڑوی ، غالب کے درد میں ایک طرح کی مٹھاس اور رسیلہ پن ہے مگر بات پھر وہی کہنی پڑتی ہے کہ دونوں شاعروں کا مسئلہ ایک ہی ہے ، جیسے اُن کی روحوں کے اردگرد مکڑے نے جال بن دیا ہو ، اور ان کی تمنا محض وہاں سے بھاگ نکلنا ہو :

''روشنی اور کنجی کی تلاش میں اس سانپوں بھری نگری سے کہیں دور نکل جائیں" (بودلیئر)

غالب اور بودلیئر کی پاس رومانوی شاعروں کی پاس نہیں ، جو فرط انبساط سے ندی کے کنارے آنسو بہا رہے ہوں ، ان کی Spleen اور ennui شر کے تباہ کن سیلاب کے خلاف احتجاج ہے ، ان کی پاس کے یہ لمحات وجد کی کیفیت نہیں ، بلکہ شکست کی آواز ہے :

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

یہ دکھ ، یہ درد ایک زخمی انسان کی گھٹی ہوئی آواز ہے جوکہ نصب العین کے حصول میں پے در پے شکست کھا رہا ہو ۔

”میری روح اس ڈھول کی طرح ہے جس کے اوپر سیاہ کپڑا باندھ دیا گیا ہو ، اور جب وہ اپنے دکھ میں گیتوں سے رات کی خنک ہوا کو مسحور کرنا چاہے ، تو اس کی نحیف آواز ایسی ہو جیسے کسی زخمی انسان کی بھرائی ہوئی آواز جسے کوئی بھول کر پیچھے چھوڑ گیا ہو ۔“ (بودلیئر)

غالب اور بودلیئر اس درد کی کیا توجیہہ کرتے ہیں ؟ دونوں شاعر خدا سے اپنے درد کا شکوہ کرتے ہیں ، مگر ان کا شکوہ اس بچے کی طرح ہے جو ماں سے اس کی سختی کی شکایت کرتا ہے ، بچہ ناشکرا نہیں ہوتا ، اپنی ماں کی شفقت سے بھی بے خبر نہیں ہوتا ، وہ جب بلوغت کو پہنچتا ہے تو یہ سمجھنے کے قابل ہوتا ہے کہ ماں کا طمانچہ اس کی اخلاق آرائش ، تعلیم اور بہبودی کی خاطر تھا ۔ غالب بھی جانتا ہے کہ درد زرخیز ہے :

اہل بینش کو ہے طوفان حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیٔ استاد نہیں

بودلیئر بھی بخوبی جانتا ہے کہ اس کا درد انسان کی روحانی افزائش کے لئے ضروری ہے ، اس کی اخلاق تکمیل مقصود ہے :

”لوانا دیوی ، جس بشر کی نگہبانی کرتی ہے ، اس کو اقبال مند کرتی ہے ، مگر ظالمانہ طریقوں سے ، یہ اچھی دایۂ ہے رحم ، سخت گیر ہے ، انسان کی تکمیل کے لئے جو طریقے وہ اختیار کرتی ہے ان میں سے سب سے زیادہ پسندیدہ درد ہے ۔“ (بودلیئر)

غالب خود یہ سمجھتا ہے کہ وہ واقعی دنیا کی اس قید کا مستحق تھا ، اس کے نزدیک کوے اور گدھ صیاد کے ہاتھ آئیں تو چھوڑ دیئے جاتے ہیں - مگر ایک بلبل قابو آئے تو اس کے پردرد نغمے سننے کے لئے اسے پنجرے میں ڈال دیا جاتا ہے - شدید درد شاعر کی عظمت کا ثبوت ہے :

در خور قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا (غالب)

غالب اور بودلیئر دونوں ہی درد کی شرافت ، اور اس کے شاہانہ حسن کے مداح ہیں ۔

"میں جانتا ہوں کہ درد سر تا سر شرافت ہے ۔" (بودلیئر)

غالب دکھ کا بوجھ سر پر اٹھائے چلتا ہے تو کراہتا ضرور ہے مگر یہ خیال اس کی ڈھارس بالدھتا ہے کہ اسے اس کا معاوضہ ملنے والا ہے ، روحانی ارتقا کی صورت میں ، یہ ارتقا مشکلات اور رکاوٹوں کے سر کرنے سے ہی حاصل ہوتا ہے ، مشکلات جوکہ بیرونی نہیں اندرونی ہیں ، بودلیئر تو کبھی اپنے دکھ پر خدا کا شکر ادا کرتا ہوا نظر آتا ہے :

"خدایا زندہ و پائندہ رہو ، جو دکھ تم مجھے دیتے ہو وہ میری غلاظتوں کا روحانی علاج ہے ، وہ ایک بہترین اور پاک جوہر کی طرح غازیوں کو مقدس لذتوں کے لئے تیار کرتا ہے ۔" (بودلیئر)

درد طہارت ہے ، درد دونوں شاعروں سے ہستی کے داغ دھو ڈالتا ہے اور ان کے فطری وقار کو بحال کرتا ہے ، غالب چونکہ اپنے درد کی اس قدر و قیمت سے پوری طرح آگاہ ہے ، اپنے دل سے یوں مخاطب ہوتا ہے :

دلا یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر
نہ گریۂ سحری ہے ، نہ آہ نیم شبی ہے

بودلیئر اور غالب سمجھتے ہیں کہ شاعر کو چاہئے کہ درد کو حسن میں تبدیل کرے ، وہ چاہتے ہیں کہ درد فن کی تکمیل میں معاون بنے ، وہ انسان جنہوں نے رومانی زندگی کی چوٹیوں کو چھوا ، پہلے درد کے تختۂ مشق بنے ، محض اسی آگ نے انہیں زندگی کے رازوں سے آشنا کیا ، بودلیئر لکھتا ہے ،

"اگر کچھ حاصل کرنا ہے تو تنور میں سے ہوکر گزرو"

اور یہ بات حق ہے کہ غالب زندگی کے اسی تنور میں سے ہوکر گزرا ، آگ کی جلن نے اسے زندگی کی راہوں سے آگاہ کیا ، اسے انسان کے اس حقیقی

سرچشمے کی راہ بتائی ، جہاں شاعر کی روح اس بحر بیکراں میں جا ملتی ہے جو اس کا منبع ہے اور جس کی طرف ایک فرانسیسی نقاد نے اشارہ کیا ہے :

"شاعر اپنے آغاز اور اپنے انجام سے واقف ہونے کی وجہ سے اپنا اصلی وطن اس روحانی دنیا میں ڈھونڈھتا ہے جہاں ساری فطرت غوطہ زن ہے، اور شاعری کا مقصد یہی ہے کہ ہم پر دوسری دنیا کی کھڑکی کھول دے ، وہ دنیا جو ہماری اصل دنیا ہے اور ہمارے نفس کے لئے یہ ممکن بنا دے کہ وہ اپنی حدود کو پھاند سکے اور لا محدود تک پھسل جائے" -

شاعر کے نصب العین کا سمبل یہی گمشدہ جنت ہے جس کی وہ تلاش کرے گا یا یوں کہئے ، جس کی اپنے فن کے سہارے تعمیر کرے گا ، اسی وجہ سے وہ اس دنیا میں پردیسی ہے :

"تو آخر تمہیں کس سے محبت ہے اے عجیب پردیسی ؟ ۔ ان بادلوں سے ... وہ بادل جو منڈلاتے پھرتے ہیں ، دور ... دور ... وہ شالدار بادل" (بودلیئر)

شالدار بادلوں کی طرف اٹھتی ہوئی دونوں شاعروں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرپور ہیں ،

کئی دن ہوئے کہ ایک فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور زمزمہ پرداز بھی ، ایک غزل میری کہیں سے لکھوا لایا ، اس نے جو وہ کاغذ مجھے دکھایا یقین سمجھنا کہ رونا آیا ، غزل تم کو بھیجتا ہوں :

درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا (غالب)

ہم جانتے ہیں کہ یہ آنسو خوشی کے آنسو تو نہیں ، یہ آنسو جیساکہ بودلیئر لکھتا ہے

ایک پرہیجان افسردگی کی شہادت میں ، اعصاب کا استدلال ہیں ، اور اس فطرت انسانی کے گواہ ہیں جوکہ ایک ناقص دنیا میں جلا وطن کر دی گئی ہو ، اور فوراً ہی اس زمین پر ایک الہامی جنت سے لپٹ جانا چاہتی ہو"

غالب اور بودلیئر کے نغمہ ہائے غم ، دنیا میں اسی جنت کی تلاش ہیں ،

غالب خستہ

ڈاکٹر محمد اجمل

یہ مختصر سا مقالہ میں نے اس لئے نہیں لکھا کہ غالب کے ذہن میں کسی قسم کی طمانیت یا ذہنی مرض تلاش کروں ، غالب کی سخنوری کا مقام بہت بلند ہے لیکن جا بجا یہ احساس ہوتا ہے کہ اس سے بلند تر مقام حاصل کرنے کی کوشش اور آرزو کے باوجود غالب کی شخصیت میں بعض عناصر اور محرکات ایسے بھی ہیں کہ ان کی وجہ سے وہ اعلیٰ مقام شاید حاصل نہیں کر سکے - تخلیقی عمل آگہی اور شعور کو متمول اور پہلودار بناتا ہے - اس کے باوجود جب انسان آگہی کو ''انا'' میں مدغم کر دے تو سخنوری پیغمبری کا جزو نہیں بنتی - میں صرف ان محرکات اور عناصر کا ذکر کروں گا جن کی وجہ سے بہ رشک عرفی و فخر طالب ہزاروں نفسیاتی حقائق کو ژرف بینی اور باریک نظری سے بیان کرنے کے باوجود تشنگی کا احساس چھوڑ جاتا ہے - یہاں میں یہ بھی کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ غالب نے جن نفسیاتی حقائق کا با کمال حسن سے بیان کیا ہے ان میں اکثر و بیشتر وہ حقائق ہیں جو دفاعی حیثیت رکھتے ہیں - سپردگی اور روحانی تغیر کے متعلق جو بصیرتیں شخصیت میں قبولیت اور انقلاب سلبی و ایجابی پہلوؤں کا امتزاج پیدا کرتی ہیں ، وہ غالب میں کسی قدر کم نظر آتی ہیں -

میرزا غالب کے متعلق کچھ کہنے کی جسارت محض اس لئے نہیں کر رہا کہ "سخنہائے گفتنی دارم" اور اس لئے بھی نہیں کر رہا کہ غالب کی شاعری کے متعلق جو متضاد مدارس فکر ہیں - ان میں سے کسی کی حمایت یا مخالفت کروں ، مجھے نہ ڈاکٹر شوکت سبزواری اور اثر لکھنوی کے درمیان مناظرے سے سروکار ہے اور نہ قاضی عبدالودود اور مالک رام و غیرہم کے اختلاف یا اختلافات سے - میں تو بہت اختصار کے ساتھ غالب کے فقط چند شعروں کا حوالہ دے کر کچھ ان کے اجزائے نفس کا تجزیہ کروں گا یہ تجزیہ فقط ایک پہلو کا ہوگا -

کہتے ہیں کہ غالب کا کوئی استاد نہیں تھا اور جہاں تک شہادتیں یکجا ہو سکتی ہیں ان کی بنا پر مجھے یہ فریضہ بہت حد تک صحیح معلوم ہوتا ہے کہ عبدالصمد ایک فرضی نام ہے اور در حقیقت غالب نے طفولیت یا نوشابی کے زمانے میں کسی خاص استاد کے آگے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا - میں یہ نہیں کہہ رہا کہ غالب نے اس ضمن میں دروغ گوئی سے کام لیا ، سو پشتوں کی سپہ گری پر ناز کرنے والے انسان کو اپنی روحانی نسل کو بھی تو ماضی سے متعلق کرنا تھا - اور اسے بھی بلند مرتبہ دینا تھا - اپنے روحانی تعلق کی بنا پر جہاں وہ یہ کہہ سکتا ہے ؎

ز حیدریم من و تو زما عجب نبود
گر آفتاب سوئے خاوراں بگردانیم

غالباً اسے یہ بھی حق حاصل ہے کہ وہ اپنے اعجاز تخیل سے ایک فاضل اجل اور عالم بے بدل استاد کی تخلیق کرلے - میں اسے جھوٹ نہیں سمجھتا ، میں اسے ایک ''تخلیقی التباس'' سمجھتا ہوں جس کے بغیر شعر گوئی بھی غالباً امر محال ہے - لیکن تخلیقی التباس کو ذہنی حقیقت کا ایک پہلو سمجھ کر اسے ذہنی سطح پر صحیح تصور کرنا ہے - لیکن سوال یہ ہے کہ آخر اس استاد کو پہلے پارسی ، آتش پرست ہونے کی کیا ضرورت تھی ؟ اور پھر بعد میں مسلمان ہوگیا - آتش پرستی غالب کے تصور کا ایک اہم پہلو تھا اور یہ پرستش اس کے تفکر اور تدبر کا ایک لازمی انداز تھا - اور اسی پرستش کی وجہ سے اس کے اندر گرمیٔ اندیشہ پیدا ہوئی ، اور اسی پرستش کی بنا پر اس کی آگہی میں آشوب تھا - اس آشوب کا ایک پہلو تو یہ تھا کہ غالب میں جا بجا ایک کیفیت کا اثبات ملتا ہے اور پھ فوراً اس کے بعد اس کی تردید ہو جاتی ہے - کوئی کیفیت ایسی نہیں جو جم کر ثبات حاصل کر کے بڑھے اور پھلے پھولے - مثلاً

بے خودی کردہ سبک معاش فراغ دارم
کوہ اندوہ رگ خواب گراںست مرا

اور اس کے فوراً بعد فرماتے ہیں

خارہا از اثر گرمیٔ رفتارم سوخت
فتنے بر قدم راہ رواںست مرا

پھر کہتے ہیں

سایہ و چشمہ بہ صحرا دم عیسیٰ دارد
اگر اندیشۂ منزل نشود راہ زن ما

یہ ہاں اور نہ کی دو بدعا مستقل طور پر غالب میں ملتی ہے ان کی مشہور غزل جو اس طرح شروع ہوتی ہے - بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم - کس قدر امید آفریں جوش و خروش کے ساتھ اس کی ابتدا ہوئی ہے لیکن اسی کا مقطع ملاحظہ ہو -

بمن وصال تو باور نمی کند غالب
بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم

مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ غالب کے ہاں اجزائے نفس کا تو احساس شدید ہے - لیکن ان اجزا کو کسی شیرازہ میں یکجا کرنے کی صلاحیت کا شعور کم ہے - پارہ پارہ ہونے ، ٹکڑے ٹکڑے ہونے کا شعور تو ہے لیکن ان ٹکڑوں سے کوئی نئی ترکیب ، Synthesis بنانے کی کوشش نہیں ہے - نار کی فراوانی ہے ، لیکن اس میں نور بننے کی سکت نہیں ہے ، جب ہم ذہنی کش مکش اور ہاں اور نہ کی دو بدعا کو تعقل اور ذہن کی سطح پر نہ لائیں اور دل کی گہرائیوں میں سلگنے دیں تو شخصیت میں تغیر پیدا ہوتا ہے ، شکوہ و شکایت کے ساتھ ساتھ تسلیم و رضا کے جذبات بھی ملتے ہیں اور خودی اور بے خودی ایک ہی سمندر کی موجیں معلوم ہوتی ہیں - اسی لئے غالب کے وہ اشعار جو روحانی یا فلسفیانہ مطالب کے حامل ہیں ، اکثر و بیشتر کسی روحانی مسئلے کا عاقلانہ جواب ڈھونڈتے ہیں - دل کی حرارت گرمیٔ اندیشہ بن جاتی ہے -

یہ گرمیٔ اندیشہ کیا چیز ہے ؟ جب ہم اندیشہ اور تفکر کا تجزیہ کرتے ہیں تو اس میں ہمیشہ ایک سرد مہری ، ایک برفانی قسم کی بے رخی اور بے نیازی پاتے ہیں - ایک معروضی کیفیت جو موضوعی حدت و تمازت سے محروم ہوتی ہے - خون جگر سے فلسفہ لکھا جا سکتا ہے اور ڈی ایچ لارنس کی طرح انسان خون کو کبریائی حیثیت بھی دے سکتا ہے لیکن کیا جب غالب گرمیٔ اندیشہ کا ذکر کرتے ہیں تو دراصل سوز غمہائے نہانی کی طرف اشارہ نہیں کر رہے اگر وہ سوز غمہائے نہانی کو اسی سطح پر رہنے دیتے تو شاید یہ

معاملہ یہیں تک رہ جاتا ، لیکن غالب میں جا بجا یہ عمل دکھائی دیتا ہے کہ وہ سوز غم ہائے نہانی کو اندیشہ اور تفکر کی سطح پر اس لئے لاتے ہیں کہ وہ غم کو دل کی سطح پر برداشت نہیں کر سکتے - انہیں یہ خدشہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر غم دل میں رہا تو انہیں پارہ پارہ کر دے گا - ان کے اجزائے نفس کا شیرازہ بکھر جائے گا - غم و اندوہ کی آگ ان کے اندیشے میں سلگتی رہتی ہے اور یہی نارانا ان کے وجود کو بقا اور ان کی شخصیت کو یک جہتی بخشتی ہے - یہی وجہ تھی کہ غالب نے یہ کہا -

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشہ میں ہے
آبگینہ تندی صہبا سے پگھلا جائے ہے

اور

عرض کیجے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں
اک خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

غالب کی شاعری کا ایک پہلو یہ بھی ہے - انہیں یہ بھی خدشہ رہتا ہے کہ کہیں یہ سوز غمہائے نہانی ، روشنی نہ بن جائے - یہ نار نور کا قالب نہ ڈھال لے اور نار نور بنتی ہے جب انسان غمہائے نہانی کو برداشت کر لے - ان کی آگ میں جلنے پر آمادہ ہو اور راکھ بن کر نئے سرے سے روشن ہو اور نئے چراغ جلانے پر آمادہ ہو - غالب میں اس قسم کی آمادگی کہیں نظر نہیں آتی - دیر و حرم اس کے لئے واماندگیٔ شوق کی پناہیں ہیں - اور دیکھئے جاگیرداری رسم و رواج کو جا بجا غیرت اور خود داری کا نام دے کر کس کس طرح نور سے فرار اختیار کرتا ہے -

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

اور پھر دیکھئے کہ غالب ہی کہتے ہیں گرمیٔ اندیشہ سے انا کو تابناک اور زندہ رکھنے والا شخص اس مقام پر کیسے پہنچ سکتا ہے جہاں کعبہ اس کے گرد رقص کرنے لگے اور اس کے منہ میں پتھر پانی میں ڈھل جائے

تشنہ لب بر ساحل دریا ز غیرت جاں دہم
گر بموج افتد گمان چین پیشانی مرا ....

مجھے تو اس قسم کی غیریت اور خود داری میں وہ خود فریبی نظر آتی ہے جو اکثر جاگیردارانہ رسم و رواج میں ہوتی ہے۔ یہ وہ روٹھ جانے کی کیفیت ہے جسے قبائلی مزاج دشمنی یا عداوت کا لقب عطا کرتا ہے۔ موج کی چین شہانی پر ہی بات نہیں لیکن اگر موج کی چین شہانی کا شک بھی ہو جائے تو غالب پیاسا مرنے کو تیار ہے۔ پھر یہی حال دیکھئے سر پھوڑنے کی تمنا کا؟

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو!

سوال یہ ہے کہ سر آپ کہیں پھوڑیں، محبوب کے انسان پر نہ پھوڑیں۔ لیکن خیال تو محبوب ہی کا رہے گا اس ابتذال سے کیا فرق پڑتا ہے۔ فقط یہ کہ محبوب کی انا کے سامنے میری انا ہیچ اور کم تر نظر نہ آئے اور غالب کی انا آگ تھی۔ اور اس آگ کو نور بنانے کے لئے غالب کو اس آگ کو دل میں رکھنا اور برداشت کرنا تھا۔ کیونکہ یہ آگ دل میں رہ کر ہی نور بن سکتی ہے۔

غالب کی چند معدوم تصنیفات

سید معین الرحمن

''بارہ برس کی عمر سے کاغذ، نظم و نثر میں مانند اپنے نامۂ اعمال کے سیاہ کر رہا ہوں - باسٹھ برس کی عمر ہوئی، پچاس برس اس شیوے کی ورزش میں گزرے -'' (از، اسداللہ : نگاشتۂ بست و سوم فروری سنہ ۱۸۶۷ع)

قدر بلگرامی کے نام، اس خط کے بعد غالب بارہ برس اور جیے اور یہ زمانہ بھی شیوۂ قدیم کی ورزش میں گزرا - ساٹھ برس سے متجاوز، اپنی ادبی زندگی کے طویل دور میں انہوں نے بہت کچھ لکھا، طبیعت کی اپج سے بھی اور فرمائش پر بھی- آج، کہ جب آل احمد سرور کے بقول غالب کی تحریر کا ایک ایک لفظ اہل نظر کی آنکھ کا سرمہ ہے، یہ جان کر بہت ملال ہوتا ہے کہ غالب کی بعض تصنیفات اب تک پردۂ خفا میں ہیں - اس موقع پر غالب کی چند ایسی ہی تحریروں کا ''ماتم'' مقصود ہے جن کا جہاں تہاں محض ذکر ملتا ہے لیکن جو تا حال دستیاب نہیں ہو سکی ہیں :

۱- رسالۂ در ''آئین پیچہای بانک''

(ترجمہ، از ہندی (اردو) بفارسی برای نواب ٹونک)

زمانۂ تالیف : ماقبل، ۱۰- مارچ ۱۸۴۵ع

غالب کی آخری ادبی یادگار باغ دو در (۱) '' سے ایک بڑی نادر اطلاع یہ ملتی ہے کہ غالب نے بانک کے داؤ پیچ پر بھی ایک مختصر کتاب تالیف

---

(۱) ''باغ دو در'' غالب کے نظم و نثر فارسی کا آخری مجموعہ- سال تالیف ۱۲۸۳ھ (مطابق ۱۶ - مئی ۱۸۶۶ع تا ۴ - مئی ۱۸۶۷ع) طبع اول بہ دو قسط، منحصر بفرد قلمی نسخہ، مملوکہ سید وزیرالحسن عابدی، در یونیورسٹی اورینٹل کالج میگزین، لاہور شمارہ اگست ۱۹۶۰ء (ص ۱-۹۲) و اگست ۱۹۶۱ء (ص ۹۳-۱۸۸) -

کی ! یہ ایک اردو رسالے کا فارسی ترجمہ ہے ، جسے غالب نے نواب صاحب ٹونک ، نواب وزیر محمد خان کی خوشنودیٔ مزاج کے خیال سے ترتیب دیا - یہ رسالہ ، تا حال دستیاب نہیں ہو سکا ہے - اس اطلاع کا واحد ماخذ "باغ دو در" میں شامل ، غالب کا ایک خط ہے جو اگست ۱۹۶۱ع میں منظر عام پر آیا - اور ایک اندازے کے مطابق ۱۸۴۵ ع کی پہلی تماہی میں کسی وقت لکھا گیا -

"باغ دو در" کے دوسرے حصے "منثورات" میں مختلف اصحاب کے نام غالب کے ساٹھ خط بھی شامل ہیں - چوبیسویں خط میں ، جو تفضل حسین خان خیر آبادی کے نام ہے ، غالب نے اپنی اس تالیف کا ذکر ، ان کلمات (۱) میں کیا ہے :

"شاید آپ بھی جلد ہی اگرے سے ٹونک روانہ ہونے والے ہوں اور وہاں پہنچ کر یہ عریضہ جو طالع یار خان(۲) کو دے رہا ہوں ، آپ کی نظر سے گزرے - اس دفعہ طالع یار خان نے جس سے میرے دیرینہ مراسم ہیں ، مجھ سے ایک بڑے مشکل کام کی فرمائش کی - بانک کے داؤ پیچ پر ایک مختصر ہندی رسالے کا فارسی میں ترجمہ کرنے کو کہا اور یہ مشورہ دیا کہ اس خدمت کی انجام دہی نواب معلی القاب (نواب صاحب ٹونک ، نواب وزیر محمد خان) کی خوشنودیٔ مزاج کا سبب ہوگی - میں چونکہ ان کے خوان جود و کرم کا زلہ خوار ہوں اور سپاس نعمت مجھ پر فرض ہے ، میں نے اس مشکل کام کے لئے قلم اٹھایا اور ایک رسالہ دیباچے اور خاتمے پر مشتمل ترتیب دے کر انہیں کو دے دیا اور ایک عرض داشت بھی لکھ کر ساتھ کر دی تاکہ اس وسیلے سے یہ آرزو بر آئے کہ نواب صاحب کی توقیع میرے نام صادر ہو - دیباچے کے مضمون کی داد پہلے آپ سے اور پھر مخدومی مولوی ظہورالدین علی سے چاہتا ہوں کہ ممدوح کا ذکر کن الفاظ میں کیا ہے اور فن بانک کی تعریف کس انداز سے کی ہے اور اس کے

۱- غالب کا اصل خط فارسی میں ہے - یہاں اس کی "ہوبہو ترجیح" وزیرالحسن عابدی صاحب کے "تحقیق نامۂ باغ دو در" مطبوعہ جولائی ۱۹۶۸ء سے پیش کی جا رہی ہے -

۲- طالع یار خاں کے کوائف میں دیکھئے : مضمون سید جمیل‌الدین ، مطبوعہ نوائے ادب ، بمبئی جولائی ۱۹۵۵ء -

ساتھ دیباچے اور رسالے کی عبارت میں اسلوب بیان کی جدت کو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ بیان کا خاص اسلوب برابر قائم رہا ہے۔ بااین ہمہ جانتا ہوں کہ اپنی جادو بیانی پر فخر اس وقت کر سکتا ہوں اور اپنی کاوش کی داد، اس وقت ملے گی کہ بندگان نواب صاحب سلطان نشان میرے انداز بیان کو پسند فرمائیں۔ (۱)

تفضل حسین خان خیرآبادی کے نام باعتبار ترتیب، یہ غالب کا دوسرا خط ہے اور اس پر کوئی تاریخ ثبت نہیں۔ تفضل حسین خان ہی کے نام اگلے (باعتبار ترتیب تیسرے) خط سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب ٹونک نے غالب کی اس عرض داشت کا جو رسالہ در "آئین پیچہای بالک" کے ساتھ بھیجی گئی تھی، کوئی جواب نہیں دیا۔ غالب نے اسے شدت سے محسوس کیا اور بہت ملول ہوئے۔ (۲)

اس خط پر یکم ربیع الاول ۱۲۶۱ھ، ۱۰۔ مارچ ۱۸۴۵ع کی تاریخ درج ہے جس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ بالک کے داؤ پیچ سے متعلق اس رسالے کے ترجمہ و ترتیب کا کام مذکورہ تاریخ (۱۰۔ مارچ ۱۸۴۵ع) سے کچھ پہلے انجام پایا ہوگا۔ غالب کا یہ رسالہ معدوم ہے۔ عجب نہیں کہ یہ ٹونک کے سرکاری یا کسی شخصی ذخیرۂ کتب میں محفوظ، لیکن دبا پڑا ہو، اور حسن اتفاق یا تلاش سے کبھی دستیاب ہو جائے۔

۲۔ قصہ کہانی کی کتاب (اردو)

فی بطن شاعر بزمانہ: دسمبر و بہ بعد ۱۸۵۸ع

غالب کے خطوں میں ایک اور کتاب کا ذکر بھی آیا ہے لیکن کہیں اس کا سراغ نہیں ملتا اور قیاس کہتا ہے کہ یہ لکھی نہیں گئی، محض تجویز کی حد تک ہی رہ گئی۔ غالب سے اس کی فرمائش، ہنری اسٹورٹ ریڈ (۳)

۱۔ تحقیق نامۂ باغ دو در، ص ۵۲-۵۱

۲۔ اس خط کی "برگشتگی" دیدنی ہے۔ اس سے غالب کی افتاد مزاج پر روشنی پڑتی ہے اور ان کی خودنگری اور خود داری کی بڑی تیکھی اور منہ بولتی تصویر سامنے آتی ہے۔ رجوع کیجئے: تحقیق نامۂ باغ دو در، ص ۵۵-۵۲

۳۔ ہنری اسٹورٹ ریڈ، ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن صوبہ شمال مغربی کا ذکر غالب کے خطوں میں، سب سے پہلے مرزا تفتہ کے نام ۲۷۔نومبر ۱۸۵۸ع کے ایک خط میں آیا ہے:

(باقی صفحہ ۱۳۷ پر)

نے کی تھی فرمائش یہ تھی کہ وہ اردو نثر میں ایک مستقل کتاب لکھ دیں - منشی شیو نرائن آرام (۱) کے نام ، ۱۱ دسمبر ۱۸۵۸ع کے ایک خط میں غالب نے اول اول ، اس فرمائش کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے :

''جناب ھنری اسٹورٹ ریڈ صاحب کو ، ابھی میں خط نہیں لکھ سکتا - ان کی فرمائش ہے ، اردو کی نثر - وہ انجام پائے تو اس کے ساتھ ان کو خط لکھوں - مگر بھائی ، غور کرو ، اردو میں اپنے قلم کا زور کیا صرف کروں گا؟ اور اس عبارت میں معانیٔ نازک کیوں کر بھروں گا؟ ابھی تو یہی سونچ رہا ہوں کہ کیا لکھوں - - ؟ کون سی بات ، کون سی کہانی ، کون سا مضمون تحریر کروں؟ تمہاری رائے میں کچھ آئے تو مجھ کو بتاؤ - - - "

چار روز بعد ھی ، ۱۵ - دسمبر ۱۸۵۸ع کے خط میں اپنے اس خط کے جواب کا تقاضا کرتے ہوئے غالب لکھتے ھیں :

''بھائی ، یہ بات تو کچھ نہیں کہ تم خط کا جواب نہیں لکھتے - خیر دیر سے لکھو ، اگر شتاب نہیں لکھتے - تمہارا خط آیا ، اس کے دوسرے دن میں نے جواب بھجوایا ، حالانکہ اس میں جواب طلب باتیں تھیں ؛ یعنی - ریڈ صاحب کے باب میں ، میں نے یہ لکھا تھا کہ جب کچھ اردو کی نثر ان کے واسطے لکھ لوں گا تو ''دستنبو(۲)" کی خریداری

(بقیہ صفحہ ۱۳۶)

"ھنری اسٹورٹ ریڈ صاحب ممالک مغربی کے مدرسوں کے ناظم اور گورنمنٹ کے بڑے مصاحب ھیں - امن کے دنوں میں ایک ملاقات میری ان کی ہوئی تھی" -

گارسین دتاسی نے ، اپنے خطبات میں ریڈ کا ذکر اکثر کیا ہے - خصوصیت سے دیکھئے بارھواں خطبہ ۲-دسمبر ۱۸۶۱ء ص ۳۰۵ - ۳۰۹ -

۱- منشی شیو نرائن آرام (۱۸۴۳ء-۱۸۹۹ء) غالب کے شاگرد مطبع مفید خلائق ، آگرہ کے مالک اور مہتمم - شیو نرائن اور غالب کے بزرگوں کے باہم مراسم رہے تھے اس لئے غالب انہیں مثل "فرزند دلبند" عزیز رکھتے تھے -

۲- فارسیٔ قدیم میں انقلاب ۱۸۵۷ء کے حالات سے متعلق غالب کی ایک اہم تصنیف ، طبع اول ، مطبع مفید خلائق ، آگرہ نومبر ۱۸۵۸ء ، تفصیلی تعارف کے لئے رجوع کیجئے - راقم الحروف کی کتاب "اشاریۂ غالب" (ص ۵۵ - ۵۸) مطبوعہ مجلس یادگار غالب ، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۶۹ء -

کی خواهش کروں گا۔(۱) معهذا تم سے صلاح پوچھی تھی کہ کس حکایت اور کس روایت کو فارسی سے اردو کروں ۔ تم نے اس بات کا بھی جواب نہ لکھا ۔ ۔ ۔ ''

اس یاد دھانی کے تین روز بعد ، منشی نرائن کا خط آگیا ۔ اسی روز ، ۱۸ ۔ دسمبر ۱۸۵۸ع کو غالب نے اس کا جواب تحریر کیا :

''برخوردار ، آج اس وقت تمهارا خط ۔ ۔ آیا ۔ دل خوش هوا ۔ ۔ جناب ریڈ صاحب ، صاحبی کرتے هیں ۔ میں اردو میں اپنا کمال کیا ظاهر کر سکتا هوں ۔ تین مهینے میں گنجائش عبارت آرائی کی کہاں ہے؟ بہت هوگا کہ میرا اردو ، بہ نسبت اوروں کے فصیح هوگا ۔ خیر ، بہرحال کچھ کروں گا اور اردو میں اپنا زور قلم دکھاؤں گا ۔ ''

مراسلت کے اس اسلوب سے خیال هوتا ہے کہ اردو نثر میں قصے کہانی کی کتاب تالیف کرنے کی یہ فرمائش منشی شیو نرائن کے توسط سے بھی کی گئی هوگی جنھوں نے اسی زمانے میں ''دستنبو'' کا ایک نسخہ اس کے چھپتے هی اپنے مطبع مفید خلائق کی طرف سے ، هنری اسٹورٹ ریڈ کی نذر کیا تھا ۔ بہر حال ، کتاب اور اس کے مجوز ، ریڈ صاحب کا ذکر یا اشارہ غالب کے هاں ، قریب بعد کے صرف ایک خط میں اور آیا ہے جس سے یہ ظاهر هوتا ہے کہ غالب اردو نثر میں قصہ کہانی کی کتاب ، ترتیب دینے کا وقت نہیں نکال سکے ۔ یا ، زیادہ صحیح یہ کہ ذهنی طور پر وہ اس کے لئے آمادہ

۲۔ شیو نرائن کہ : ''دستنبو'' کے ناشر تھے ، اس بات کی فکر میں تھے کہ کتاب پڑی نہ رہ جائے جلد نکل جائے ۔ یہاں ''خریداری کی خواهش'' سے مراد ہے کہ ریڈ صاحب اپنے محکمے یعنی مدارس وغیرہ کے لئے ''دستنبو'' کی کچھ جلدوں کی اکٹھی خریداری کا انتظام کر دیں ، نہ یہ کہ وہ ''اپنے لیے'' ایک نسخہ خریدیں ! ان کے ذاتی ملاحظے کے لیے تو شیو نرائن اور غالب دونوں ، الگ الگ ، آگے پیچھے ''دستنبو'' کا ایک ایک نسخہ هدیہ کر چکے تھے ۔ میرزا تفتہ کے نام ۲۷۔نومبر ۱۸۵۸ء کے خط میں غالب لکھتے هیں کہ هنری اسٹورٹ ریڈ کو :

''۔۔ایک کتاب ، سادہ ۔ ۔ ۔ ۔ بھیجی تھی ۔ کل ان کا خط مجھ کو اس کتاب کی رسید میں آیا ۔ بہت تعریف لکھتے تھے ۔ اور هاں بھئی ، ایک تماشا اور ہے : وہ مجھ کو لکھتے تھے کہ یہ ''دستنبو'' پہلے اس سے کہ تم بھیجو ، مطبع مفید خلائق نے همارے پاس بھیجی ہے اور هم اس کو دیکھ رہے اور خوش هو رہے تھے کہ تمهارا خط مع کتاب کے پہنچا ۔۔۔''

ہی نہ ہو پائے۔ ۴ - جنوری ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں وہ ضمناً اسٹورٹ ریڈ کا ذکر کرنے کے بعد ، منشی شیو نرائن کو لکھتے ہیں کہ :

''میاں ، اردو کیا لکھوں؟ میرا یہ منصب ہے کہ مجھ پر اردو کی فرمائش ہو؟ خیر ، ہوئی - اب میں کہانیاں ، کہاں ڈھونڈتا پھروں؟ کتاب ، نام کو میرے پاس نہیں ۔ پنسن مل جائے ، حواس ٹھکانے ہو جائیں تو کچھ کروں - پیٹ پڑیں روٹیاں تو سبھی گلاں موٹیاں ۔ -''

اس کے بعد ، اس مجوزہ کتاب کا ذکر یا سراغ ، غالب کے کسی اور خط میں نہیں ملتا - انہوں نے پنشن مل جانے پر ، اس کتاب کی فکر کو موقوف رکھا تھا ۔ پنشن کی اجرائی ، اس ارادے کے پورے ایک سال ، چار ماہ بعد ، بہت کھکھیڑیں اٹھانے پر ، کہیں ۴ - مئی ۱۸۶۰ء کو عمل میں آسکی(۱) - لیکن ''حواس ٹھکانے'' ہو جانے اور ''پیٹ پڑیں روٹیاں'' والی شرط ، پھر بھی پوری نہ ہو پائی ۔ اس لئے کہ پنشن کا زر مجتمعہ سہ سالہ ، یک مشت ملنے پر ، بہت ضروری قرض ادا کرنے کے بعد (جسے غالب نے ''ادائے حقوق'' کہا ہے) ، چار سو روپے ، ان کے ذمے باقی رہے - اور ان کے پاس صرف ستاسی روپے گیارہ آنے بچے ۔(۲) اور یہ بھی ، بہت رگڑ جھگڑ کر انہیں بچے ، ورنہ ان کا قرض خواہ اور مختار کار خزانے سے روپیہ لے آیا تھا اور اپنا حساب صاف کرائے بغیر ، اس کی ہوا تک دینے کے لئے تیار نہ تھا - اسی زمانے میں مجروح کو لکھتے ہیں :

'' - - - خزانے سے روپیہ آگیا ہے - میں نے آنکھ سے دیکھا ہو تو آنکھیں پھوٹیں بات رہ گئی - پت رہ گئی حاسدوں کو موت آگئی - دوست شاد ہوگئے میں جیسا ننگا بھوکا ہوں ، جب تک جیوں گا ، ایسا ہی رہوں گا - - - ''

اور ایسے میں ، اردو نثر لکھنے کی ، برس ڈیڑھ برس پہلے کی فرمائش کا انجام معلوم ! اور پھر خصوصیت سے ایسی فرمائش ، جسے وہ اپنے ''منصب'' سے ویسے ہی فروتر خیال کرتے تھے -

---

۱- دیکھئے ششم مئی ۱۸۶۰ء کا ایک خط بنام مجروح ، خطوط غالب ، مرتبہ مالک رام ، ۱۹۶۳ء ص ۷۴ -

۲- خطوط غالب ، ص ۲۷۱ -

پنجاب یونیورسٹی لائبریری ، میں "منتخبات اردو" کے نام سے مطبع نولکشور ، لکھنؤ ۱۸۶۱ء کی چھپی ہوئی ایک کتاب موجود ہے ، جس کے سرورق کی عبارت یہ ہے :

"منتخبات اردو - - - کلکتہ یونیورسٹی کے داخلے کے امتحان کے واسطے کلکتہ یونیورسٹی کے جناب وائس چانسلر صاحب بہادر اور صاحبان سنڈکیٹ کے ارشاد کے مطابق بہدایت اور اعانت جناب ہنری اسٹورٹ ریڈ صاحب بہادر ، ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن ممالک مغربی کے ، مولوی محمد کریم بخش[۱] میر منشی ، محکمہ مذکور نے تالیف کی - - -"

قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ریڈ صاحب نے غالب سے اسی نصابی کتاب کی تالیف ، یا اس کے لئے ، کسی ایک قصے کی تصنیف کی فرمائش کی ہوگی -

۳- اردو زبان کے ظہور کا حال

زمانۂ تالیف : ۱۲۸۲ھ ، ۱۸۶۶ء

ماخذ : تذکرہ جلوۂ خضر (حصہ اول) ، از سید صفیر بلگرامی
مطبوعہ ، نورالانوار ، آرہ ۱۳۰۲ھ ، ۱۸۸۴ء -

غالب کے عزیز دوست ، صاحب عالم مارہروی (۱۷۹۶ء - ۱۸۷۳ء) کے نواسے ، صفیر بلگرامی[۲] ۱۲۸۰ھ ، ۱۸۶۴ء میں مرزا غالب کے شاگرد ہوئے اور دو سال بعد مئی ۱۸۶۶ء میں ایک طویل سفر کرکے ، مرزا صاحب کی خدمت میں پہنچے اور بہت دن تک ان کے پاس مقیم رہے - اپنی ملاقات کا حال انہوں نے "جلوۂ خضر" میں بڑی تفصیل سے لکھا

۱- مولوی محمد کریم بخش پر تفصیل کے لیے دیکھئے مضمون ، ملک احمد نواز ، مطبوعہ قومی زبان ، کراچی جنوری ۱۹۶۹ء ص ۱۸-۲۲ -

۲- صفیر ، سید فرزند احمد بلگرامی : ۹-اپریل ۱۸۳۴ء (۲۸ ذیقعد ۱۲۴۹ھ) کو اپنی نانھیال مارہرہ (ضلع ایٹہ) میں پیدا ہوئے - نظم و نثر پر یکساں حاوی تھے اور اس میں شک نہیں کہ بدرجہ غایت قادرالکلام تھے - متعدد مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصنیفات ان کی یادگار ہیں - بروز دو شنبہ ، ۱۱ مئی ۱۸۹۰ء (۲۱ رمضان ۱۳۰۷ھ) کی دوپہر کو پٹنہ میں انتقال کیا اور آرہ میں مدفون ہوئے -

(مالک رام ، تلامذۂ غالب ۱۹۵۷ء ص ۱۹۴-۱۹۵)

ہے ۔ اس روداد سے غالب کی ایک تصنیف ، اردو زبان کی ابتدا اور اس کے نشو و نما کی مختصر تاریخ ، کی نشاندھی ھوتی ھے :

" ۔ ۔ ۔ مجھ سے اور حضرت غالب علیہ الرحمت سے ایک مرتبہ لکھنؤ اور دھلی کی زبان کے بارے میں گفتگو ھوئی اور سبب اس کا یہ ھوا کہ ان دنوں حضرت اپنے ایک رسالے کا مسودہ ، اردو زبان کی تحقیق میں کاتب سے لکھوا رہے تھے ، جو میں نے اس کے صاف شدہ اجزا ھاتھ میں لے لیے ، حضرت نے دیکھ کر فرمایا ، ھاں اس کو دیکھو ، یہ ایک چیز میں نے ان دنوں بہ فرمائش ڈائریکٹر(۱) صاحب لکھی ہے ۔

اس میں اردو کی مختصر تاریخ اور قواعد تھے ۔ کوئی پانچ چھ جزو کا رسالہ تھا ۔ جناب ڈائریکٹر صاحب نے مولف (جلوۂ خضر ، صفیر بلگرامی) کے نانا حضرت صاحب عالم کو بھی خط لکھا تھا۲ کہ زبان اردو کی تاریخ اور

۱- مراد ڈائریکٹر سر رشتہ تعلیم میتھیو کیمپسن سے ھے جو بڑے علم دوست شخص تھے اور اردو ، فارسی کا بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے ۔

۲- ڈائریکٹر ایم ۔ کیمپسن کا اصل خط ، ڈاکٹر مختارالدین احمد صاحب آرزو نے احسن مارھروی مرحوم کے اخلاف کے یہاں دیکھا اور اسے اپنی قیمتی تالیف "احوال غالب" (۱۹۵۳ء) میں نقل کر دیا ھے (ص ۷۵ - ۷۶) ۔ اس خط سے بعض متعلقہ امور پر روشنی پڑتی ھے اور "قیاس غالب ھے کہ مرزا غالب کو بھی اس خط کی نقل بھیجی گئی ھوگی ۔ اس لیے یہاں پورا خط درج کیا جاتا ہے" :

عنایت فرمائے دوستان سید صاحب عالم معانی دار مارھرہ زاد عنایتکم

بعد اظہار شوق و مراسم عرفیہ کے واضح رائے محبت پیرائے ھو ، چونکہ اکثر اوصاف جمیلہ و محامد نبیلہ آپ کی در باب واقفیت تاریخ و زبان دانی و دیگر فضائل و کمال کے گوش زد ایں جانب کے ھوئے ، اس لئے آپ کو براہ دوستانہ اس امر کی تکلیف دی جاتی ھے کہ اگر آپ کو حال مفصل ایجاد زبان اردو معلوم ھو تو اس کی کیفیت —— تحریر کرکے ، مجھے ممنون کیجئے اور اس تحقیقات سے وہ دریافت حال زبان سطور مطلوب ھے کہ جس سے حال زمانۂ ابتدائے اجرائے اردو اور نیز تصریح اس امر کی کہ کس عہد سے زبان مذکور ، داخل نوشت و خواند اھل ھند ھوئی ، معلوم ھو جائے ۔ اور کن کن استادوں نے زبان مذکور میں ابتداً شعر و سخن یا نثر کے مضامین لکھنے شروع کئے اور کتنے محاورات قدیمہ ، اب تبدیل ھوگئے اور اس تبدیلی سے اس زبان میں ، شستگی و رفتگی آئی یا کسی طرح کا نقص پیدا ھوا ، اور اگر کلام ان اساتذۂ قدیم کے یاد ھوں یا کسی تذکرے میں آپ کی نظر سے گزرے ھوں تو بطور مشتے نمونہ از خروارے ، سلک تحریر فرما کر ممنون کریں اور جو کوئی کتاب

(باقی صفحہ ۱۶۲ پر)

قواعد میں کوئی کتاب لکھ کر بھیج دیجئے - چنانچہ حضرت نے اس کا اہتمام میرے سپرد کیا تھا - مگر میں نے اس کا مسودہ درست کرکے بھیج دیا تھا ، پھر خدا جانے کیا ہوا - اس طرح حضرت غالب کو بھی لکھا تھا - وہ اسی رسالے کو لکھوا رہے تھے - الغرض ، اسی رسالے کو پڑھنے میں کچھ دھلی و لکھنؤ کی زبان کا ذکر آگیا -

(صفیر بلگرامی جلوۂ خضر ، حصہ اول ص ۲۳۵ ، ۲۳۶ ، ذکر مومن)

خود غالب کے ایک خط بنام خواجہ غلام غوث بے خبر(۱) سے ، اس کی توثیق ہوتی ہے کہ غالب نے میتھیو کیمپسن کی فرمائش پر اردو زبان کے ظہور کا حال لکھا تھا - دوشنبہ ، ۲۳ - جولائی ۱۸۶۶ع(۲) کے ایک خط میں غالب لکھتے ہیں :

"جناب کیمپسن صاحب بہادر افسر مدارس غرب و شمال کا باوجود عدم تعارف ، خط مجھ کو آیا - کچھ اردو زبان کے ظہور کا حال پوچھا تھا - اس کا جواب ، لکھ بھیجا - نظم و نثر اردو کی طلب کی تھی ، مجموعۂ نظم بھیج دیا - نثر کے باب میں - - - یہ لکھا کہ مجموعہ چھاپا جاتا ہے - بعد انطباع و حصول اطلاع - - - منگا کر بھیج دوں گا - - -"

(بقیہ صفحہ ۱۴۱

حاوی ان امور کی مل سکے ، اس کو بطور عاریت یا بہ قیمت ، جیسا مناسب ہو (عطا) فرمائیں نہایت موجب احسان مندی ہوگا اور چونکہ جس کتاب کا ایں جانب قصد تالیف ہے اور جس کی امداد کے لئے آپ کو تکلیف دی گئی ہے اس میں حال شعراء وغیرہ کا بقید نام و مسکن و زمانہ لکھا جائیگا ، آپ جو کیفیت ان استادوں کی تحریر فرمائیں تو اس میں امور صدر کا ضرور لحاظ رہے - فقط

المرقوم ، ۶-جون ۱۸۶۶ء رقیمۃالشوق
کیمپ کوہ منصوری ایم - کیمپسن

۱- بے خبر ۱۸۲۵ء (۱۲۴۰ھ) میں نیپال میں پیدا ہوئے - چار برس کے تھے جب ان کے والد نقل مکان کرکے ھندوستان آئے اور بنارس میں سکونت اختیار کی - چنانچہ بے خبر کی نشو و نما اور تعلیم و تربیت اسی شہر میں ہوئی - اردو سے کم اور فارسی سے زیادہ شغف تھا - فارسی نظم و نثر کا ایک مجموعہ خونابۂ جگر کے نام سے اور اردو خطوط فغان بے خبر کے نام سے ان کی زندگی میں چھپے - بقیہ کلام نظم و نثر ان کی وفات کے بعد ان کے ایک عزیز نے ۱۹۰۸ء میں شائع کیا - ۱۸ شوال ۱۳۲۲ھ ، ۲۶-دسمبر ۱۹۰۴ء کو الہ آباد میں انتقال فرمایا ، وہیں دائرہ شاہ محمدی میں دفن ہوئے - (مالک رام ، تلامذۂ غالب ص ۱۶۳)

۲- مرتضیٰ حسین فاضل ، عود ہندی ، طبع مجلس ، لاہور ، ص ۳۲۴ -

لیکن ڈاکٹر مختارالدین احمد صاحب کا خیال ہے کہ :

''غالب نے اردو زبان کی تحقیق میں کوئی رسالہ پانچ چھ جزو کا لکھا تھا ، یہ محل نظر ہے ۔ صفیر کے علاوہ اس رسالے کا ذکر کسی نے نہیں کیا ۔ خود غالب کی تحریروں میں اس کا پتا نہیں ۔ اس قدر اہم موضوع پر ان کی کوئی تصنیف ہوتی تو اور معاصرین بھی اس کا ذکر ضرور کرتے اور وہ کتاب اس قدر جلد فنا بھی نہ ہو جاتی ۔ خود غالب کے ایک خط (مذکور الصدر ، بنام ، خواجہ غلام غوث بے خبر) سے اس کے خلاف مترشح ہے ۔

قابل غور امر یہ ہے کہ غالب ، کسی کتاب کی تصنیف کا ذکر نہیں کرتے : خط مجھ کو آیا - - ۔ اس کا جواب لکھ بھیجا،، سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بس اس کے جواب میں ایک خط لکھ دیا ۔ ممکن ہے ، وہ خط کچھ طویل ہو ، لیکن پوری کتاب لکھی ہو ، یہ قرین قیاس نہیں ،

(احوال غالب ، ص ۷۵ - ۷۴)

غالب کے خط سے "صاف" تو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ "بس" کیمپسن کے "جواب میں ایک خط لکھ دیا" ہو ۔ کیمپسن کے استفسار ، تفصیل طلب تھے ۔ ان کے جواب "پانچ چھ جزو" سے کم میں سما بھی کیا سکتے تھے ۔ غالب نے بالصراحت ، اگر مذکورہ خط میں ''کتاب یا رسالے" کا لفظ استعمال نہیں کیا ، تو اس کے لازماً یہ معنی نہیں کہ انہوں نے ، اس موضوع پر استفسارات کے جواب کی فرمائش میں کوئی کتاب یا رسالہ تصنیف بھی نہ کیا ہو ، الا یہ کہ واقعی خارجاً کسی معتبر ذریعے سے اس کی تردید ہوتی ہے --- اس کا بار ثبوت ابھی باقی ہے جب کہ اس کے بالعکس ایک معاصر عینی شہادت موجود ہے ۔ اس لیے یہ نہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں کہ غالب نے اردو زبان کی ابتداء اور اس کی نشو و نما کی مختصر تاریخ مع اضافہ قواعد اردو لکھی -- وہ کہیں نہ کہیں ضرور پڑی ہوگی ، اگر دست برد زمانہ کے ہاتھوں تباہ و برباد نہیں ہو چکی ۔

۴ ۔ نا تمام اردو قصہ

تالیف : فروری ۱۸۶۹ع

ماخذ : یادگار غالب ، حالی ، ۱۸۹۷ع

"یادگار غالب" میں حالی نے غالب کی "نثر اردو" کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"مرزا کی اردو نثر میں، زیادہ تر خطوط و رقعات ہیں -- اس کے سوا، چند اجزاء ایک ناتمام قصے کے بھی ہیں جو مرزا نے مرنے سے چند روز پہلے لکھنا شروع کیا تھا۔"

لیکن حالی کی اس نشاندھی اور شہادت کے باوجود مجھے اس میں تأمل ہے کہ غالب نے "مرنے سے چند روز پہلے"، کوئی اردو قصہ لکھنا شروع کیا ہوگا۔ اس لئے کہ دوسری طرف خود حالی ھی کے بقول:

"مرنے سے چند روز پہلے بےھوشی طاری ہوگئی تھی۔ پہر پہر، دو دو پہر کے بعد چند منٹ کے لئے افاقہ ہو جاتا، پھر بےھوش ہو جاتے تھے۔"

* * *

"--- مرنے سے کئی برس پہلے سے چلنا پھرنا بالکل موقوف ہو گیا تھا۔ اکثر اوقات پلنگ پر پڑے رہتے تھے۔ غذا کچھ نہ رہی تھی۔ چھ چھ، سات سات دن میں، اجابت ہوتی تھی۔"

* * *

"آخر عمر میں موت کی بہت آرزو کیا کرتے تھے --- بہت سی باتیں اور حکایتیں اُن سے منقول ہیں، جن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ آخر عمر میں مرنے کے کس قدر آرزو مند تھے۔"

* * *

"جس روز انتقال ہوا، اس سے شاید ایک روز پہلے، میں ان کی عیادت کو گیا تھا۔ اس وقت کئی پہر کے بعد افاقہ ہوا تھا اور نواب علاؤالدین احمد خاں مرحوم کے خط کا جواب لکھوا رہے تھے۔ انہوں نے لوھارو سے حال پوچھا تھا۔ اس کے جواب میں ایک فقرہ اور ایک فارسی شعر جو غالباً شیخ سعدی کا تھا، لکھوایا۔ فقرہ یہ تھا:

''میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو ، ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا ۔''

* * *

''مرنے سے پہلے اکثر یہ شعر ورد زبان رہتا تھا :

دم واپسیں برسر راہ ہے
عزیزو ! اب اللہ ہی اللہ ہے

* * *

''اخیر عمر اور مرض الموت کی حالت'' کے تحت ، حالی کے یہ بیانات مظہر ہیں کہ آخر ، آخر ، غالب کی حالت اتنی خستہ و خراب ہو چکی تھی کہ خط وغیرہ تک کا جواب ، وہ خود نہیں لکھ پاتے تھے ، دوسروں سے لکھواتے تھے ۔ ایسے میں یہ بات ، گو حالی ہی کی کہی ہوئی ہے جی کو نہیں لگتی ، کہ غالب نے کوئی قصہ ''مرنے سے چند روز پہلے لکھنا شروع کیا تھا'' اس مؤقف کو ، حالی سے مقدم ایک نادر و معاصر ماخذ سے بھی تقویت پہنچتی ہے ۔ میری مراد میر مہدی مجروح کے ایک مضمون سے ہے جو غالب کے انتقال کے فوراً بعد ۱۷ - فروری ۱۸۶۹ء کے اکمل الاخبار ، دہلی میں شائع ہوا اور جسے غالب کے بعد غالب کے حالات میں پہلا مضمون خیال کرنا چاہئے ۔ مجروح لکھتے ہیں کہ :

''جناب مرحوم دو تین مہینے صاحب فراش رہے ۔ ضعف و اقاہت کے صدمے سہے آٹھ دن انتقال سے پہلے کھانا پینا ترک فرمایا ، اس دلیائے فانی سے بالکل دل اٹھایا[۱] ۔

ایسے میں کہ وہ دو تین مہینے صاحب فراش رہے ، ضعف و نقاہت کے صدمے سہے ۔ آٹھ دن ، انتقال سے پہلے ، کھانا پینا تک ترک ہوا ۔ اس دلیائے فانی سے بالکل دل اٹھایا ، باور نہیں آتا کہ انہوں نے کیوں کر ''مرنے سے چند روز پہلے'' کسی قصے کی تصنیف کا ڈول ڈالا ہو گا ۔۔ اور خصوصیت سے اس صورت میں تو اور بھی کہ اس مبینہ ''ناتمام اردو قصے کے اجزاء'' کہیں دستیاب بھی نہیں ہوتے ۔۔۔

---

۱ - اکمل الاخبار ، دہلی جلد ۴ نمبر ۷ ، مطبوعہ ۱۷ فروری ۱۸۶۹ء ، ص ۵۵ -

یہاں ایک شبہے کا اظہار کر دینا بے محل نہ ہوگا: ہو سکتا ہے کہ حالی نے "چند برس" لکھا ہو، اور سہو کتابت سے یہ "چند روز" ہوگیا ہو! یا "چند برس" کی جگہ روانی میں حالی ہی کے قلم سے "چند روز" نکل گیا ہو، گو اس سے مقصود یہ نہ ہو --- اگر، حالی کی اس عبارت: "مرنے سے چند روز پہلے" کو "... چند برس پہلے" مان لیا جائے تو اس صورت میں حالی کا اشارہ، اس قصے کی طرف ہو سکتا ہے، ہنری اسٹورٹ ریڈ کے حوالے سے جس کا ذکر غالب نے دسمبر ۱۸۵۸ء کے اپنے بعض مکاتیب، موسومہ شیو نرائن میں کیا ہے --- لیکن یہ محض تاویل ہوگی۔ اس لئے کہ ریڈ کی فرمائش پر غالب اپنے انتقال سے کوئی دس گیارہ برس پہلے "قصہ کہانی" کے چکر میں پڑے تھے۔ دس گیارہ برس کی اچھی خاصی مدت کے لئے حالی کا "چند برس" لکھنا بھی، بجائے خود محل نظر ہوتا ---

* * *

یہاں تک غالب کی جن چار تحریروں کا ذکر ہوا، وہ ضخامت کے اعتبار سے کتاب کے حجم کی رہی ہوں گی۔ ان چار تصانیف کے علاوہ غالب کے خطوں میں ان کی بعض دیگر مختصر نگارشات کا ذکر بھی ملتا ہے جو، اب معدوم ہیں اور قیاس کہتا ہے کہ ورق، دو ورق کے پھیلاؤ سے زیادہ کی نہ ہوں گی۔ اس فرصت میں ایسی صرف دو تحریروں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ سنین فارسیہ کا حال، ۱۸۶۰ء

"سنین فارسیہ" کے بارے میں خلیفہ احمد علی صاحب احمد[۱] رامپوری کے نام ایک خط میں جو جنوری سے مارچ ۱۸۶۰ء تک کے دوران میں کسی وقت لکھا گیا، غالب کہتے ہیں کہ:

"... فقیر شب کو، آپ کا منتظر رہا۔ آپ تشریف نہ لائے۔ ناچار

۱۔ "خلیفہ شیخ احمد علی صاحب احمد تخلص، ولد شیخ نادر علی تقریباً ۱۲۱۹ھ (۱۸۰۵) میں پیدا ہوئے۔ رامپور کے اکثر فارسی ادب کے علماء کا سلسلہ ان تک منتہی ہوتا ہے۔ نواب خلد آشیاں اور نواب عرش آشیاں طاب ثراہما کی استادی کا بھی شرف حاصل تھا۔ خلیفہ صاحب نے جمعرات کے دن ۲۹ رمضان ۱۳۰۹ھ (۲۸۔اپریل ۱۸۹۲ء) کو ۹۰ سال کی عمر میں اپنے مکان واقع محلہ بنگلہ آزاد خاں (رامپور) میں انتقال کیا۔ ان کی فارسی نظم و نثر کا ایک چھوٹا سا مجموعہ، کتاب خانۂ عالیہ رامپور میں محفوظ ہے۔"
(عرشی، مکاتیب غالب، ص ۱۱۳)

تقریر کو تحریر کا پیرایہ دے کر، آپ کی جناب میں بھیجتا ہوں[1] سنین فارسیہ کا حال بسبیل اجمال ایک دو ورقہ پر مندرج ہے، بنظر اصلاح مشاہدہ ہو۔" (مکاتیب غالب، مرتبہ عرشی ص ۱۱۴)

غالب کے اس خط کی بافت اور سنین فارسیہ سے متعلق ان کی نگارش کے بارے میں مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی فرماتے ہیں:

"میرزا صاحب کا یہ خط مولوی عبدالحکیم خاں صاحب مدرس فارسی، مدرسۂ عالیہ، رامپور سے مبلغ ۲۵ روپے میں خریدا گیا تھا۔ خیال تھا کہ سنین فارسی کی کیفیت پر مشتمل دو ورقہ بھی موصوف الذکر بزرگ کے پاس ہوگا لیکن باوجود تلاش دستیاب نہ ہوسکا۔"

(حواشی، مکاتیب غالب، ص ۱۸۰)

۲ - سولہ شعراء کے تراجم، ۱۸۶۴ء

غالب نے قائم مقام ڈپٹی کلکٹر شہر دھلی مسٹر ریٹیگن کی فرمائش پر اپنے سولہ واقف حال ہم عصر شعراء کا مختصر حال قلمبند کیا تھا، اور جس طور پر قلمبند کیا تھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ساری تفصیل ایک دو ورق میں آ گئی ہوگی، لیکن یہ نگارش، اب معدوم ہے۔ منشی ہرگوپال تفتہ کے نام غالب کے ایک خط، روز جمعہ ۹ - دسمبر ۱۸۶۴ء سے اس کا سراغ ملتا ہے۔ غالب لکھتے ہیں کہ بیماری و ناتوانی کے باعث:

کمشنر و ڈپٹی کمشنر وغیرہ حکام شہر سے ترک ملاقات ہے۔ "مگر ڈپٹی کلکٹر شہر سے، کہ وہ مہتمم خزانہ ہے، ہر مہینے ایک بار ملنا ضرور ہے۔ اگر نہ ملوں تو مختار کار کو تنخواہ نہ ملے۔ ڈکرودر صاحب ڈپٹی کلکٹر چھ مہینے کی رخصت لے کر پہاڑ پر گئے۔ ان کی جگہ

۱- "مرزا غالب رامپور تشریف لائے اور خلیفہ صاحب سے ملاقات ہوئی تو مؤخرالذکر نے اثنائے گفتگو میں عرفی کے کلام پر نکتہ چینی کی۔ مرزا صاحب نے عرفی کی حمایت کی، لیکن اس وقت بحث ناتمام رہی اور یہ طے پایا کہ خلیفہ صاحب شب کو آ کر گفتگو کریں گے۔ معلوم ہوتا ہے، کہ یہ اس رات کو تشریف نہ لے جا سکے۔ اس لئے مرزا صاحب نے اپنے دلائل لکھ کر ان کی خدمت میں بھیج دیئے۔"
(عرشی، مکاتیب غالب، ص ۱۱۳)

ریٹیگن صاحب مقرر ہوئے¹ - ان سے لاچار ملنا پڑا - وہ تذکرہ شعرائے ہند² کا انگریزی میں لکھتے ہیں - مجھ سے بھی انہوں نے مدد چاہی - میں نے سات کتابیں ، بھائی ضیاءالدین احمد خاں صاحب سے مستعار لے کر ، ان کے پاس بھیج دیں - پھر انہوں نے مجھ سے کہا کہ جن شعراء کو تو اچھی طرح جانتا ہے ، ان کا حال لکھ بھیج - میں نے سولہ آدمی لکھ بھیجے ، بہ قید اس کے ، کہ اب زندہ موجود ہیں اور اس سواد کی صورت یہ ہے :

نواب ضیاءالدین احمد خاں بہادر رئیس لوہارو : فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں - فارسی میں نیر اور اردو میں رخشاں تخلص کرتے ہیں - اسداللہ خاں غالب کے شاگرد -

*

نواب مصطفیٰ خاں بہادر ، علاقہ دار جہانگیرآباد : اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے ہیں - اردو میں مومن خاں کو اپنا کلام دکھاتے تھے -

---

۱- اپنے اسی خط مورخہ ۹-دسمبر ۱۸۶۴ء کے آخیر میں غالب لکھتے ہیں کہ : "ریٹیگن صاحب ، اب عدالت خفیفہ کے جج ہوگئے - ڈکرودر صاحب پہاڑ سے آ گئے - اپنا کام کرنے لگے - ریٹیگن صاحب ، شہر سے باہر دو کوس کے فاصلے پر جا رہے -"

تفتہ ہی کے نام ۱۲ فروری ۱۸۶۵ء کے ایک خط میں غالب اطلاع دیتے ہیں کہ : "ریٹیگن صاحب پنجشنبے کے دن ، ۱۹ جنوری ـــــہ حال کو . . . پنجاب کو گئے .. ملتان یا پشاور کے ضلع میں کہیں حاکم ہوئے ہیں - میں اپنی ناتوانی کے سبب ان کی ملاقات تودیع کو نہیں گیا -"

ریٹیگن صاحب ، لاہور میں بھی "حاکم" رہے - چنانچہ یہاں ریٹیگن روڈ ، ان ہی سے منسوب ہے -

۲- تذکرۃالشعراء کے تعارف میں رجوع کیجئے - مضمون "مرزا غالب کی خودنوشت سوانحعمری کا ایک ورق" متعارفہ :

۱- مولوی عبدالحق ، رسالہ اردو ، اورنگ آباد ، جولائی ۱۹۲۸ء ص ۳۲۷-۳۲۹

۲- اظہارالحق ملک ، احوال غالب (آرزو) علی گڑھ ۱۹۵۳ء ۲۴-۲۸

۳- سعیدہ اوھمی ، آج کل ، دھلی فروری ۱۹۵۵ء ص ۷-۱۲ -

منشی ھرگوپال ، معزز قالون گو سکندر آباد کے : فارسی میں شعر کہتے ھیں تفتہ تخلص کرتے ھیں - اسداللہ خاں غالب کے شاگرد -

*

... اصل یہ ہے کہ تذکرہ انگریزی زبان میں لکھا جاتا ہے - اشعار ھندی اور فارسی کا ترجمہ شامل نہ کیا جائے گا - صرف شاعر کا اور اس کے استاد کا نام اور شاعر کے مسکن و موطن کا نام مع تخلص درج ھوگا -''

غرض ، اس انداز پر غالب نے سولہ شاعروں کا حال لکھا - تین کے کوائف بطور نمونہ غالب نے مذکورہ خط میں درج کئے ، یہ محفوظ رہ گئے - بقیہ تیرہ کے اسماء و احوال کی کیفیت کسی اور ذریعے سے معلوم نہیں ھوتی لیکن غالب قیاس یہ ہے کہ بقیہ تیرہ اصحاب ، غالب ھی کے شاگرد ھوں گے اور ان کے حال میں بھی محض نام، تخلص، استاد کے نام اور مسکن و موطن کی صراحت ھوگی ،

غالب کی صد سالہ برسی

اطہر وقار

تمام دنیا کے علمی و ادبی حلقوں نے بڑے عز و اہتمام سے غالب کی صد سالہ برسی منا کر یہ ثابت کر دیا کہ وہ اپنے عہد ہی کا نہیں بلکہ عہد آئندہ کا بھی عظیم شاعر تھا اور یہ کہ غالب نہیں مرا بلکہ غالب کا زوال آمادہ دور مرا تھا غالب تو آج بھی زندہ ہے اور مستقبل میں بھی زندہ رہے گا - آزاد کے لفظوں میں کہا جائے تو غالب کی کرسی شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں مخصوص ہے - یہ اس لئے کہ غالب کا ذہن مستقبل کے خیال آگیں ذہن سے بھی آگے تھا - جبھی تو ان کی شاعری آج کی نسل کو بھی متاثر کرتی ہے اور ان کے خیال افروز کلام میں اس بات کی ضمانت موجود ہے کہ آنے والی نسلیں بھی تہذیب و تمدن کی ترقیوں کے باوجود غالب کی فکر کا اثر قبول کرتی رہیں گی - غالب ان آفاقی قدروں کا شاعر ہے جن پر نسل و رنگ اور زمان و مکان کی بندشیں اثر انداز نہیں ہوتیں - غالب کا ذہن تعصبات کی قید سے یکسر آزاد تھا یہی وجہ ہے کہ اس کا کلام مذہب و ملت کا حصار بھی قبول نہیں کرتا - وہ تو انسانی جذبات و احساسات و تجربات کا شاعر ہے جبھی تو دنیا کا جغرافیائی گوشہ کوئی بھی ہو اگر وہاں انسان بستے ہیں تو اپنے دل کی دھڑکنیں غالب کے کلام میں سنیں گے -

اس کے علاوہ غالب کی عقلیت پسندی وہ خوبی ہے جو سائنسی شعور کی پیہم بیداری سے ماند پڑنے کے بجائے اور زیادہ چمکے گی - یہی وجہ ہے کہ روس جیسے دہریت پسند اور مادیت شعار ملک میں بھی غالب کی مقبولیت روز افزوں ہے اور انسانی دنیا ہی پر کیا منحصر ہے بقول غالب ان کے مداحوں میں روح الامین بھی شامل ہیں اگرچہ کلام کے کیف کی اصلی داد ان کے بس کی بھی بات نہیں - اس لئے کہ انسان کے مقابلہ میں فرشتوں کا استدلال کمزور ہے -

جو شاعر ایسے شعر کہتا ہے:

دیوانگان عشق کی بخشش محال ہے
پیدا کہاں بہشت میں صحرا کرے کوئی

اس کی طرف اہل مذہب ۔ اہل علم اور اہل نظر سب کا متوجہ ہونا یقینی ہے ۔ اور اگر میری بات سخن گستری میں نہ شمار ہو تو میں کہوں گا اس شعر پر تو مشیت ایزدی کا توجہ بخشنا بھی ضروری ہے ۔

بہرنو ۔ غالب کی آفاقیت کا اعتراف دن بہ دن بڑھ رہا ہے میں نے اپنے اس مضمون میں صد سالہ برسی کے متعلق دلیا کے مختلف علمی و ادبی حلقوں کی سرگرمیوں کا سرسری جائزہ لیا ہے ۔ پاکستان کی تفصیلات اس لئے شامل نہیں ہیں کہ اہل ملک یہاں کی تقریبوں سے اچھی طرح واقف اور ان میں برابر کے شریک رہے ہیں :

لندن

لندن اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز کے پروفیسر رالف رسل نے حال ہی میں ایک ٹیلی ویژن انٹرویو میں بتایا کہ لندن میں بھی غالب کی برسی بہت اہتمام سے منائی گئی ایک دن سیمنار منعقد ہوا اور ایک روز موسیقی کا پروگرام ہوا جس میں غالب کی غزلیں گوائی گئیں ۔ اس کے علاوہ رسل صاحب نے بتایا کہ انہوں نے اور ڈاکٹر خورشیدالاسلام نے مل کر غالب کی اردو تخلیقات کا ترجمہ کیا ہے ۔ ابھی غالب کی شاعری پر ایک کتاب لکھی جا رہی ہے جبکہ ان کے حالات زندگی پر اور شاعری پر کتابیں مکمل ہو چکی ہیں ۔

امریکہ

امریکہ میں جشن غالب منانے کے لئے ایک قومی کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی ہے ۔ اور اس کمیٹی نے جشن غالب کے لئے یہ پروگرام بنایا ۔

(۱) غالب کی ببلو گرافی مرتب کی جائے ۔

(۲) غالب سے متعلق تنقیدی نگارشات کا ایک انتخاب مرتب کیا جائے ۔

(۳) ۱۹۶۹ء میں یعنی غالب کے جشن صد سالہ کے موقع پر ہندوستان یا پاکستان کے کسی ادیب کو اردو ادب پر کام کرنے کے لئے مدعو کیا جائے ۔

فرانس

فرانس میں بھی جشن غالب منانے کے سلسلے میں ایک قومی کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی ہے جس کے صدر ڈاکٹر لاکومب پروفیسر جے فلیوز ہونگے اور پروفیسر گم برے تیر فرانسیسی قومی کمیٹی کے سکریٹری ہونگے ۔ پروفیسر گم برے تیر غالب کی دس غزلوں کا ترجمہ فرانسیسی میں کر رہے ہیں ۔

(ج) یونیسکو پیرس میں جشن غالب کے لئے مندرجہ ذیل پروگرام پیش کیا گیا ۔

(الف) غالب پر ایک بین الاقوامی سیمنار منعقد کرایا جائے جو یونیسکو کے پارٹی سی پیشن پروگرام کے تحت ہو ۔

(ب) اس جشن میں حصہ لینے کے لئے امریکہ ، فرانس ، انگلستان ، سوویت یونین ، ھالینڈ ، ایران ، افغانستان ، چیکو سلواکیہ ، پاکستان وغیرہ سے آنے والے عالموں کو یونیسکو سفر خرچ فراہم کرے ۔

(ج) یونیسکو ان مقالات کو غالب پر ایک یادگار جلد کی شکل میں شائع کرے ۔ اس کے علاوہ فرانس میں غالب پر تحقیقی کام کرنے کے سلسلے میں کئی اور پروگرام بھی بنائے گئے ہیں ۔

پراگ

چیکو سلواکیہ میں بھی جشن غالب کے سلسلہ میں ایک کمیٹی قائم ہوئی ہے اور یہ فیصلہ ہوا کہ غالب کی شاعری سے متعلق متعدد مضامین چیک زبان میں شائع کئے جائیں گے فروری کے ماہ میں ایک محفل موسیقی منعقد ہوگی ۔ جس میں غالب کے اشعار کا ترجمہ چیک زبان میں سنایا جائے گا اور کلام غالب کو موسیقی کے ساتھ پیش کیا جائے گا ۔ اس کے علاوہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر غالب کی شاعری اور حالات زندگی پر تقاریر ہوں گی ۔

بھارت

بھارت میں بھی جشن غالب منانے کے سلسلے میں ایک کمیٹی بنائی گئی ہے ۔ اس کے چیئرمین بھارت کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین ہیں ۔ جشن غالب تمام دنیا میں منایا جا رہا ہے لیکن پاکستان کے بعد سب سے زیادہ کام شاید بھارت میں ہو رہا ہے ۔ یہاں غالب اکیڈیمی بنائی گئی اور اسی میں ایک لائبریری اور ایک ہال بنایا گیا ۔ ۱۲ فٹ لمبا غالب کا مجسمہ تیار کرایا گیا ۔ غالب پر کتابیں تصنیف کی گئیں پروفیسر خواجہ احمد فاروق (سکریٹری انٹرنیشنل آرگنائزنگ کمیٹی جشن صد سالہ غالب) نے جشن غالب کی کمیٹیوں کی تنظیم کی غرض سے دنیا کے نو ممالک کا سفر کیا ۔

پرانا موسم نئی ہوا

(ن ۔ م ۔ راشد ، احمد ندیم قاسمی)

مدیر

"پرانے" نیو ہوسٹل سے میں نے انٹر نیشنل ہوٹل فون کیا ۔ ن ۔ م راشد صاحب سے تعارف کے بعد عرض کی کہ غالب کے بارے میں کچھ باتیں کرنا ہیں ۔ انہوں نے غیر متوقع طور پر کہا کہ ابھی چلے آؤ ۔ میں اس کے لئے ہرگز تیار نہیں تھا ۔ یہی سوچا تھا کہ بڑے آدمیوں کی طرح اگلے دن یا اس سے بھی اگلے دن شاید کچھ وقت مل جائے۔ بیرون ملک سے چند روز کے لئے آیا ہوا انسان اور پھر شاعر اور نقاد انسان اپنے ھی ملک میں مہمان بن کے رہ جاتا ہے ۔ لاھور میں تو کراچی اور "وھاں" سے آنے والے لوگ بھی اچھے خاصے مصروف ہو جاتے ھیں ۔ راشد صاحب تو ایران سے آئے ھیں ۔ پھر انہیں کیوں سر کھجانے کی فرصت ملے اور ہم ایسے سر پھروں سے سر کھپانے کی مہلت نصیب ہو ۔ جیسے وہ ایران میں پاکستان کے سفیر نہ ہوئے پاکستان میں شعر و ادب کے وزیر ہوگئے ۔ وزیر کے لفظ سے لوگوں کے ذہن میں وسوسے پیدا ہونے لگتے ہیں مگر اس کا کیا علاج کہ میں ابھی قافیے کے چکر سے نہیں نکل سکا ۔

راشد صاحب ایک گھنٹے کے لئے ہوٹل میں تھے ۔ اس کے بعد انہیں کہیں اور جانا تھا ۔ وقت بہت کم تھا مگر مجھے اس کا کہاں غم تھا ۔ صرف حیرت تھی حیرت میں کچھ کچھ فکر گھلنے لگی تھی ۔ اس محلول میں سوالات کے بلبلے اٹھ بیٹھ رہے تھے ۔ ذہن کے کمرۂ جماعت میں بہت سے سوالات نے ھاتھ کھڑا کررکھا تھا ۔ یہ فیصلہ مسئلہ بنتا جا رہا تھا کہ پہل کس سے ہو ۔ تذبذب کی چھڑی ھاتھ میں لئے میرا احساس کسی خشمگیں استاد کی طرح بپھر گیا۔ کئی اٹھے ہوئے ھاتھ لرزگئے کچھ جھکنے کو آئے اور چند ایک تیورا کر گر پڑے میں نے جلدی سے اشرف عظیم کو آواز دی ۔ اشرف بی ۔ اے میں

پڑھتا ہے ابھی "کنوارہ" ہی ہے - عمر بھی کیا ہے بے چارے کی - مگر اتنی کچی عمر میں بڑی پکی باتیں کرتا ہے - خوب نظمیں لکھتا ہے - جدید اتنی کہ شدید سمجھئے اور آزاد ایسی کہ زندہ باد کہنے کو جی چاہے - مجھ سے اکثر گلہ کرتا ہے کہ تم ابھی تک غزلوں کی لدی میں جُتے جا رہے ہو - آزاد نظم کے سوئمنگ پول میں کبھی نہاؤ تو مزے آجائیں ایمان سے - تیراک تو تم اچھے خاصے ہو - آنکھیں بند کرکے بسم اللہ کر ہی دو کبھی -

راشد صاحب کا سنتے ہی چھلے تو اشرف حیران ہوا پھر مسکرایا اس کے بعد عینک ٹھیک کی، آخر میں ڈائری نما بیاض ہاتھ میں لی اور کہنے لگا -

"یار مذاق تو نہیں کر رہے" -

"ہم تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

تم یہی کہنا چاہتے تھے نا - مگر مذاق میں تو قطعاً نہیں کر رہا البتہ راشد صاحب کے ارادے ایسے ہی لگتے ہیں ؟"

"بھئی نیازی آزاد نظم میں اس شخص کا جواب نہیں"

"وہ تو مان لیا مگر تمہارے پاس کوئی سوال بھی ہے"

"سوالوں کی گٹھڑیاں ہیں گٹھڑیاں"

"ایک گٹھڑی تو تم خود اور دوسری - خیر ذرا کس کے باندھ رکھنا - کہیں راستے ہی میں نہ سارے سوال گرتے جائیں اور وہاں تک صرف کپڑا بچ رہے - کورا لٹھا"

ہم چل پڑے تو گھڑی کی سوئیاں دل کی دھڑکنوں سے بھی تیز رفتار ہو گئیں اور رکشے کا میٹر تو اس سے بھی کچھ آگے بڑھ گیا - یوں تو میں رکشے کو زحمت دینے کا گناہ کبھی نہیں کیا کرتا - اپنی ستر اسی ہزار کی اونی بس کی اوپر کی منزل میں ڈرائیور والی سیٹ پر بیٹھ کر سیاحت کا جو مزہ آتا ہے وہ شیورلیٹ کار کی پچھلی سیٹ پر محسوس بھی نہیں کیا جا سکتا - بس کی گراونڈ فلور پر بھی خاصے فائدے ہیں مگر وہ صرف کنڈکٹر یا اس سے ملتی جلتی مخلوق کے لئے مختص ہیں - ہم اتنے

خوش قسمت کہاں - جب رکشے کے میٹر نے نہایت روانی سے ہندسوں کی گنتی شروع کردی تو اشرف عظیم نے حسرت سے میری طرف دیکھا اور میں نے باہر دیکھنا شروع کر دیا -

"مدیر راوی صاحب ! آپ کو ٹی - اے - ڈی ، اے تو ملتا ہوگا کالج کی طرف سے"

"ٹی - اے ، ڈی - - کیا مطلب؟ کسی آزاد نظم کا پلاٹ تو نہیں سوجھ رہا تمہیں - ویسے اچھا سوال ہے - پوچھیں گے راشد صاحب سے - انشاللہ تعالیٰ - "

رکشے سے اتر کہ اشرف عظیم نے اس چابکدستی سے کرایہ ادا کیا جیسے رشوت دے رہا ہو اور مجھے یوں لگا جیسے میری ضمانت ضبط ہو گئی ہو -

راشد صاحب کے پاس اس وقت منیر نیازی صاحب بھی موجود تھے - "بھئی دولوں نیازی"، راشد صاحب کی آواز تجسس میں ڈوب کر ابھری -

منیر نیازی کو کچھ دیر بعد پتہ چلا تو وہ بالکل حیران نہ ہوئے اور ثابت کیا کہ مجھے پہچانتے ہیں -

ہمیں دیکھتے ہی راشد صاحب سٹوڈنٹ لائف میں لوٹ آئے - نجانے یہ برسوں کی مسافتیں یوں پلک جھپکتے میں کیونکر طے ہو جاتی ہیں - آگے جانے کے لئے تو ایک ایک سیڑھی چڑھنا پڑتا ہے - مگر ماضی میں پلٹنے کے لئے لوگ وہیں سے نیچے چھلانگ لگا دیتے ہیں - غالب نے تو فقط اتنا یقین دلایا تھا -

مہرباں ہوکے بلالو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آبھی نہ سکوں

ہماری خواہش پر جب راشد صاحب آئے تو گئے وقت کو بھی اپنے ساتھ بلا کر لے آئے -

"جب میں راوی کا مدیر تھا - میں نے بغیر اجازت کے راوی کا ایک اولڈ راوینز نمبر نکالا تھا - مجھے معلوم تھا کہ اجازت

نہیں ملے گی - چنانچہ میں نے اس تکلف کے بغیر ہی کام چلا لیا - خاصا ہنگامہ ہوا - پہلے التباہ کے اصول پر عمل کیا گیا پھر تحسین کے پھول عطا کئے گئے - بعد میں ایک اعزازی سرٹیفیکیٹ بھی ملا ''

میرے دل کے کسی کونے کھدرے سے اسی دیرینہ خواہش نے سر اٹھانے کی کوشش کی - یہ نجانے کب سے وہاں دبکی پڑی ہے - مگر اب اجازت والے دروازے پر سخت پہرہ ہے - اندر ہر کوئی آسکتا ہے مگر باہر نکلنے پر پابندی ہے - میں نے راشد صاحب سے ذکر کیا تو انہوں نے مجھے اپنے نقش قدم پر چلنے کا مشورہ دیا - اب میں ان سے کیا عرض کرتا کیسے عرض کرتا -

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

پھر وہ راشد صاحب والے زمانے کہاں - شگفتہ شگفتہ جانے کہاں -

وہ شب و روز و ماہ وسال کہاں -

فرصت کاروبار شوق کسے ذوق نظارۂ جمال کہاں
تھی وہ اک شخص کے تصور سے اب وہ رعنائی خیال کہاں
واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں

اشرف عظیم نے جب مجھے نجانے ''کہاں کہاں'' بھاگتے ، تاکتے اور جھانکتے دیکھا تو غالب کی شاعری کے مستقبل کے بارے میں ایک سوال چھوڑ دیا - اشرف عظیم کو شاعری کا مستقبل بہت عزیز ہے اور میں کہا کرتا ہوں - ماضی بھی بہت میٹھی اور قیمتی چیز ہے - مستقبل کا پودا تو اسی بیج سے پھوٹتا ہے - البتہ حال کے ہاتھ اس کی نگہبانی ضرور کرتے ہیں - کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے ماضی کہیں بہت پیچھے دھندلکوں میں کھو جاتا ہے - پھر اچانک وہ بہت بڑا چکر لگا کے سامنے کی طرف سے اپنی پیشانی پر مستقبل کا سہرہ سجائے آجاتا ہے اور ہم جدتوں کی روشنیوں میں کچھ بھی نہیں دیکھ پاتے - میں ماضی ، حال اور مستقبل کی اس ازلی اور ابدی تکون میں نظر بند ہوگیا - راشد صاحب کا جواب بہت دور سے سنائی دیا - جو اشرف عظیم نے میری طرف بڑھا دیا -

''غالب کی شاعری کا مستقبل ہمیشہ روشن رہے گا - اس کے کلام میں ہئیت کی بہ نسبت سوچ کا عنصر زیادہ شامل ہے - اس کی شاعری

سوچ کی شاعری ہے - فکر کی دعوت دیتی ہے - اور ایسی شاعری زندہ رہا کرتی ہے - "

"غالب سے آپ کا پہلا تعارف کب ہوا - "

میں نے پھر گزرے ہوئے لمحوں کو پکارا - مستقبل کچھ دور رک گیا - ماضی و حال بغلگیر ہو کر لب بہ لب ہوگئے - راشد صاحب نے پرانی باتیں اس طرح دھرائیں جیسے ماضی نہ ہوا پھٹی پرانی کتاب ہو گئی جسے وہ صفحہ بہ صفحہ الٹتے چلے گئے - پرانے دلوں پہ نئے لفظوں کا رنگ چڑھنے لگا

"ہم اس وقت نویں جماعت میں پڑھتے تھے - منٹگمری جو اب ساہیوال ہے "

ساھیوال کا سن کر منیر نیازی صاحب نے دلچسپی لینا چاہی - ع

اس بےوفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو

کچھ لوگ کہتے ہیں یہ انہوں نے لاہور کے بارے میں کہا ہے - میرا بھی یہی خیال ہے - اگرچہ وہ خود ساہیوال شریف میں سکونت پذیر ہیں ہندوستان سے آکر - اکثر لاہور دیکھے جاتے ہیں -

"ساہیوال میں ہمارے محلے میں ایک بزرگ عبدالحمید عاصی صاحب تھے - دیوان غالب کے حافظ تھے - ہمیں اکثر کلام غالب ان سے سننے کا مرقعہ ملا مگر سمجھنے کا معاملہ ابھی انگوٹھا چوسنے کی سٹیج پر تھا - اس کے لئے کئی ایک شرحیں بعد میں دیکھنے کا اتفاق ہوا مگر وہ سب فضول تھیں، اور مرے سامنے کئی ایک اور شرحیں بھی ایک ساتھ گھوم گئیں -

"اس طرح ہمیں غالب کو پڑھنے کا شوق پیدا ہوا - اس کے بعد ہم بی - اے میں پہنچے تو گورنمنٹ کالج میں مولوی کریم بخش صاحب کو غالب پڑھانے پر مامور کیا گیا - وہ عربی کے ایم - اے تھے - نجانے محکمۂ تعلیم والوں نے کیا سوچ کر انہیں یہ فرض سونپ دیا تھا کیا اب بھی اس قسم کی - - - "

"جی ہاں مگر اب اس کی کیفیت دوسری ہے - پہلے مولوی اردو پڑھاتے تھے اب مسٹر پڑھاتے ہیں - وہ عربی میں یکتا یہ انگریزی کے ماہر - اردو

دونوں کو نہیں آتی ۔ غالب کے شعروں کا جو حشر ہوتا ہوگا وہ آپ سمجھ گئے ہوں گے ۔"

یہ سن کر راشد صاحب نے پائپ منہ میں دبالی اور دھواں کمرے کی فضا میں حل ہونے لگا ۔

"مولوی صاحب دراصل کٹھ ملا تھے ۔ عشق کا لفظ پڑھتے ہی بے طرح شرما جایا کرتے تھے ۔ ان کا رنگ خوں رنگ ہو جاتا تھا کچھ غصے سے ۔ اور کچھ شرم سے وہ کتاب پٹخ دیتے اور کمرۂ جماعت سے بھاگ کھڑے ہوتے ۔ میں یہ خرافات نہیں پڑھا سکتا اور ہم انہیں اس بات سے اکثر چھیڑا کرتے تھے"

اس وقت بھی شرارت راشد صاحب کے لہجے میں کھنک رہی تھی جیسے وہ آج بھی اس چھیڑ چھاڑ سے محظوظ ہو رہے ہوں ۔ یوں بھی عشق کا کا لفظ خاصا خطرناک ہے ۔ غالب کو تو خدا نے بچا لیا ۔ اس کی حقیقت منٹو سے سے پوچھو کہ جب ایک افسانے پر "بد زبانی" کے الزام میں مقدمہ چلا اور پوچھا گیا کوئی "قابل اعتراض لفظ" تو ارشاد فرمایا گیا مثال کے طور پر ۔ جیسے اسی "عشق" کو لے لیجئے ۔ ویسے آج کل کے طالب علم بہت سعادت مند ہیں ۔ وہ معاذاللہ استادان محترم کو چھیڑتے تو نہیں ۔ صرف ڈانٹتے ہیں اور کبھی واقعی ڈانٹ دیتے ہیں ۔ البتہ اسداللہ خان غالب کی طرح چھیڑ خوباں سے چلی جاتی ہے اور چلی ہی جاتی ہے کہ حسرتیں مٹ کر حیرتوں کی صورت میں نمودار ہونے لگتی ہیں ۔

"آخر غالب کے خلاف مولوی صاحب کے اس والہانہ طرز عمل نے آپ پر کچھ تو اثر کیا ہوگا"

"بالکل نہیں ۔ ہم نے اس وقت محسوس کرلیا تھا کہ غالب بہت بڑا شاعر ہے ۔ اس کی عظمت کے بت کو تنگ نظریوں کی قبا میں نہیں چھپایا جا سکتا"

راشد صاحب کے اس بے لاگ اظہار نے مرے ذہن کو بے تکلفی پر اکسایا ۔ غالب کے تین مصرعے اس گنبد میں گھومنے اور گونجنے لگے ۔ ع

غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے
غالب کو برا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے
غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے

ان میں سے کونسا مصرعہ اس صورت حال پر صادق آ سکتا ہے کیا راشد صاحب نے بھی اس کے استعمال کی ضرورت محسوس کی ہوگی - جی چاہا بھی کہ پوچھوں مگر دل ناداں کو نجانے کیا ہوگیا کہ بہ صدائے باز گشت سننے پر راضی نہ ہوا -

"آپ کو غالب کی شاعری کا کونسا پہلو پسند رہا - کونسا رنگ زیادہ بھایا - یعنی وہ کیا انداز ہے جسے وہ 'اور ' کہتے ہیں -" میں نے دل کی بات سننے کی کوشش کی -

غالب کی شاعری میں فلسفے اور ذوق کی آمیزش - فکر میں شگفتگی کی ملاوٹ - وہ سوچتا ہے - سوچنے کی دعوت دیتا ہے - مگر سنجیدگی طاری نہیں کرتا - دوسرے فلسفیوں کی طرح خشک باتیں نہیں کرتا - اس کے کلام میں تازگی اور نشاط کا عنصر شامل ہے - مومن اور درد کے ہاں بھی کہیں کہیں فلسفہ نظر آتا ہے - ذوق اکیڈمک فلسفے کا قائل تھا - مگرغالب کا انداز منفرد اور شگفتہ ہے - غالب کا ایک شعر ہے -

جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں
ایسی جنت کو کیا کرے کوئی

عیسائیت اور اسلام میں جنت کا تصور ساکت ہے - مگر اسے غالب ساکت ماننے کو تیار نہیں وہ اسے عام زندگی کی طرح دیکھتا ہے اور متحرک سمجھتا ہے - یعنی اگلی دنیا بھی وقت کی قید سے ماوریٰ نہیں - پھر لاکھوں برس کی حوروں والی جنت کس کام کی -"

اس بات سے شاید اشرف عظیم کو غالب پر کچھ شک گزرا پھر ہندوؤں کی سازشیں بھی کچھ کم نہیں - تشکیک ، تجسس میں ڈھل گئی -

"غالب کو ہندوؤں کا شاعر ثابت کرنے کی کوششوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"تو پھر میں کیا کر سکتا ہوں" راشد صاحب نے جیسے معذوری کا اظہار کیا -

میں نے تو اشرف کی مدد کرنا ہی تھی - جذبات لفظوں کا روپ دھار گئے -

"شاید اشرف صاحب یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ وہ کونسا جذبہ ہے - کس طرح کی مصلحتیں ہیں کیا حالات ہیں کہ وہ لوگ غالب کو ہندو شاعر سمجھنے کی خوش فہمیوں

کی چاند رات میں قہقہے لگائیں - کیا اس کے پس منظر میں انہی نفرتوں ، کدورتوں تنگ نظریوں اور کوتاہ اندیشیوں کا غبار تو نہیں جس نے تاج محل کی رفعتوں کو کہرآلود کرنے کی کوشش کی تھی - ادب اور شاعری ذات پات اور فرقوں قوموں کے کچے دھاگوں میں بندھی نہیں رہا کرتی مگر ان دھوتی پوشوں کی بدنیتی کے واشگاف مظاہرے ملاحظہ کیجئے کہ ہر ایسے موقع پر انہیں احساس کمتری کے شدید جھٹکے محسوس ہونے لگتے ہیں - (میرا اشارہ وہاں کے ایک مخصوص طبقے کی طرف ہے) غالب ایک عظیم شاعر تھا - بس بات ختم - یہ مسلمان دشمنی کا جذبہ تو ہے ہی - اس سے کہیں زیادہ غالب کی عظمت کا منہ چڑانے کی کوشش ہے - "

"غالب تمام دنیا کا شاعر ہے - اس کے کلام میں ہمہ گیریت اور آفاقیت ہے - ہر شخص اس کی شاعری کو اپنا ترجمان سمجھتا ہے - اس میں مسلمان یا ہندو ہونے کا کوئی جھگڑا نہیں" راشد صاحب نے فیصلہ کن انداز میں کہا -

" کیا اب یا اب سے کچھ عرصہ بعد کسی نئے غالب کے پیدا ہونے کی امید ہے" اشرف عظیم نے بڑے پرامید لہجے میں پوچھا -

"ہر شخص اپنی جگہ غالب کی سی اہمیت رکھتا ہے"، راشد صاحب خاصے اہم انداز میں بولے "میر اور غالب جیسے فنکار اپنی زندگی کے پس منظر میں رکھ کر دیکھے جا سکتے ہیں - ان کی زندگی کے مشاہدے ، تجربے ، حالات داخلی معاملات کے ساتھ مل کر شاعری کی صورت میں نمودار ہوئے ہیں - کسی موجودہ یا آئیندہ شاعر کا موازنہ غالب یا کسی بڑے شاعر سے کرنا مناسب نہیں - مثلاً آپ منیر نیازی اور میر تقی میر کا موازنہ کس طرح کریں گے - اس قسم کے موازنے نہیں ہوسکتے - میر کی بزرگی تسلیم مگر ہو سکتا ہے کوئی ایسا وقت آئے جب منیر نیازی کسی لحاظ سے میر تقی میر سے بھی زیادہ اہم ہو جائے - غالب سے اچھا شاعر بھی کوئی ہو سکتا ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ وہ ضرور غالب جیسا شاعر ہو - غالب سے اچھی شاعری تو ممکن ہے - غالب کی طرح شاعری کیسے ممکن ہو سکتی ہے - "

یہ کہہ کر راشد صاحب کہیں اٹھ کر گئے تو منیر نیازی صاحب سے گپ شپ ہونے لگی - انہوں نے بڑے شاعرانہ انداز میں بتایا کہ ایک

دن مجھے انجم رومانی کہنے لگا کہ تمہاری شاعری میں کہیں غالب چھپا بیٹھا ہے - اور اے حمید نے انکشاف کیا کہ تمہارے کلام میں غالب اور اقبال دونوں اکٹھے ہو گئے ہیں -

اب ہم سوچنے پر مجبور کہ کس کی بات درست ہے - بہرکیف کچھ نہ کچھ درست ہے ضرور - منیر نیازی کا منفرد لہجہ اور مخصوص انداز کوئی نہ کوئی بات منوا کر ہی رہے گا۔ منیر نیازی صاحب راشد صاحب کی کتاب لا انسان کو اک نئے طور سے چھاپ رہے ہیں -

دیکھتے ہی دیکھتے اشرف عظیم کو اپنی نظموں کا خیال آیا - اس نے وہاں ہمیں کوئی لگ بھگ تین کے قریب نظمیں سنائیں اور خاصی داد سمیٹی - نظم میں استعمال کئے گئے ایک لفظ "حسین" پر راشد صاحب کو اعتراض تھا - نجانے اس لفظ سے انہیں کیوں دشمنی ہوئی - یہ تو ہوا ان کا ذاتی معاملہ - انہوں نے یہ بھی انکشاف کیا کہ میں نے ایک دفعہ یہ لفظ استعمال کیا تھا اور اب تک نادم ہوں - عمدہ - برا - اچھا - اس قسم کے لفظوں سے احتراز کرنا چاہئے - تنقید میں کوئی چیز سو فیصد بری یا اچھی نہیں ہوا کرتی - اکثر بحثوں کے دوران کہا جاتا ہے کہ فلاں نظم شاعر کی ایک کامیاب کوشش ہے - اس کا کیا مطلب ہے - یعنی دوسری ناکام ہیں اور ان کے مقابلے میں یہ کامیاب ہے - اشرف کی ایک نظم میں لفظ "تراشتا" کو راشد صاحب نے "تلاشتا" سنا اور کہا کہ اگر یہ لفظ ہوتا تو خوب تھا کیونکہ یہ ایک نیا لفظ تھا - انہوں نے اپنی دو "نئی" ترکیبوں ، امکانات بریں اور نئی تند شراب کی تلمیحاتی وضاحت کی جو بہت دلچسپ تھی -

آخر میں میں نے ایک غیر شاعرانہ سا سوال پوچھا جسے راشد صاحب نے خالص شاعرانہ رنگ دے دیا "کنہیا لعل کپور کے ڈرامے "غالب جدید شعرا کی محفل میں" کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے - کہتے ہیں آپ نے نام بدل کر اس کی صدارت کی تھی"

"میرے نزدیک یہ کوئی اچھی چیز نہیں" راشد صاحب شاید ناراض ہوگئے "نام بگاڑ کر مزاح پیدا کرنے کی کوشش بچوں والی حرکت ہے - اس سے اعلیٰ مزاح پیدا نہیں ہو سکتا - مثلاً فیض احمد فیض کے بارے میں غیظ

احمد غیظ کا لفظ کتنا نامناسب ہے ۔ مختلف شعرا کی پیروڈی کسی حد تک اچھی ہے ۔ اس ڈرامے کی کچھ چیزوں سے مجھے اتفاق ہے ۔ لیکن یہ ڈرامہ وہ تاثر پیدا کرنے میں ناکام رہا جو کپور صاحب کے ذہن میں تھا ۔ غالباً وہ کہنا چاہتے تھے کی جدید شعرا کی نظمیں غالب کی سمجھ میں بھی نہیں آسکتیں ۔"

اس نکتے سے مجھے کپور صاحب کی وکالت کا موقعہ مل گیا ۔

" نہ سمجھ میں آنے والی بات مرزا غالب اور جدید شعرا میں قدر مشترک ہے ۔ اپنے وقت میں غالب کا بھی تو یہی حشر ہوا تھا ۔ "

''ہاں اس لحاظ سے مضمون اچھا ہو سکتا ہے ۔ یہ بات معقول ہے ۔ دراصل قصہ یوں ہے کہ شاعر تو قاری کی سطح تک اترنے سے رہا ۔ لوگ شاعر کو تو لیچے بلاتے ہیں مگر خود سمجھنے کی کوئی تدبیر نہیں کرتے ۔ ہم لفظ کے معانی تو جان لیتے ہیں مگر معانوں کے معانی جاننا اتنا آسان کام نہیں ۔ مجھے ایک مرتبہ ڈاکٹر ابوالیث صدیقی صدر شعبۂ اردو کراچی کی دعوت پر اردو ادب کے طالب علموں کو اپنی نظمیں سنانے کا موقع ملا ۔ اس کے بعد سوالات کئے گئے ۔ سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ہم غالب کے اشعار تو سمجھ لیتے ہیں مگر آپ کی نظمیں سمجھنے سے قاصر ہیں میں نے عرض کیا کہ حضور آپ نے غالب کو سمجھنے کے لئے کوئی ذریعہ تو اختیار کیا ہوگا ۔ اس کے بعد بھی کوئی ثبوت نہیں کہ آپ نے پوری طرح سمجھ لیا ہو ۔ غالب نے جس انداز میں کہا ۔ ہو سکتا ہے آپ کی اپروچ مختلف ہو ۔ پھر یہ غالب کے مرنے سے خاص مدت بعد ہوا ۔ اس مدت کے دوران میں مطالب میں اختلاف بھی ہوئے ہیں اور اب بھی گنجائش ہے ۔ اس کے برعکس آپ ہماری نظموں سے جداگانہ سلوک روا رکھتے ہیں ۔ ہمیں بھی آپ اسی طرح سمجھنے کی کوشش کریں ۔ اس کے علاوہ وہ شعر ہی کیا ہے جو پہلی مرتبہ سننے سے سمجھ میں آ جائے ۔ شعر کا تاثر تہ در تہ ہوتا ہے ۔ جوں جوں اور جیسے جیسے غور و فکر بڑھتا جاتا ہے ۔ مطالب و مفاہیم نمایاں ہوتے چلے جاتے ہیں ۔ شاعر کا یہ مقصد نہیں کہ جو کچھ ہے ۔ وہ کس طرح ہے بلکہ جو کچھ نہیں وہ کس طرح ہونا چاہئے "

راشد صاحب جب پوری طرح ماحول پر چھا گئے تو چپ ہوگئے سحر ٹوٹا تو ہم گویا ہوئے

ہم اسی ''ان ہونے کچھ'' کی چاہت میں آپ کے پاس پہنچے تھے - بہت شکریہ آپ کا - '' میرا ہاتھ اجازت مانگنے کے لئے ان کی طرف بڑھا -

''مجھے بہت خوشی ہوئی ہے - پھر آپ تو میرے اپنے کالج کے طالب علم ہیں اور اس رسالے کے مدیر ہیں جس کی ادارت کا مجھے بھی فخر ہے ''

راوین دوستی کا احساس راشد صاحب کے چہرے کے ایک ایک تاثر میں جھلمل جھلمل کر رہا تھا ہم ہوٹل سے باہر نکل کر مال روڈ کی وسعتوں میں تحلیل ہو گئے - ایک گھنٹے تک پگلی ہوا کے کسی لاوارث جھونکے کی طرح بھٹکتے پھرے - ہمارے لئے نہ کوئی ٹیکسی رکی نہ رکشا ٹھہرا اور نہ ہی بس آئی - بھلا کسی انجان کار کا دروازہ کیسے کھلتا - ہمیں یوں ''بےکار'' دیکھ کچھ بدمستوں نے اپنی کاروں کے شیشے چڑھا لئے -

'' یار کسی سے لفٹ ہی لے لیں - خالی جارہی ہیں - تھک تو نہیں جائیں گی'' اشرف تیورا گیا

''نہیں یوں نہیں - اس طرح ہم تھک جائیں گے دوست ! یہ ہمیں کہیں اور چھوڑ آئیں گی - کار میں بیٹھ کر اک ''عجیب اور غریب'' سا احساس برتری طاری ہو جاتا ہے جو احساس کمتری کی بگڑی ہوئی دوسری صورت ہے''

مگر پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں'' اشرف عظیم نے اپنے ہاتھ کو بڑے غور سے دیکھا جیسے یہ حقیقت پہلی بار اس پر آشکار ہوئی ہو

احمد ندیم قاسمی

یہ فقط میرا تخلص ہی نہیں ہے کہ ندیم
میرے کردار کا کردار ہے اور نام کا نام

ندیم کے لفظ سے جس قسم کے انسان کا تصور ابھرتا ہے - احمد ندیم قاسمی صاحب اس کی مکمل تصویر ہیں - ان سے مل کر اک نفیس سی اپنائیت کا احساس ہوتا ہے - ان کے ٹھہرے ہوئے لہجے میں نجانے کتنے جذبوں کے انداز تڑپتے ہیں - شعر پڑھتے ہیں تو احساسات کے سمندر میں تموج پیدا ہو جاتا ہے - اہل سخن اور اہل قلم لوگوں کی مخصوص بےمروتی اور منفرد بےادائی ندیم صاحب تک پہنچتے پہنچتے ان کے قدموں میں ڈھیر ہو جاتی ہے - محبت محبت کی

رٹ لگانے والے لوگ خود کیوں اتنے روکھے پھیکے ہوتے ہیں - اپنے ادیبوں سے ہمیں یہ بجا اور کھلا شکوہ ہے -

ندیم صاحب کے پاس پہنچنے کے لئے انارکلی کو عبور کرنا پڑتا ہے - اس دن ایک بج چکا تھا مگر وہاں لوگوں کا ایک جلوس رواں دواں تھا - آج کل جلوسوں کی رسم چل پڑی ہے - اچھی رسم ہے مگر انارکلی میں اس کا رواج پا جانا کچھ اتنا اچھا بھی نہیں - نجانے لوگ کیا خریدتے رہتے ہیں - اشرف اور میں تو کچھ دن اوپر ایک ماہ کے بعد آئے تھے - ویسے کبھی کبھی ایک آدھ ''چکری'' لگ ہی جایا کرتی ہے -

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جاکر دل و جاں اور

شاید یہ ''تم'' صاحب نے اپنے شہر میں مستقل سکونت اختیار کرلی ہے - ورنہ انارکلی میں ہرروز اتنی زیادہ بھیڑ کا کیا مطلب ہے - ہر دوسرے دن دو چار سو زیادہ ہی ہوتے ہیں - بعض لوگ باغ جناح یا سینما ہال یا کالج کیمپس کی بجائے یہاں رونق میلہ دیکھنے آجاتے ہیں - اب تو یہ ان کا معمول ہے - کالجوں کے ''لوگ'' اکثر ادھر کا پھیرا کرتے ہیں- کہتے ہیں اس طرح موڈ ٹھیک ہو جاتا ہے- (خدا بہتر جانتا ہے) - ہمارا موڈ تو ہماری طرح قلندر مزاج ہے - اِدھر بھی - ع

دل کے بہلانے کو غالب یہ ''بزار'' اچھا ہے

ہم نے لوگوں کے اس بہتے ہوئے اژدہام سے پھسل کر ندیم صاحب کے پاس پناہ لی - فنون کے جدید غزل نمبر کی بات چھڑی - اس کی ضخامت کا اندازہ کیجئے کہ بقول قتیل شفائی صاحب گھر تک لے جانے کے لئے ریڑھے کی ضرورت ہے اور بوقت ضرورت کام بھی آئے گا جب آپ قیمت سن کر ہم بے ہوش ہو جائیں گے - ''بیس روپے'' - ندیم صاحب فنون کو ماہنامہ بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں - یہ بات اس لئے خوش آیند ہے کہ اکثر ادبی جریدے سہ ماہی ہیں اور تین مہینے کا انتظار کسی طرح بھی انتظار یار سے کم نہیں - مگر ماہنامے کے لئے اردو ڈائجسٹ کی سی باقاعدگی بھی تو چاہئے - ایک ماہنامہ اردو زبان ہے جو اردو زبان ہی کی طرح اپنی حیثیت اور اہمیت منوانے کی کامیاب کوشش میں مصروف ہے - ماہ نو اسم باسمہ اور دو ایک دوسرے- فنون شاید اس میدان میں یکہ و تنہا تو نہ ہو - البتہ یکتائی اور انفرادیت والا فیصلہ قارئین کے پاس محفوظ ہے -

خاصی دیر تک ادھر ادھر اور یہاں وہاں کی باتیں ہوتی رہیں ۔ چائے کے ایک ایک جام کے بعد غالب کے بارے میں گفتگو شروع ہوئی ۔ غالب کی شراب نوشی کی سنت اب اسی صورت میں ادا ہو رہی ہے ۔

''آپ نے کس عمر میں غالب کو پڑھنا شروع کیا'' ۔ میں نے ندیم صاحب کے چہرے پر ماضی کے نقوش ڈھونڈنے کی کوشش کی ۔

''میرے گھر کا ماحول ادبی تھا ۔ اس لئے میں نے بہت پہلے غالب کے اشعار سنے 'اور پڑھے ۔ بچپنے اور لڑکپنے کے درمیان ہی کوئی دن تھا ۔ اس وقت اچھی یا بری شاعری کا احساس نہ تھا ۔ چھوٹی سی کتاب تھی ۔ بس شوق ہی شوق میں پڑھی ۔ میٹرک کے بعد شعور میں کچھ پختگی آئی ۔ خود بھی شاعری شروع کی تو محسوس ہونے لگ گیا کہ غالب بڑا شاعر ہے'' ندیم صاحب نے نئے زمانے کے ساغر میں پرانی باتوں کارس انڈیل دیا ۔

اشرف عظیم اور میں نے کب غالب کو پڑھنا شروع کیا اس بات کا خیال ہمیں اس دوران میں اتنی شدت سے نہ آیا کہ ہم خود سے پوچھ لیتے ۔ وہ زمانہ ابھی ہم سے اتنی دور نہیں ۔ آواز بھی نہ دینی پڑے گی شاید ۔ آنکھ کے اشارے ہی سے بلالیں گے وہ ننھے منھے اور بھولے بھالے لمحے ۔ اور وہ لمحے سچ مچ آن پہنچے مگر میں ان سے دامن چھڑا کر نکل بھاگا ۔

''غالب کے کلام کا کونسا پہلو اور رنگ آپ کو پسند ہے''

''بحیثیت مجموعی بھی غالب مجھے پسند ہے ۔ ان کے کلام میں جذبے اور خیال کا اور محسوسات اور دانش کا جو لطیف امتزاج پایا جاتا ہے ۔ وہی غالب کی شاعری کا کمال ہے ۔ اس کے علاوہ غالب ہر جگہ اپنے آپ کو نمایاں محسوس کرتا ہے اور ساتھ ہی وہ اپنی ذات کے آئینے میں پوری کائنات کا اظہار کرتا ہے''

''غالب کی شاعری کا مستقبل آپ کی نظر میں کیا ہے'' اشرف عظیم پہلے کی طرح آنے والوں لمحوں کی تصویر دیکھنے کو بے تاب ہو گیا ۔

''جب تک معاشرے میں وہ حالات رہے جن کا عکس غالب کی شاعری میں ملتا ہے ۔ تب تک ہمیں غالب پسند آتا رہے گا ۔ اگر حالات بدل جائیں تو

بھی غالب زندہ اور پسندیدہ رہے گا - کیونکہ غالب جس غم کا اظہار کرتا ہے - وہ پورے معاشرے کا غم ہے - غالب ایک سوچتا ہوا شاعر ہے - تجسس ہمیشہ انکشافات کا پیش خیمہ ہوتے ہیں اور انکشافات میں دلچسپی لینا انسانی فطرت کا خاصہ ہے،،

ندیم صاحب دروازے سے باہر دیکھنے لگے - جیسے آنے والا زمانہ اسی راستے سے آنے والا ہو - ہم بھی تو ابھی اسی راستے سے آئے ہیں - یعنی ایک مستقبل تو ہم خود ہیں - ہمارے بعد وہ نسل ، جسے ہم جانتے ہیں - پھر اس کے بعد وہ کھیپ جو ابھی عالم وجود کی چوکھٹ کی دوسری طرف کھڑی ہے - ہمارا "مستقبل" ہو نہ ہو - لگتا یہی ہے کہ غالب کی شاعری کا قبول و عروج آنے والے جہان کی رنگ رلیوں میں بھی ایک معتدل موسم کے اثر کی طرح قائم و دائم رہے گا - حال خود ماضی کے کندھے پر سوار ہے - اس کے ہاتھ میں مستقبل کی مہار ہے - اور اس طرح ان گنت لمحوں کی ایک نہ ختم ہونے والی قطار ہے جو ایک دوسرے کی دم پکڑے ایک ہی سوچ میں رواں دواں ہے - کیا معلوم ان کی منزل کہاں ہے - مگر جب یہ لمحے تھک کر لڑکھڑاتے ہیں تو غالب کو اپنے ہمراہ پاتے ہیں - پھر کوئی آہستہ سے کچھ گنگناتا ہے - ذرا سنئے تو یہ کس کا شعر ہے "

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

"ندیم صاحب ! سر عبدالقادر نے بانگ درا کے دیباچے میں لکھا ہے کہ اگر میں مسئلہ آواگان کا قائل ہوتا تو کہہ دیتا کہ غالب کی روح علامہ اقبال کے وجود میں حلول کر آئی ہے - سر عبدالقادر نے تو اس بات کو عقیدے کے گھونگھٹ میں چھپا لیا تھا - اب آپ ہی یہ نقاب اٹھائیے -" میرا سوال دو بڑی شخصیتوں کے درمیان لٹک کر رہ گیا -

"اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال نے غالب سے فیض حاصل کیا ہے - اگر تاریخ ادب سے غالب کو خارج کر دیں تو ہمیں حالی اور اقبال کہیں نظر نہیں آئیں گے اور اگر آئیں گے تو اس صورت میں نہیں جو کہ اب ہے - اقبال نے اپنے آپ کو چند نظریات کا پابند کر لیا تھا - اس کے برعکس غالب کے ہاں ہمہ گیریت پائی جاتی ہے - غالب کے

ہاں مردانہ پن پایا جاتا ہے - یہی بات اقبال کے ہاں دبدبے اور ولولے کا انداز اختیار کر گئی ہے"

"اگر غالب اقبال کے زمانے میں ہوتا تو کیا وہ اقبال کی طرح شاعری کرتا"

"یہ کوئی ضروری نہیں - لیکن غالب جیسا حساس انسان ماحول سے بے نیاز نہیں رہ سکتا تھا - اب بھی اس کی شاعری میں اس کے عصر کی آواز گونج رہی ہے - مگر غالب زمان و مکان کی حد بندیوں کو کب خاطر میں لاتا تھا -"

یہ جواب اپنی جگہ اہم ہے مگر میں نے سوچا تھا کہ شاید ندیم صاحب کے جواب سے میں ان دونوں زمانوں کو خلط ملط ہوتے دیکھ لوں گا اور دونوں "بڑے" ایک دوسرے کے ہاتھ چومتے نظر آئیں گے - اس ضمن میں ندیم صاحب نے بتایا کہ فیض بھی کسی حد تک غالب سے متاثر ہے مگر اس کے ہاں حافظ کا اثر زیادہ ہے -

"کیا آئندہ کسی دوسرے غالب کے پیدا ہونے کے امکانات ہیں" - امید کی دھند امکان کا بادل بن گئی تھی -

"ضرور پیدا ہوگا" ندیم صاحب نے اس اعتماد سے کہا کہ امکان وجود میں آگیا اور بادل برسنے لگا - (اس دن مطلع ابر آلود تھا) "فنون چلتے رہتے ہیں - ارتقا ہوتا رہتا ہے - یہ چیز رک نہیں جایا کرتی - ہو سکتا ہے غالب جیسا کوئی شاعر ہمارے بچوں ہی میں چھپا بیٹھا ہو - اس کے لئے ماحول اور محنت کی ضرورت بھی ہے -"

اب میں نے کنہیا لعل کپور کے ڈرامے اور اس کے بارے میں راشد صاحب کی رائے کے بارے میں ندیم صاحب کی رائے معلوم کرنا چاہی -

"طنز نگاری کے سلسلے میں کپور صاحب کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا - راشد صاحب شاید اس لئے خفا ہیں کہ ان کا ذکر خیر اس ڈرامے میں موجود ہے - ویسے تو میں بھی کنہیا لعل سے متفق نہیں ہوں - ان دلوں یہ رسم چل نکلی تھی کہ نظم جدید کی مخالفت میں اپنا حصہ شامل کیا جائے - غالب کی سمجھ میں جدید نظمیں آسکتی تھیں - کچھ جدید

شاعروں نے بہت اچھی نظمیں بھی لکھی ہیں - کچھ نظمیں ایسی ہیں جو ضرورت سے زیادہ جدید ہیں - ان کو سمجھنا واقعی مشکل ہے - لیکن میں جدید شاعری کی مخالفت کو جائز نہیں سمجھتا - جہاں تک غالب کے معاصرین کا تعلق ہے کہ وہ غالب کی شاعری کو سمجھنے سے قاصر تھے - سراسر غلط ہے - وہ لوگ سمجھتے تھے - غالب نے اک نئی راہ نکالی تھی - وہ غالب کی طرح شاعری نہیں کر سکتے تھے - چنانچہ انہوں نے یہ ڈھونگ رچایا -"

اک ذرا دیر کے لئے چپ سی ہوگئی - اشرف عظیم نے اپنی ایک نظم ندیم صاحب کو دکھائی - انہوں نے بے ساختہ تعریف کی - ایسی جدید نظموں پر کون اعتراض کر سکتا ہے -

"کیا آپ غالب سے متاثر ہیں" میں نے اپنے اس سوال کا اثر دیکھنے کے لئے ندیم صاحب کی طرف دیکھا تو وہ ان کے چہرے پر بکھرا ہوا ملا -

"بہت متاثر ہوں - غالب سے اس کے فن سے اس کے فن کی عظمتوں سے کون متاثر نہیں ہوگا -

کون غالب سا سخن ور ہے ندیم
سینکڑوں یوں تو ہنر ور دیکھے

ہاں مستری وغیرہ تو بہت دیکھے ہیں -" ایک چھوٹا سا قہقہ چاروں طرف کھنڈ گیا -"

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

یہ شعر نجانے کیوں میرے ذہن پر دستک دینے لگا - غالب کے انداز بیاں کے "اور" ہونے میں کسے شک ہے - ایک سخنور ہمارے سامنے بیٹھا تھا مگر یہ "اور بھی" کون لوگ ہیں؟ - جو بھی ہیں جہاں جہاں ہیں اور جتنے کچھ ہیں - سخنور ہوں نہ ہوں - "اور بھی" البتہ ضرور ہیں - ترجمہ جس کا ندیم صاحب نے مستری کیا ہے - میں اور بھی بہت کچھ سوچنے کا ارادہ رکھتا تھا کہ ندیم صاحب نے اپنی تازہ اور نامکمل غزل کا ایک شعر سنا کر میری حیران مگر جوان سوچ کو تازہ پھولوں کا سا لوچ عطا کردیا -

ہو کیوں نہ مجھ کو اپنے مذاق سخن پہ ناز
غالب کو کائنات سخن کا خدا کہوں

ہمیں واقعی اس مذاق سخن پہ رشک آ گیا - اسی ترنگ میں اشرف عظیم بے اختیار کہہ اٹھا - ندیم صاحب آپ کا کلام پڑھ کر بھی یہی محسوس ہوتا ہے - یہ سن کر ندیم صاحب مسکرائے اور مسکراہٹ ہی بول پڑی -

"یہ آپ نے مجھے بہت بڑی داد دی ہے"

ہم وہاں سے اتر کر جب انارکلی میں داخل ہوئے تو پھر گردن گردن ڈوب گئے اور دور تک تیرتے چلے گئے - اشرف عظیم نے راز داری سے (جیسے کوئی دوسرا نہ سن لے) میرے کان میں کہا -

"یار نیازی یہ بہت بڑا آدمی ہے - صاحب قلم بھی ہے اور صاحب مروت بھی - "

"ہوں - اور صاحب دل بھی - " (سرگوشی) -

"اچھا اب کسے (Contact) کریں" اشرف نے آئندہ کی سوچی اور مجھے یکلخت افسوس کا کرنٹ لگ گیا - ابھی تھوڑے دن ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا صاحب آئے ہوئے تھے - بہت چوک ہوئی - وہ اس لحاظ سے بہت زیادہ موزوں آدمی ہیں - - - وہ تو گئے اب کوئی اور - - - ناصر کاظمی ریڈیو پاکستان سے ہمیشہ کلاسیکی شاعروں کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہیں - ایک مرتبہ اس قسم کی بحث میں جب کہا گیا کہ میر تقی میر کی شاعری جذبات کی شاعری ہے - تو ناصر کاظمی نے کہا کہ جذبات تو غالب کے ہاں بھی ہیں مگر سوچتے ہوئے جذبات ہیں - یہ بات مجھے اچھی لگی تھی - سوچا اور چاہا بھی کہ ان سے ملا جائے مگر - - - -

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسد
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

نوحۂ گل

پنکھڑیاں

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
مر گیا غالب آشفتہ نوا کہتے ہیں

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سر رہگذار تھا

نالۂ[1] حزن انگیز بر وفات غالب[2]

مولانا الطاف حسین حالی

غالب نے جب کہ روضۂ رضواں کی راہ لی
ہر لب پہ آہ سرد تھی ہر دل میں درد تھا

اس دن کچھ اہل شہر کی افسردگی نہ پوچھ
عاشق کا دل بھی یاد ہے اس غم میں سرد تھا

حالی کہ جس کو دعویٔ تمکین و ضبط ہے
دیکھا تو دل پہ ہاتھ تھا اور رنگ زرد تھا

تھا گرچہ اک سخنور ہندوستاں نژاد
عرفی و انوری کا مگر ہم نبرد تھا

اس قافلے میں آکے ملا گو وہ سب کے بعد
اگلوں کے ساتھ ساتھ مگر رہ نورد تھا

میں اور صبح و شام یہ اندوہ جانگزا
دل تھا کہ فکر سال میں بے صرفہ گرد تھا

ناگاہ دی یہ غالب مرحوم نے صدا
سچ ہے کہ خواجہ راہنمائی میں فرد تھا

تاریخ ہم نکال چکے پڑھ بغیر فکر
۱۲۱۱

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا
۳۰۰

۱۲۸۵ھ = ۱۵۱۱ + ۲۷۹۶

۱- مطبوعہ اکمل الاخبار دھلی ۱۷ مارچ ۱۸۶۹ء روز چہار شنبہ مطابق ۲ ذی الحج ۱۲۸۵ھ۔

۲- وفات غالب بروز دو شنبہ بعد از دوپہر بتاریخ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء مطابق ۲ ذیقعد ۱۲۸۵ھ۔

غالب مرحوم

جگر مراد آبادی

اے وہ کہ تیری ذات گرامی بہ ہمہ رنگ — قدرت کی جو ہمراز تو فطرت کی ہم آہنگ

اے وہ کہ تیری فکر بہ ہر طرز و بہر صنف — ہم شعلۂ و ہم شبنم و ہم شیشۂ و ہم سنگ!

اقلیم سخن ہے ترے اعجاز نفس سے — ہم نغمہ و ہم دشت، و ہم نکہت و ہم رنگ

اے وہ کہ ہر اک نغمہ ترا نغمۂ فطرت ! — اے وہ کہ ہر اک نفس ترا رواق ارژنگ

اے وہ کہ ترے معجزۂ جنبش لب سے ! — اک جنت شاداب ہر اک غنچۂ دل تنگ

ہر پھول ترے باغ کا فردوس ، بدامن ! — ہر خار ترے دشت کا انگشت شفق رنگ

تھے ملک سخن میں ترے ہمعصر ہزاروں — تنہا تھی تری ذات مگر صاحب اورنگ

تو نظم میں بھی نثر میں بھی مجتہد العصر — لیکن وہ ہے معذور کہ جس کی نظر تنگ

اک گوشۂ دامن میں ترے دجلہ و جیحوں! — اک مصرع نفس میں تری احقری چمن رنگ

عرف و نظیری و ظہوری و فغانی — ترا کوئی ہمسر نہ ترا کوئی ہم آہنگ

تونے اسے گنجائش کونین عطا کی ! — ہر چند بہت تھا ابھی داماں غزل تنگ

لاریب کہ اس رمز سے واقف تھی تیری ذات — آف نہ ہمہ رنگ و حقیقت ہمہ بے رنگ

الحق کہ تری وسعت تخیل کے آگے !
صحرا کف خاکستر و گلشن قفس رنگ

عقیدت کے پھول

(خلیفہ عبدالحکیم، ایم اے)

رشک نیر شرر آتش پنہاں تیرا — اور خورشید قیامت گل داماں تیرا
تار قانون جہاں رشتۂ جان معنی — ہو نہیں سکتا ہے شیرازہ پریشاں تیرا
تیرے انداز میں تفسیر رموز ہستی — نقشۂ لوح ازل مطلع دیواں تیرا
عرق سعی تفکر کے ہیں قطرے اختر — فلک افشاندہ غبار سر داماں تیرا
دیکھنا ابر گہر بار میں بجلی چمکی — کہ سر چرخ تصور ہے خراماں تیرا
دیدۂ دہر میں تو شوخی نظارہ تھا — دل کے نیرنگ کدہ میں رہا جولاں تیرا
نوک خامہ ہے تری زخمۂ ساز عرفاں — کہ نواریز ہے ہر صفحۂ دیواں تیرا
ہے عجب طرح کی معنی میں تگ و دو تیری — نقش پا ہے صفت موج خراماں تیرا
تیری ہی ذات سے قائم ہے زمین معنی — یعنی محور ہے بنا تار رگ جاں تیرا
نظم اردو کی نہ تھی ذرۂ خورشید آشام — تنگ ساغر میں سماتا نہ تھا طوفاں تیرا
شعر پابند کو پرواز سکھائی تو نے — فکر انساں پہ باقی ہے یہ احساں تیرا
ہم کو بخشا ہے تری کان جگر نے کیا کیا — لعل معنی ہوا خون سرمژگاں تیرا
رگ ہستی میں رواں ہے جو عیاں تھا تجھ پر — آئینہ دار ازل دیدۂ حیراں تیرا
سینہ گو چاک رہا تیرا بھی مانند سحر — داغ دل تھا صفت مہر درخشاں تیرا
طبع عالی میں تھا کہسار کا تمکین و وقار — وضع خود دار تھی سرمایہ ساماں تیرا
پوشش لفظ میں ہے نالۂ عریاں کی جھلک — تیرے ہر حرف میں خوابیدہ نیستاں تیرا

سرحد عرش سے ہے دور مکان معنی
اس جہاں سے کہیں بالا ہے جہان معنی

شب تاریک میں تو صورت مہتاب رہا — پیکر قوم میں اک دیدۂ بیخواب رہا
جوشش دل کے تلاطم نے بنائیں آنکھیں — یعنی طوفان تخیل میں تو گرداب رہا
تیری بیتابی تجھے باعث نظارہ بنی — پس آئینہ دل صورت سیماب رہا
تجھ کو اک نغمہ تھی آواز شکست قیمت — شیشۂ خستہ میں مانند مئے ناب رہا

جستجو تھی تجھے جس بحر کی وہ اور ہی تھا
عین قلزم میں بھی تو ماہی بے آب رہا

جیسے پانی کے تموج میں ہو سورج کی کرن
تو صفا کیشی میں یوں وقف تب و تاب رہا

تھی تری روح کو آزادئی پرواز فلک
پاؤں میں سلسلہ عالم اسباب رہا

خود گدازی سے تری روشنیٔ بزم ہوئی
صورت شمع بساط دل احباب رہا

شعرا قلزم ذخار سمجھتے تھے جسے
تیری ہمت نے جو دیکھا تو وہ پایاب رہا

تھی جسے سمجھے ہوئے چشم غلط بیں خورشید
تیرے آگے صفت کرمک شب تاب رہا

سطح پر جو رہے خاشاک کی صورت ان کو
معنیٔ لفظ ترا گوہر نایاب رہا

"تیرا انداز سخن شانۂ زلف الہام"
اپنے ہر دعوے میں تو صاحب فرتاب رہا

تیری رفتار قلم جنبش بال جبریل
ساز حق کو ترا دل صورت مضراب رہا

کور دل دن کو ہیں یاں رات سمجھنے والے
اور بہت کم ہیں تری بات سمجھنے والے

پیش انسان رہا تا دیر جو منزل ہو کر
تھا فقط سنگ نشان تیرے مقابل ہو کر

چشم مضطر نے تری خاک پہ ڈالی جو نگاہ
تپش آمادہ ہوا ذرہ بھی اک دل ہو کر

تیری ہر سطر تڑپتی ہے مرے سینے میں
موج بیتابیٔ برق دل بسمل ہو کر

جیسے ہو گوہر تابندہ صدف میں پنہاں
ویسے تو حرف میں پوشیدہ رہا دل ہو کر

شرر سنگ رہی لیلیٰ معنی کی جھلک
طبع خود دار رہی پردۂ محمل ہو کر

مخزن نور تھا تو وہ کہ شعاعوں سے سحر
مہر نے ہاتھ بڑھایا ترا سائل ہو کر

سب نے محسوس کیا ایک نے دیکھا نہ تجھے
تیرا جلوہ ہوا بوئے گل محفل ہو کر

مژدۂ دیدۂ دل تیری رہی دنیا میں
صورت نوک سناں رگ باطل ہو کر

اب تلک گرچہ سر و شان بہشتی میں رہا
اپنی دنیا بھی رہیگی تری قائل ہو کر

میں کہاں اور مرے فکر میں پرواز کہاں
شعر سیکھا ترے انداز پہ مائل ہو کر

مدح کے پھولوں کا گلدستہ بنایا میں نے
تیرے گلزار کے گلچینوں میں شامل ہو کر

تا ابد ملک معانی ہے تیرے زیر نگیں
تیری خدمت میں یہ حاضر ہے خراج تحسین

* * * * *

یوم غالب

سید حسن عسکری کاظمی

بہت دنوں سے اداس ہوں میں
سکون قلب و نظر کا ساماں
کہیں نہیں ہے ، کہیں نہیں ہے
فسردہ لمحو ۔ گواہ رہنا !

*

خزاں کا موسم گزر گیا ہے
یہ میں نے پیہم سنا تھا لیکن
چمن میں پازیب فصل گل کی
کہیں سے کوئی صدا نہ آئی
کسی روش پہ نہ پھول مہکا
بہار سہمی ہوئی کھڑی ہے

*

کئی مہینے گزر گئے ہیں
لہو کی بوندیں برس رہی ہیں
افق پہ چھایا ہے دھندلکا سا
سجیلے روشن دنوں کا چہرہ
دھوئیں کے بادل میں چھپ گیا ہے
زمیں سے اٹھتی ہوئی فغاں نے
مہکتی راتوں کو ڈس لیا ہے

*

اجاڑ شہروں کی زندگی میں
عجب ہے رقص جنوں کا منظر
ہے وقف ماتم شعور امکاں
خرد کی دنیا میں ہو کا عالم
ہر ایک لمحہ گریز پا ہے ، ہر ایک لمحہ رکا ہوا ہے
ہر ایک لمحے کی جاں کنی میں کہ جیسے وقفہ ہے سو برس کا
فضا کے پاؤں کی آہٹوں سے ہر ایک لمحہ لرز اٹھا ہے
یہ کشمکش ہے میرا مقدر ، میں اپنا دامن چھڑاؤں کیونکر
مگر یہ میرا ہی حوصلہ ہے کہ یوم غالب منا رہا ہوں

*

مرے تخیل کی جلسہ گاہیں
اگرچہ شیشوں کی کرچیوں سے اٹی پڑی ہیں
مگر غنیمت ہیں چند لمحے
ابھی ابھی تو رکا ہے طوفاں
میں زخمی دل کی شکستہ اینٹوں سے نغمگی کا محل بنا کر
لہو میں ڈوبی ہوئی عقیدت کی انگلیوں کے کنول بنا کر
عظیم شاعر کی زندہ غزلوں کو اپنی یادوں کے طاقچوں میں سجا رہا ہوں
میں اس کی عظمت کا معتقد ہوں ، سر اس کے آگے جھکا رہا ہوں
فسردہ لمحو گواہ رہنا میں یوم غالب منا رہا ہوں !

التجا

رؤف انجم

خیال و اظہار کے میاں جسم اور روح کے درمیاں
کون ہے جو حائل ہے ، فاصلوں کی خلیج کیوں ہے !
مری انا میں تری انا میں تضاد کیوں ہے !

تری جدائی کا غم تہ دل سے ایک آتش فشاں کے لاوے کی شکل پھوٹا
جو آہ بن کے جو اشک بن کے فضا میں تحلیل ہوگیا ہے
مگر میں کیسے تجھے بتاؤں
وہ خشک و نم سرد و گرم آب و ہوا کی آویزش مسلسل
وہ اشک سوزاں وہ سرد آہیں
مرے غم جانگسل کی عکاس تھیں مگر میرا غم نہیں تھیں
وہ تیری آمد سے اک کرن روشنی کی آنکھوں کی پتلیوں میں جو موجزن تھی
وہ ایک ہلکا سا خم لبوں پہ جو مسکراہٹ سی بن گیا تھا
مسرتوں کی علامتیں تھیں مگر وہ میری خوشی نہیں تھیں
وہ ایک احساس قربت دوست وہ رقیب مدام تجھ سے قریب تر تھا
تو پاس آیا تو پاس رہ کے بھی دور کیوں تھا !

مرے ترے درمیاں کبھی روح کی کبھی جسم کی حدیں ہیں
حدیں گرا کر مجھے حقیقت سے ہمکناری کا شرف دے دے
وہ چشم دے جو تجھے نہ دیکھے تری تجلی کی خود ہو مظہر
وہ نطق دے جو ترے خیالات کی زباں ہو
خیال دے جس کا حسن عریاں ہو بے نیاز قبائے معنی
مجھے علامات کے تشدد سے استعاروں کی سرد مہری مجاز مرسل کے واسطے
سے رہائی دے دے

مجھے توسط کی اور وسیلوں کی کیا ضرورت
قریب آ تو بس اس طرح کہ نہ میں رہوں نہ ہی تو رہے
تجھے جو دیکھوں تو خود کو دیکھوں جو خود کو دیکھوں تو تجھ کو پاؤں
وہ بعد جو میرے تیرے مابین ہے مٹا دے

نذر غالب

امجد اسلام امجد

میرے چاروں طرف ایک سیلاب ہے
جس میں ہر چیز مٹنے کو بے تاب ہے
پر مری روح کا دشت بے آب ہے -
یہ فنا
یہ مسلسل فنا ، یہ عدم کا سفر
موت کی رہ گزر
الحذر ، الحذر -
رنج خوگر ہوئے پہ بھی رنج گراں
در پئے جاں ہے -
دشت امکاں کی وسعتیں دیکھ کر
آنکھ حیراں ہے -
مدعا کے لئے شاعری آج بھی
سحر بے جاں ہے -
خامشی صوت ہے ، گنگ ادراک ہے
بے اثر ہر فغاں ، بے رفو چاک ہے
اس زیاں رنگ بستی میں عرض ہنر
آج بھی خاک ہے -
خوئے تسلیم بھی رائیگاں ہی گئی
یعنی ہم بزمیٔ خوش جہاں ہی گئی -
ہر قدم پر نیا شہر اوہام ہے
اب تو رسم و رہ رہبراں ہی گئی -
غالب نامور ، مجھ کو رستہ دکھا
منزل شعر کی راہ پر میں بھی ہوں
دیکھ مڑ کے ترا ہم سفر میں بھی ہوں -

ایک سو سال کے بعد

اشرف عظیم

(۱)

ایک اک لمحہ مرے جسم سے چھوکر گذرا
رات کی برف مری سانس کے شیشوں پہ جمی
دن کے انگارے مری آنکھ کی شبنم میں جلے
پھر جو موسم کا بپھرتا ہوا نیزہ میرے دل میں آترا
سرخ رو خون کے قطرے ٹپکے ،
جسم مٹی میں ملا ،
خون پھر شکل بنا ۔
میں مگر زندہ رہا !!!
ایک احساس و وفا کا پیکر
جو ستاروں کے شب و روز کے چکر سے بھی آزاد رہا ،
زرد پتے کی طرح تند ہواؤں میں آڑا ، درد کے جنگل میں پھرا
خوف کے شہر کی ان دیکھی فصیلوں پہ چڑھا
پھر کبھی اپنے گناہوں کی صلیبوں پہ جو الٹا لٹکا !
یوں ہی اک خضر کی خواہش میں ہمیشہ بھٹکا !!

(۲)

ایک سو سال کا میں بوڑھا ہوں
وقت کب میری تمناؤں کے سانچوں میں ڈھلے !
کون سا پھول میری روح میں کھلنے کے لئے خود اجڑے !!
کیوں کوئی شاخ میرا جسم اٹھانے کو جھکے ؟
ایک سو سال کا میں بوڑھا ہوں !

سوچتے سوچتے سایہ مرا تھرتھر کانپے
یا کسی تار کا اک ساز ہلے !!
میں جسے چاھوں میرا خضر مجھے کیسے ملے ؟
کیسے ملے — ؟

(۳)

ایک سو سال کے بعد
زندگی چاند کی گمنام فضا میں آتری
نت نئے پرزوں سے ھوتی ھے نئی خضر گری
وقت کی نبض تھمی
اس کی آنکھوں میں مگر ایک وفا کی سرخی
نہ کبھی پہلے ملی تھی ، نہ کبھی اب ھی ملی !

(۴)

تم مشینوں سے نئی صبح کی تعمیر کرو
ایم جان شام کی رگ رگ میں لیا زھر بھرو
مجھ کو احساس کے پر خار جھاں میں ذرا تنہا چھوڑو
ھاں یہ سن لو کہ میں سو سال کا بوڑھا ھوں جوان
دل کے پردوں پہ ابھی تک ھے محبت کا نشان

آخری ہچکیاں

ارشاد صدیقی

(یہ غزل دیوان میں موجود ہے - یہاں اشعار کے پہلے مصرعے بدل دیئے گئے ہیں - اب یہ نظم نما غزل کی صورت میں پیش خدمت ہے)۔

نظر لیاز سام تھی ، دل میں اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضا مند کر گئی

راہیں جو لالہ زار بنی ہیں تو خوب ہے
تکلیف پردہ داریٔ زخم جگر گئی

عزو غرور و ناز کی آخر ہوئی ہے شب
اٹھے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

پرزے اڑیں تو فخر کے پہلو نکالئے
بارے اب اے ہوا ہوس بال و پر گئی

ہونی تھی جو بھی ہونی تھی وہ جلد یا بدیر
موج خرام "یار" بھی کیا گل کتر گئی

اہل ہوس کی بزم میں واویلا کیجئے
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

فہمائش نظر کا تجھے ہوش کب رہا
مستی سے ہرنگہ تیرے رخ پر بکھر گئی

مارا ہمارے صبر نے اے مہرباں تجھے
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

روح غالب سے معذرت کے ساتھ

مستنصر میر

(عنوانات : دل شاعر سے معذرت کے ساتھ ادارے کی جانب سے)

نہ ادھر کے رہے ۔ ۔ ۔

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
مسٹر مرے پیچھے ہے تو ملا مرے آگے

فلمیریا ۔ ۔ ۔

فلم نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

چھٹیاں ؟ ۔ ۔ ۔

منحصر چھٹیوں پہ ہو جن کی امید
نا امیدی ان کی دیکھا چاہیئے

مفت کی ڈگری ۔ ۔ ۔

مفت مل جائے گی اس سال تو ڈگری ہم کو
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

کتا ۔ ۔ ۔

سگ شہر سے الجھتا تو پھر آج میں نہ بچتا
وہیں ایڑیاں رگڑتا نہ اگر فرار ہوتا

حلوہ و شکم ۔ ۔ ۔

حلوۂ مفت لظرہوں مری قیمت یہ ہے
کہ رہے صد شکم دار پہ احساں میرا

خواتین و حضرات - - -

میں بھی پاکٹ میں نوٹ رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے :

الوداعیہ - - -

کبھی تھپڑ، کبھی چانٹا، کبھی ڈنڈا، کبھی جوتی
بہت بے آبرو ہوکر ترے کوچے سے ہم نکلے

کر بھلا - - -

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا گداگری
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

الیکشن سے پہلے - - -

یہ ہم نے گیٹ کیپر سے کہا ، سن
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

غالب دی غزل دا پنجابی روپ

منصور احمد خالد

(ایس ترجمے وچ غالب والی بحرتے وزن نوں قائم رکھیا گیا اے) ۔

تینوں او کملیا دلا کیہہ اے ؟
اوڑک اس درد دی دوا کیہہ اے ؟

سانوں شوق اوسدا اوہ اے ساتھوں تنگ
یا الٰہی ایہہ ماجرا کیہہ اے؟

میں وی منہ وچ زبان رکھنا واں
کدی پچھوچے "دل ترا کیہہ اے"؟

جدوں تیرے بناں نہیں کوئی
شور ایہہ فیر اے خدا کیہہ اے؟

کیہو جہے نیں ایہہ حسن والے لوک
ناز تے نخرہ تے ادا کیہہ اے؟

مہکدی زلف وچ نہیں کیوں کنڈل
نشہ سر میلے نین دا کیہہ اے؟

کتھوں آئے نیں پھل تے ہر یالی
ابر کیہہ چیز اے ہوا کیہہ اے؟

سانوں اوہنا توں اے وفا دی آس
جیہڑے نہیں جاندے وفا کیہہ اے؟

کر بھلا تے ترا بھلا ہوسی
ہور درویش دی صدا کیہہ اے؟

وارلاں جند جان تیرے توں
میں نہیں جاندا دعا کیہہ اے؟

اساں منیا جے کجھ نہیں غالب
اینویں لبھ جائے تے برا کیہہ اے؟

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے

ہوائے شہر

انشائے لطیف

اے ساکنان کوچۂ دلدار دیکھنا
تم کو کہیں جو غالب آشفتہ سر ملے

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

غالب

ڈاکٹر وزیر آغا

آج سے تقریباً چالیس برس پہلے کی بات ہے کہ ایک روز میرے والد کو نہ جانے کیا سوجھی کہ مجھے سیر کے بہانے گاؤں کے پرائمری سکول میں لے گئے اور پھر وہیں چھوڑ آئے - میں سکول کی دیواروں پر بنی ہوئی تصاویر کو دیکھنے میں اس قدر منہمک تھا کہ والد صاحب کے چلے جانے کا مجھے علم تک نہ ہو سکا اور جب علم ہوا تو مجھے یوں لگا جیسے میں کسی لق و دق صحرا میں کھڑا ہوں اور میرے چاروں طرف پھیلی ہوئی زمین میں جلاد ایسی مونچھیں آگ آئی ہیں- پھر دفعتاً یہ مونچھیں سمٹ کر سکول کے ماسٹر صاحب کے بالائی ہونٹ کی محراب پر جمع ہوگئیں اور میں، نے حیرت سے دیکھا کہ ان مونچھوں سے ذرا اوپر دو ویران سے غار منہ کھولے کھڑے تھے اور ان غاروں سے ذرا اوپر دو سرخ انگارہ آنکھیں تیروں کی طرح اترتی میرے سارے بدن کو چھلنی کر رہی تھیں - چنانچہ حفاظت خود اختیاری کے تحت میں نے بے اختیار رونا شروع کر دیا - اور آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے میرے گالوں پر لڑھکنے لگے - ان آنسوؤں کو دیکھتے ہی ان لال انگارہ آنکھوں میں نفرت کی ایک تیز سی کٹار ابھری جس نے میرے آنسوؤں کی طغیانی کو اور بھی تیز کر دیا - مگر عین اس وقت ماسٹر صاحب نے دائیں بائیں ایک نظر ڈال کر اپنی جیب سے ایک نازک سی رنگین پنسل نکالی اور پھر جلدی میں میرے ہاتھوں میں تھما دی اور پنسل کے اس لمس میں نجانے کیا اعجاز تھا کہ میری پلکوں پر چمکتے ہوئے آنسو وہیں رک گئے اور میرے ہونٹ ایک معصوم سی مسکراہٹ میں ڈوبتے چلے گئے - اس وقت مجھے یوں لگا جیسے میں ایک بھیگی ہوئی چلمن میں سے کسی روشن اور تابناک دنیا کا نظارہ کر رہا ہوں -

اس واقعہ کے کئی برس بعد جب میں کالج میں تعلیم پاتے ہوئے ایک روز دیوان غالب سے متعارف ہوا تو مجھے اچانک یوں محسوس ہوا جیسے وقت نے

ایک الٹی زقند بھری ہے ۔ اور میں واپس گاؤں کے پرائمری سکول میں پہنچ گیا ہوں - غالب مجھے ایک پریشان حال لڑکے کے پیکر میں نظر آیا - لیکن اس طور کہ اس کی پلکیں آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھیں اور ہاتھوں نے ان گنت رنگین پنسلیں تھام رکھی تھیں - غالب سے قبل میں نے شاعرف کا مطالعہ کیا تھا اور خود کو ایک ایسی زمین پر سرگرداں پایا تھا جہاں بادلوں کا سائبان تنا ہوا تھا اور یہ سائبان کسی مجبور کی آنکھ طرح ہولے ہولے ٹپکتا چلا جاتا تھا - پھر میں نے ا ۔ ا کا مطالعہ کیا اور مجھے یوں لگا جیسے میں کسی جلی جھلسی ہوئی کائنات میں دھکیل دیا گیا ہوں اور میرا سارا جسم سورج کی طنزیہ نظروں سے پارہ پارہ ہوگیا ہے - لیکن غالب کو ایک نظر دیکھتے ہی مجھے برسات کی وہ شام یاد آ گئی جب موٹے موٹے بادلوں میں ایک شگاف سا پیدا ہو جاتا ہے اور اس شگاف میں سے سورج کی دزدیدہ نگاہیں ہر شے پر رنگوں کی جوالا انڈیل دیتی ہیں - آنسو اور تبسم ایک دوسرے سے ہمکنار ہو جاتے ہیں - اور زندگی اپنے دکھوں اور مصیبتوں کے باوجود نہایت خوبصورت ، لطیف اور قیمتی نظر آنے لگتی ہے - مجھے غالب آنسوؤں میں مسکراتا ہوا دکھائی دیا - وہ ایک ایسا انسان نظر آیا جسے بیک وقت غم اور خوشی کا عرفان حاصل ہو چکا ہے۔ بعض شاعر خوشی سے اس درجہ ناراض ہو جاتے ہیں - کہ ان کے ہاں غم کی گدلی روشنی کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہتا اور بعض اندر سے تو ٹوٹ پھوٹ رہے ہوتے ہیں لیکن دنیا کو دکھانے کے لئے اپنے ہونٹوں پر تبسم کی ایک جھالر سی آویزاں کر لیتے ہیں - غالب مجھے ان دونوں قسم کے شعرا سے مختلف نظر آیا - مجھے محسوس ہوا کہ غالب کے ہاں جس طرح غم فطری ہے - اسی طرح تبسم بھی خود رو ہے - مطلب یہ کہ غالب ریاکار ہرگز نہیں ہے - اسے جب چبھن محسوس ہوتی ہے تو وہ رو پڑتا ہے اور جب روتے روتے محسوس کرتا ہے کہ کسی نے رنگین پنسل اس کے ہاتھ میں تھما دی ہے تو بے اختیار ہنسنے لگتا ہے۔ مسکراہٹ کا یہ لمحہ جب غالب کا ازلی و ابدی غم ایک نئی نویلی مسرت سے ہمکنار ہوتا ہے ، ایک ایسا نایاب لمحہ ہے جو غالب کو عام شعرا کی سطح سے بہت اوپر اٹھا دیتا ہے - زیاں کا ایک شدید احساس اور پھر اس شدید احساس کی مضحکہ خیزی کا ایک گہرا شعور - عرفان کا یہ مقام غالب ہی کو حاصل ہوا ہے اور غالب کے ذریعہ ہی مجھ ایسے لاکھوں انسانوں تک پہنچا ہے جو زندگی کو اس کی آلائشوں اور مصیبتوں کے باوجود ایک بیش بہا نعمت سمجھتے ہیں ۔

میں نے اپنی زندگی میں غالب کے علاوہ شاعر ا کا بھی مطالعہ کیا ہے ا ایک عظیم شاعر ہے اور اس کی شاعری نے لاکھوں اذہان کو منزل سے آشنا کیا ہے - لیکن میں ا سے مرعوب تو ہوا، خود کو اس کے حلقۂ احباب میں شامل کرنے پر کبھی مائل نہ کر سکا - ہر بار جب میں نے ا کو پڑھا تو مجھے یوں لگا جیسے ریلوے سٹیشن پر آواز کے آلے سے یہ اعلان نشر ہو رہا ہو کہ مسافرو جلدی کرو، بھاگو، دوڑو، ۱۵ اپ ٹرین کے چلنے میں صرف پانچ منٹ باقی رہ گئے ہیں"- دوسری طرف غالب کا مطالعہ کرتے ہوئے میری چشم تصور نے دیکھا کہ اعلان کے شور اور انجن کے اضطراب سے بے نیاز کوئی شخص پلیٹ فارم کے ایک شکستہ بنچ پر اکڑوں بیٹھا کتاب کے مطالعہ میں غرق ہے، وہ اعلان کو سن کر ایک لحظہ کے لئے اپنی نظریں کتاب کے اوراق سے ہٹاتا ہے اور اپنے پاس بیٹھے ہوئے دوسرے مسافر سے بڑے دھیمے اور ملائم لہجے میں پوچھتا ہے: "جناب اس کے بعد دوسری گاڑی کتنے بجے جائے گی؟" اور جواب پا کر بڑے اطمینان سے دوبارہ کتاب کا مطالعہ کرنے لگتا ہے - غالب کو کسی بات کی بھی جلدی نہیں - اس کے سامنے زندگی اپنی تمام تر جھریوں اور سلوٹوں کے ساتھ بچھی ہوئی ہے - ہر سلوٹ ایک خواہش ہے اور ہر خواہش پر اس کا دم نکلنے کو تیار ہے مگر ساتھ ہی اسے ایسی بات کا احساس بھی ہے کہ یہ ساری سلوٹیں بے معنی ہیں اور قدرت نے انسان کے ساتھ کوئی بہت بڑا مذاق کیا ہے - غالب کے سامنے نہ تو تعمیر کا کوئی منصوبہ ہے اور نہ اسے کسی ارفع منزل ہی کی تلاش ہے - اسے تو صرف اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے غرض ہے کہ آج کس دوست کا خط آیا یا شام کس طرح بسر ہوگی یا پھر اپنی ذات، اپنی انفرادیت کو زمانے کی آندھی سے محفوظ رکھنے کے لئے آج کیا جشن کرنا ہوگا - غالب شخصیت سے گریزاں لیکن انفرادیت کا والہ و شیدا ہے - وہ کسی دوسرے کے کنوئیں سے اپنے باغ کو سیراب نہیں کرتا - بلکہ اس کی آبیاری اپنی ذات کے مخفی چشموں سے کرتا ہے - لیکن یہ ذات کیا ہے؟ ایک جہان ہوش ربا جو کسی تمثال دار آئینے کی طرح ہزار ٹکڑوں میں بٹ جانے کے باوجود آرزوؤں کے ایک شہر کی صورت میں قائم ہے - غالب جب اپنے اس آئینہ خانے سے مجھے آشنا کرتا ہے تو آواز کو دگنا کرنے والے آلے کا سہارا نہیں لیتا بلکہ چپکے سے اپنا ہاتھ میرے شانے پر رکھ کر مجھے اس کی طرف متوجہ کر دیتا ہے - یہ نہیں کہ وہ میرے اندر چھپے ہوئے "دیدۂ عبرت نگاہ" کو متحرک ہی نہیں کرتا - ضرور کرتا ہے مگر ساتھ ہی

اپنی ایک آنکھ میچ کر عبرت اور ندامت کے سارے تصور کو خندۂ استہزا میں بھی اڑا دیتا ہے - مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوا کہ غالب ایک ایسا نقطہ ہے جہاں دو زمانے آ کر ملتے ہیں اور جہاں سے ایک تیسرا زمانہ اپنے سفر کا آغاز کرتا ہے یا پھر یوں کہہ لیجئے کہ غالب وہ بھیگی سی مسکراہٹ ہے جو جلاد ایسی مونچھوں اور بلکتے ہوئے آنسوؤں کے تصادم سے جنم لیتی ہے اور پھر ایک نئے عہد کا سمبل بن جاتی ہے - مجھے غالب کی یہ نٹ کھٹ ، معصوم اور بے داغ ادا پسند ہے کہ اس میں رفاقت کا احساس بھی ہے اور عرفان کے کوندے کی لپک بھی !

* * *

ہوں گرمیٔ نشاط تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشن ناآفریدہ ہوں

مرزا غالب کا ایک خط

سجاد باقر رضوی

واہ سید زادے واہ : تم بڑی عبارت آرائیاں کرنے لگے نثر میں خود نمائیاں کرنے لگے - میاں تم کو تو بیکاری میں خط لکھنے کا ایک شغل ہے ، قلم دوات لے بیٹھے ، اگرخط پہنچا ہے تو جواب ورنہ شکوہ شکایت و عتاب و خطاب لکھنے لگے - تمہارے پاس لکھنے کی سو باتیں ہیں ، روز ایک نیا ہنگامہ ، ایک نئی افتاد ، کبھی پشور کے جلسے کی روداد ، کبھی لاہور کے ہنگاموں کی بیداد - میاں یہ جنت ہے ، یہاں نہ قیادت کے جھگڑے ہیں نہ سیاست کے ہنگامے - سب کے ایک ہی رنگ ہیں ایک ہی ڈھنگ ہیں - ہر شخص متشرع اور عبادت گزار ہے - نہ وہ زمیں ہے نہ زماں ہے - ہائے دنیا ، وائے دنیا ، کہ ہم بھی اپنی ایک طرز جداگانہ رکھتے تھے - ایک ادائے باغیانہ رکھتے تھے - مگر یہاں بقول غالب -

اسد اللہ خاں تمام ہوا
وا دریغا وہ رند شاہد باز

وہی ایک حور اور ایک غلمان - - سو برس سے عذاب جان - ایک ہی حکم اور ایک ہی فرمان - دنیا میں تھا تو سڑک کاٹتا تھا ، رنج اٹھاتا تھا مگر یہاں ہمہ وقت کے سکون سے جی چراتا ہوں ، نہ شادیٔ وصل ہے ، نہ غم ہجراں نہ فکر معاش ہے نہ ذکر بتاں - میں نے حسب الحکم داڑھی رکھ لی - اپنی آزادہ روی کو قائم رکھا- جس دن داڑھی رکھی اسی دن سر منڈایا کہ یہ ایک وردی ہے عام ملا ، حافظ ، بساطی ، نیچہ بند ، دھوبی ، سقا ، بھٹیارہ ، جولاہا ، کنجڑا ، منہ پر داڑھی ، سر پر بال -

خبر ملی ہے کہ مملکت ہندوستان کے صدر جناب ذاکر حسین یہ مشورہ دیتے ہیں کہ آگ اور پانی کو یکجا کرو ، غالب اور گاندھی کو ساتھ رکھو- میاں میرا گاندھی کا کیا مقابلہ - انہوں نے نمک کھایا - وہ کاٹھیا واری

اور میں ترک سلجوقی ، وہ اهنسا کے پیرو اور میں سپہ گری کا دالدادہ ۔ میں نے خود کہا ہے :

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے
لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

آہا آہا ، برخوردار کامگار ، تمہارے خامۂ مشکبار کی صریر نے میری کتابوں کی طباعت کا آوازہ یہاں تک پہنچایا ۔ کل جمعہ کے دن سات کتابوں کے دو پارسل پہنچے ۔ واقعی کتابیں جیسا کہ میرا جی چاہتا تھا اسی روپ کی ہیں ۔ حق تعالیٰ مولانا مہر اور سید عالی وقار علامہ وزیرالحسن عابدی اور میاں عبدالشکور احسن کو سلامت رکھے کہ ان کے دم سے میری فارسی کتب شعر و نثر منظر عام پر آرہی ہیں ۔

جامعہ پنجاب کے شیخ جامعہ علامہ علاؤالدین صدیقی کو بعد از سلام یہ کہیو کہ حضرت آپ نے میرے نام کی کرسی بنوائی ہے ۔ اور الہ آباد کے ایک سید زادے سید وقار عظیم کو ، کہ وقار اور عظمت دونوں کا جوینده ہے ۔ میرا نمایندہ بنایا ۔ سو میں آپ کے حق میں دعاگوں ۔ شفیق قدیم ، حمید احمد خاں کو کہ کرم آباد کی سر زمین اس کے نام سے روشن ہے ، میرا سلام پہنچائیو اور کہیو کہ حضرت تم میرے نام کی کرسی بنوانے میں شریک غالب ہو مگر میں تمہارا شکر گزار نہیں ۔ بھائی لین دین میں پہل میں نے کی ۔ میں نے اپنے دیوان کا نام نسخۂ حمیدیہ ، تمہارے نام پر رکھا ، تم نے کرسیٔ غالب کی بنا رکھی تو اب حساب بے باق ۔ ان سے کہیو کہ بھائی جب نسخۂ حمیدیہ کی تدوین مکمل ہو اور نسخہ چھپ جائے تو جناب امتیاز علی تاج سے میرے حق تصنیف کی کتابیں لے کر مجھے بھیج دیں ۔ میرے دیرینہ کرمفرما اور عزیز ، مصطفیٰ خاں شیفتہ ، سید احمد خاں ، مولوی الطاف حسین ، میر مجروح سب منتظر ہیں ۔ سنا ہے کہ بریلی والے میاں عبادت نے دو کتابیں میرے کلام کی تحسین و تشریح میں تصنیف کی ہیں ۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ ، چپڑی اور دو دو اسی کو کہتے ہیں ۔ ان سے کہنا کہ جلد بندھ جائے تو بطریق احسن مجھے روانہ کریں ۔ صوفی غلام مصطفیٰ نے میرے اشعار کے معانی و مطالب کے بیان میں جو کتاب لکھی

ہے وہ بھی ڈاک مجھے بھیجو - ریڈیو پر میں اور میر مجروح ان کی تشریحیں سنتے رہے ہیں مگر سنا ہے کہ بٹالے والے اعجاز حسین نے اثر میں ایک مختصر دیباچہ بھی اس کتاب کے ساتھ لگایا ہے - چونکہ وہ ریڈیو پر نہیں آیا ہے اس لئے اس کی دید کا مشتاق ہوں -

تم کہتے ہو کہ میرے کلام کا چار دانگ عالم میں شہرہ ہے - یہ بات میرے جی کو بھائی - مجھے دل سے پسند آئی مگر برخوردار دنیا والے میرے کلام کو ہرگز نہ سمجھیں گے - کئی باتیں جس شخص میں جمع ہوں گی وہ اس کو مانے گا - پہلے تو عالم ہو، دوسرے فن لغت کو جانتا ہو ، تیسرے فارسی کا علم خوب ہو اور اس زبان سے اس کو لگاؤ ہو ، اساتذہ سلف کا کلام بہت کچھ دیکھا ہو اور کچھ یاد بھی ہو ، چوتھے منصف ہو ، ہٹ دھرم نہ ہو ، پانچویں طبع سلیم و ذہن مستقیم رکھتا ہو ، معوج الذہن اور کج فہم نہ ہو ، یہ پانچ باتیں کسی میں جمع ہوں گی تو میرے کلام کی داد دے گا -

میاں تم نے یہ ''فہمائش'' کا لفظ کہاں سے سیکھا - یہ لفظ میاں بدھا ولد میاں جما اور لالہ گنیش داس ولد لالہ بھیروں ناتھ کا گھڑا ہوا ہے - ''فہم'' لفظ عربی الاصل ہے - کہیں ''فرمائش'' کو اس کا نظیر گمان نہ کرنا - وہ مصدر اصلی فارسی ''فرمودن'' ہے -

تمہارے ملک میں ٹیلی ویژن پر میری تشہیر کی گئی وہ حاشا وکلا میرے موافق حال نہ تھی - امین الدین نامی شخص کہ ایک معلم فرومایہ ، فارسی سے ناآشنائے محض ، صرف و نحو میں نا تمام ، انشائے خلیفہ و منشات مادھورام کا درس دینے والا ، اسے میرا مد مقابل گردانا - میں نے اس پر جو مقدمہ کیا تھا وہ اپنی خاندانی عزت ، نجابت و شرافت ، اپنے منصب علمی و شعری کی بحالی کے لئے کیا تھا اور جب ایک گواہ کو عدالت میں میرے سامنے کرسی دی گئی اور مجھے لائق اس اعزاز کے نہ سمجھا گیا تو میں نے مقدمہ واپس لے لیا - اب سو برس بعد کہ دلی ، لندن ، ماسکو اور واشنگٹن میں غالب غالب ہے تو تمہارے ملک میں مردہ غالب کی ہڈیاں اکھیڑی جا رہی ہیں اور زندہ غالب کو نہیں پوچھا جاتا - ٹیلی ویژن پر میرا یہ مصرع چھنچا دو -

ع - مباش منکر غالب کہ در زمانہ تست

علامہ نیاز فتحپوری سے سرراہ ملاقات ہوئی - سنا ہے کہ انہوں نے میرے کلام کی اصلاح کی - فاخر مکین ایک شاعر تھا شجاع الدولہ و آصف الدولہ کے عہد میں ، اس نے سعدی و نظامی و حزیں کے اشعار کو اصلاحیں دیں - جب ایک ہندوستانی بےعلم ، تنک مایہ ، اساتذہ نامی عجم کے کلام کو اصلاح دے تو علامہ نیاز کہ علامہ ہیں میرے کلام کو اصلاح کیوں نہ دیں - خدا کا شکر کہ مجھے ایک سو ستر برس کی عمر میں ستر برس کی ریاضت کے بعد استاد نصیب آیا -

تم نے جو قاضی عبدالودود کو امام المحققین لکھا ہے تو یہ لکھو کہ کتنے محققین نے انہیں امام مان لیا ہے - ایک سید نے اپنے لڑکے کا نام میر شہنشاہ رکھ لیا - یہ میر شہنشاہ صاحب کیونکر شاہ جہاں و جہانگیر ہو جائیں گے اگر تم بفتحہ کاف ثانی بصیغہ تثنیہ امام المحققین کہتے تو ایک ماموم تم ہوتے اور مولا بخش پان والا دوسرا ہوتا -

آج کل غالب علیہ الرحمہ عیش کرتے ہیں - آدھ سیر گوشت دن کو اور پاؤ بھر شراب طہور رات کو مل جاتی ہے - روٹی کھاتا نہیں کہ گندم یہاں منع ہے اور دن رات فرشتوں کا پہرہ ہے - اگر سرکار پاکستان کی طرف سے میری پنشن کا قضیہ طے ہو گیا ہو تو سو برس کا حساب کرکے مجلس یادگار غالب کے حساب میں جمع کرا دو کہ اس سے میری کتابوں کی طباعت کا خرچ بطریق احسن نکل سکے -

لو بھائی میرا پیارا میر مہدی بھی آگیا - اب ہم ساتھ کھائیں گے ابھی میر ابراہیم علی خاں صاحب کی غزل پر اصلاح کی ہے تم بھی ایک شعر سنو -

علی علی جو کہا تا سحر تو یوں سمجھے
کہ ذوالفقار سے کٹتی ہے اب ہماری رات

فقط نجات کا طالب
اسداللہ خاں غالب

مرزا غالب کا پیغام

مدیر راوی کے نام

۱۹۶۴ء میں گورنمنٹ کالج کے جشن صد سالہ کے موقعہ پر راوی کے ایک "صد سالہ خاص نمبر" کے لئے راوی کے مدیر کو غالب کی طرف سے ایک پیغام ملا تھا - جو مصرعوں کی صورت میں صرف کالج کے اساتذہ کے نام تھا - (اطلاعاً عرض ہے کہ ۱۸۶۴ء میں گورنمنٹ کالج کا سنگ بنیاد رکھے جانے کے وقت مرزا صاحب بقید حیات تھے - یہ الگ بات کہ وہ راوین کہلانے کی سعادت سے محروم ھی رہے) - اب چچا غالب نے راوی کے اس "اپنے نمبر" کے لئے چند مصرعے پیغام کی صورت میں ارسال فرمائے ھیں - جو ان کے بھتیجے بھتیجیوں یعنی کالج کے طلبا و طالبات کے نام ھیں - غالب نے اپنے بیشتر اشعار کے مفہوم کی طرح ان پیغامات کے مفہوم کا بھی تعین نہیں کیا - اور یہ بھی نہیں لکھا کہ پیغامات کا کونسا ٹکڑا کس سے متعلق ہے

گرچہ ھے طرز تغافل پردہ دار راز عشق
پر ھم ایسے کھوئے جاتے ھیں کہ وہ پا جائے ھے

(مدیر)

* * * * * *

شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

بن گیا رقیب آخر جو تھا راز داں اپنا

بنا ھے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

یا رب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات

اس انجمن ناز کی کیا بات ہے غالب

ہوائے سیر گل آئینۂ بے مہریٔ قاتل

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوری

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے

بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں

بیٹھے ہیں رہگذر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

کرنا تھا جواں مرگ گزارہ کوئی دن اور

اب کسے رہنما کرے کوئی

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی مرے دل میں ہے

غالب خستہ کے بغیر....

مشکور حسین یاد

کائنات عالم اشیا سے معمور ھے - شے نے سارے زمان و مکان پر قبضہ جمایا ھوا ھے - خلا کا تصور ایک واھمہ ھے - لیکن شے سے بڑھ کر بھی ایک مخلوق ھے جسے عرف عام میں آدمی کہتے ھیں - آدمی کا شے سے بڑھ کر ھونا کیا معنی رکھتا ھے ، یہ ایک الگ سوال ہے مگر اس کا یہ مفہوم ھرگز نہیں کہ آدمی میں شیئت کا فقدان ھے - وہ شے بھی ھے اور آدمی بھی - آدمی کی سب سے بڑی مصیبت یہی امتزاج ھے - آدمی محض شے ھوتا تب بھی کوئی مضائقہ نہ تھا اور آدمی صرف آدمی ھوتا پھر بھی کچھ نہ بگڑتا - سارے کھڑاگ کا باعث آدمی اور شے کا ایک جان ھو جانا ھے - نہ شے آدمی سے جدا ہے نہ آدمی شے سے -

آدمی اور شے کا امتزاج تو ایک حقیقت ھے لیکن اس حقیقت سے انحراف نے کیا کیا صورتیں اختیار کی ھیں اس بوالعجبی کو کیا کہا جائے - پھر لطف کی بات یہ ھے کہ اس امتزاج کو کائنات کا ذرہ ذرہ تسلیم کرتا ھے ، کوئی نہیں مانتا تو وہ آدمی کی ذات ھے - اگر آدمی اس امتزاج سے پوری طرح انکار کر دے اور خود کو صرف شے مان لے پھر بھی بڑی خیریت گذر سکتی ھے - وہ پوری طرح انکار بھی تو نہیں کرتا - سچ پوچھئے تو وہ ایسا کر بھی نہیں سکتا - یہ اُس کے بس کی بات نہیں - اگر اُس کے بس کی بات ھوتی تو وہ انکار کر کے شے کی نرم و گرم آغوش میں کبھی کا تحلیل ھو گیا ھوتا - ستاروں کی چمک اُس کی چمک اور دریاؤں کی روانی اُس کی روانی ھوتی - پھولوں کی مہک اُس کی مہک اور ھواؤں کی جولانی اُس کی جولانی کے نام سے موسوم کی جاتی - ممکن ھے اس کے جواب میں یہ کہا جائے کہ اب بھی ایسا ھی ھوتا ھے - ستاروں کی چمک ، پھولوں کی مہک ، دریاؤں کی روانی ، ھواؤں کی جولانی آدمی ھی کی چمک ، مہک ، روانی اور جولانی ھے - لیکن بغور دیکھا جائے تو ایسا

نہیں ہے - اشیا کی چمک دمک مہک ، روانی اور جولانی آدمی کے ہوش و حواس پر دستک ضرور دیتی ہیں لیکن اس دستک کا جواب کیا ملتا ہے اس کا دار و مدار قطعی طور پر آدمی کے اپنے موڈ پر ہے - ستاروں ، پھولوں ، دریاؤں اور ہواؤں کو آدمی اپنے کام میں تو لاتا رہتا ہے ، اُن کے کام آنے کو تیار نہیں ہوتا - اشیا کے حضور میں آدمی کی یہی تمکنت اُس کی رفعت اور بلندی کو ظاہر کرتی ہے - شے مجبور ہے - اب چونکہ آدمی میں شے بھی موجود ہے اس لئے آدمی بھی قید جبر سے آزاد نہیں - شے آدمی کے پاؤں کی زنجیر ہے - اس زنجیر کو کوئی کہاں تک توڑ سکتا ہے یا اسے ساتھ لے کر کہاں تک بلند ہو سکتا ہے ، اپنی اپنی ہمت پر موقوف ہے - ویسے اس زنجیر کو توڑ کر قطعی طور پر اس سے الگ ہو جانا شاید کوئی بھی پسند نہ کرے - پاؤں سے نکال کر اسے گلے کا ہار بنانے کی خواہش اکثر و بیشتر کو ہوتی ہے - اور غالباً یہ سب سے زیادہ آسان کام ہے - اس میں جلدی پھٹکڑی تو واقعی کچھ نہیں لگتی لیکن رنگ چوکھا نہیں آتا - یہی وجہ ہے آدمی سب کچھ پا کر بھی کھویا کھویا سا رہتا ہے - پاؤں کی چیز کو گلے تک پہنچایا اور پھر بھی کوئی بات نہیں بنی ، اُسے سخت اذیت سے دو چار ہونا پڑتا ہے - لیکن اب وہ کسی سے کچھ کہنے کے قابل نہیں رہتا - خود کردہ را علاج نیست -

اس تمہید سے میرا مطلب یہ ہے کہ آدمی نے انسان بننے کے لئے فطری طور پر کچھ قدریں تخلیق یا دریافت کیں اور پھر ان قدروں کے سہارے وہ دیگر اشیاء عالم سے ارفع و اعلیٰ ہو گیا - یہ قدریں آدمی کے شعور کا ثمرہ ہیں - ان قدروں کی بدولت وہ کائنات کو سمجھنے اور برتنے سے زیادہ اپنا صحیح مقام متعین کرتا ہے - اپنا صحیح مقام متعین کرنے کے بعد آدمی دوسرے موجودات عالم سے بلند تو ہو جاتا ہے لیکن یہ بلندی اُس کے لئے بے شمار درد و کرب لے کر آتی ہے - انسانی بلندی کا پہلا کرب تو یہی ہے کہ دیگر مخلوق سے آدمی کا رویہ دردمندانہ ہو جاتا ہے - وہ غیر ذات کو اپنے سے پست خیال نہیں کرتا - اُس کی نظر اُس کے روشن پہلوؤں پر زیادہ پڑتی ہے - اُسے غیر ذات کا حسن اپنی ذات کا آئینہ معلوم ہونے لگتا ہے - گویا بلند ہو کر یا اپنے صحیح مقام پر پہنچکر آدمی میں عجز پیدا ہو جاتا ہے جسے اگر حیا کا نام دیا جائے تو زیادہ مناسب ہے - یہ حیا اُسے دیگر اشیا کو محبت کی نظر سے دیکھنا سکھاتی ہے اور یوں بلند و ارفع آدمی کا رویہ غیر ذات سے عاشقوں کا سا ہو جاتا ہے -

غیرت مندی اور راستبازی ہو یا ہمدردی اور انصاف یہ سبھی قدریں خود آگاہی بخش کر آدمی کو انسان بناتی ہیں لیکن اس میں خستگی بھی پیدا کرتی ہیں ۔ خستگی کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان قدروں میں بذات خود کوئی خرابی موجود ہے بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ لوگوں کی زیادہ تعداد اشیا سے چپک کر رہ جاتی ہے ۔ وہ شے سے بلند ہونے کی ہمت نہیں رکھتے یا اپنی ہمت کو بروئے کار نہیں لاتے جب ایسے بے شمار لوگ محض چند افراد کو شے سے بلند ہوتا دیکھتے ہیں تو ان میں ایک طرح کا حسد پیدا ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں اکثریت اقلیت کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچاتی ہے ۔

انسانی رفعت کا یہ المیہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا ۔ ارفع و اعلیٰ نفوس پر تو جو گذرتی ہے سو گذرتی ہے ۔ جب ان کا وجود ناپید ہونے لگتا ہے تو اکثریت کو بھی اس کا احساس تنگ کرتا ہے ۔ اعلیٰ انسانی قدروں کے علمبردار جب تک نظر آتے ہیں لوگ انہیں مسلسل تکلیفیں پہنچاتے رہتے ہیں ۔ اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہونے لگتے ہیں تو ان کی کمی محسوس ہونے لگتی ہے ۔ اگرچہ یہ احساس اہل دنیا کے معمولات حیات میں کوئی رخنہ نہیں ڈالتا اور ان کی دنیاوی کامیابیوں پر بھی اثر انداز نہیں ہوتا تاہم ان میں وہ ایک خلش ضرور پیدا کر دیتا ہے ۔ بظاہر یہ خلش نہایت معمولی ہوتی ہے ۔ لیکن ان کی زندگیوں سے سچی خوشی بلاشبہ چھین لیتی ہے ۔ آدمی کتنا بھی اشیا کا ہو کر رہ جائے اسے کسی نہ کسی لمحے اپنے آدمی ہونے کا خیال آ ہی جاتا ہے ۔ طنزیہ انداز میں غالب نے اسی انسانی صورت حال کا اظہار اپنے اس مقطع میں کیا ہے ۔

غالب خستہ کے بغیر کونسے کام بند ہیں   روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

یہاں غالب خستہ انسانی اقدار کے ان علمبرداروں کی نمائندگی کر رہا ہے جنہیں دنیا والے جیتے جی چین کا سانس نہیں لینے دیتے اور جب وہ ان میں موجود نہیں رہتے تو پھر ان کے لئے واویلا مچاتے ہیں ۔ لیکن یہ واویلا بھی ایک حد سے آگے نہیں بڑھتی ۔ اس واویلا کا اتنا اثر کبھی نہیں ہوتا جس کی وجہ سے اہل دنیا کے کاروبار میں کوئی فرق آ جائے ۔

میں جب بھی غالب کا یہ مقطع پڑھتا ہوں میرے ذہن میں بھوں کی طرح بار بار یہی سوال ابھرتا ہے آخر انسانی اقدار کے اپنانے والوں کو یہ دنیا چین

سے کیوں نہیں رہنے دیتی ؟ ۔ کیا آدمی بھی کائنات عالم کی دوسری اشیا کی طرح محض ایک شے ہے ؟ کیا شے سے بلند ہونے کا خیال اس کے ذہن میں بطور حادثہ وارد ہو گیا تھا ۔ ؟ کیا انسانی قدریں محض ایک دکھاوا ہیں ؟ یا کہیں انسانی قدروں کو تخلیق کر کے آدمی نے اپنی محدود ذات کو خواہ مخواہ وسیع تر اور غیر محدود بنانے کی کوشش تو نہیں کی ؟ ۔ میرے پہلے سوال سے قطع نظر اگر باقی تمام سوالوں کا جواب نفی میں ہے تو میرا جی پھر چاہتا ہے کہ میں اسی بچگانہ استعجاب کے ساتھ پوچھوں کہ ہم اعلیٰ انسانی قدروں کو اپنی زندگی میں کیوں نہیں رچاتے بساتے ؟ ان قدروں کو اپنانے میں ہمیں کس لئے دشواریاں پیش آتی ہیں ۔ ؟ آخر ہم جلدی سے انسان کیوں نہیں بن جاتے ۔ ؟ اس کار خیر میں کونسے استخارہ کی حاجت ہے ؟ میں نے اپنے سوالوں کے بچگانہ ہونے کا ذکر پہلے ہی کر دیا ہے ۔ عموماً اس نوع کے سوالات کا جواب حکماء زمانہ کچھ اس طرح دیا کرتے ہیں تضادات سے زندگی کا حسن قائم ہے ۔ تمام لوگ آدمی سے انسان بن گئے تو پھر انسان کی قدر و منزلت کا پتہ کیسے چل سکے گا ؟ سب کے سب انسانی قدروں کو اپنا لیں گے تو انسانی معاشرے میں یکسانیت پیدا ہو جائے گی اور یکسانیت کا نتیجہ اکتاہٹ ہے ۔ جینے کا تمام تر لطف تضادات کی کشمکش میں ہے ۔ یہ کشمکش نہ رہی تو پھر باقی کیا رہا ۔ کشمکش کا دوسرا نام غم ہے ۔ اور غم کے بغیر زندگی بےمعنی ہو کر رہ جاتی ہے ۔ لیکن میرے بچگانہ تجسس کو ایسے جوابات سے اطمینان حاصل نہیں ہوتا ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر تمام آدمی اعلیٰ انسانی قدروں کو اپنا لیں تو کس طرح زندگی میں یکسانیت پیدا ہو کر سپاٹ پن اور بوریت آ جائے گی ؟ البتہ یہ خطرہ ضرور ہے کہ نام نہاد غم کا خاتمہ ہو جائے گا اور خوشیوں کا دور دورہ ۔ ممکن ہے میرے اس جملے سے آپ کو غالب ہی کا یہ مشہور شعر یاد آ رہا ہو ۔

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اس شعر کے بارے میں عموماً یہی کہا جاتا ہے کہ غالب نے اس شعر میں زندگی اور غم کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے ۔ لیکن بغور دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس شعر میں بھی غالب کا انداز طنزیہ ہے ۔ وہ زندگی اور غم کو اتنا لازم و ملزوم نہیں سمجھتا بلکہ جس طرح ہم کسی نا پسند چیز سے چھٹکارا

حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن جب نہیں کر پاتے تو تنگ آ کر کہتے ہیں اب تو اس کم بخت سے مر کر ہی نجات حاصل ہوگی، کچھ اسی طرح کا پیرایۂ بیان اس شعر میں پایا جاتا ہے۔ آخر میں لفظ کیوں نے تو طنز کو حد درجہ شدید کر دیا ہے۔

قصہ دراصل یہ ہے کہ تضادات کو زندگی کی رونق اور حسن سمجھنے والے اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ جس چیز کو رنگا رنگی کہا جاتا ہے وہ تضاد کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اسی لئے جہاں وہ اندھیرے کے مقابلے میں اجالے کا نام لیتے ہیں وہاں یہ بھی کہتے ہیں کہ خوشی کا صحیح احساس غم کی وجہ سے ہوتا ہے۔ حالانکہ حقیقت کچھ اور ہے۔ رنگا رنگی تضاد کا نتیجہ نہیں بلکہ زندگی کی وسعت اور پھیلاؤ کا دوسرا نام ہے۔ یہ درست ہے کہ زندگی نے ابھی تک ایک ہی قدم اٹھایا ہے جسے ہم غم کا قدم کہہ سکتے ہیں۔ اس قدم کا فاصلہ اور عرصہ کچھ زیادہ ہی طویل ہوگیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ زندگی اب آگے قدم نہیں اٹھائے گی اور ہم یہیں رک کر رہ جائیں گے۔ زندگی کا اگلا قدم یقیناً خوشیوں کا قدم ہوگا۔ اس کا امکان اسی حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ آدمی انسانی اقدار کو اپنی زندگی میں پوری طرح رچائے اور بسائے۔ یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ پھر دیکھنے والے دیکھیں گے کہ زندگی خوشیوں سے لبریز ہے اور اس میں رنگا رنگی بھی قائم ہے جو پہلے سے کہیں زیادہ تابناک اور آبرو مند ہے۔ جہاں تک نام نہاد غم کا تعلق ہے اس کا دور دور بھی نشان نہیں ملے گا۔ البتہ غالب خستہ کی اہمیت اس قدر بڑھ جائے گی کہ اس کے بغیر کاموں کا بند ہو جانا تو معمولی بات ہے خود زندگی کے کوئی معنی نہیں رہیں گے۔ میں نے غالب کے ساتھ خستہ کی صفت اس لئے برقرار رکھی ہے کہ اس وقت بھی خستگی انسان سے جدا نہ ہو سکے گی اگرچہ اس خستگی کے معنی آج کی خستگی کے معنی سے بالکل مختلف ہوں گے۔

غدر کے بعد

(وقت : قریب شام)

غلام الثقلین نقوی

(غالب کے کمرے کا ایک منظر۔ غالب قلم ہاتھ میں لے کر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں - قلمدان سامنے پڑا ہے) -

غالب ۔ (اپنے لکھے ہوئے خط کے فقرے بڑی اداس آواز میں پڑھتے ہیں) - ناتوانی زور پر ہے - رکاب میں پاؤں ہے نہ باگ پر ہاتھ ہے - بڑا سفر دور و دراز در پیش ہے ، زاد راہ موجود نہیں ۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے -

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

(نے منہ میں لے کر حقہ گڑگڑاتے ہیں ۔ حقہ بجھ چکا ہے - آواز دیتے ہیں) کلو !

کلیان - (آتا ہے - دروازے کے پاس کھڑا ہو کر) حضور !
(غالب پیچوان کی طرف اشارہ کرتے ہیں) -

کلیان - بے جان خاموش ہے -

غالب ۔ یہ کسی مسیحا کے ہاتھ میں ہو تو بولتا ہے - ناسخ کتنا سچ کہہ گئے تھے -

کلیان - ابھی چلم بھر کر تازہ کر لاتا ہوں (جانے لگتا ہے) -

غالب - نہیں . . . . کلو سے کہو کہ وہ چلم بھر دے -

کلیان ۔ کلو بازار سے سودا سلف لینے جا رہا تھا -

غالب ۔ اسے روک لو ۔

کلیان - (حیران ہوکر) اسے روک لوں حضور ؟

غالب - (بے خیالی میں) کلیان ! تم میرے مزاج شناس ہو -

کلیان - مجھے اس پر فخر ہے حضور -

غالب - (اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ) سنو بھئی ! میں بڈھا آدمی ، عرصے سے بیمار ، ضعف قویٰ میں مبتلا ، تم جانتے ہو (رک کر) وہ عرق جو بقدر طاقت بنائے رکھتا تھا ، اب میسر نہیں -

کلیان - حضور میں جانتا ہوں - کنجیاں ہمیشہ میرے پاس رہیں -

غالب - (اسی مسکراہٹ کے ساتھ) جب قلمرو ہند میں دلی نام کا کوئی شہر آباد تھا تو میں ہمیشہ انگریزی شراب پیا کرتا تھا -

کلیان - مجھے معلوم ہے حضور !

غالب - میں گڑ چھال کی شراب نہیں پیتا تھا - مجھے اس سے نفرت تھی -

کلیان - لیکن حضور اس وقت گھر میں . . . .

غالب - (اپنی ہی رو میں) بیس برس آگے کی بات ہے - ابر و باراں میں پس از طعام یا قریب شام تین گلاس پی لیتا تھا - اور شراب شبانہ معمول میں مجرا نہ لیتا تھا - اس بیس برس میں بیس برساتیں ہوئیں - بڑے بڑے مینہ برسے ، پینا ایک طرف دل میں خیال بھی نہ گزرا اور . . . اب تو . . . . رات کو بھی ایک گھونٹ نہیں ملتا -

کلیان - (متاثر ہوکر) اتنی مایوسی کی باتیں . . . . .

کالو - (کالو دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوتا ہے) سودا سلف کے لئے اندر سے پوچھ رہا تھا - بی وفادار کسی بات کا سر پیر نہ دے رہی تھیں - بی بی پچھوا رہی تھیں ، آج شام آپ کے لئے کیا پکے گا حضور ؟

غالب - (ناگواری سے) میں تہتر برس کا بوڑھا آدمی کیا کھاؤں گا (مسکرا کر) مشہور ہے کہ جو کوئی اپنے عزیز کی فاتحہ دلاتا ہے ، مردے کی روح کو اس کی بو پہنچتی ہے - گھر میں کچھ پک گیا تو میں بھی غذا کو سونگھ لوں گا -

کلیان - (ہنس کر) حضور ! گھر میں کچھ پکے گا ہی نہیں تو خوشبو کہاں سے آئے گی -

غالب ۔ (تجاهل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے) ٹھیک کہا! خوشبو کہاں سے آئے گی؟ . . . . گڑچھال کی شراب سے! ذرا عرق گلاب ملا دینا ۔ لطیف ہو جائے گی ۔

کلیان ۔ (ہنستا ہے) کلو ۔ حقہ تازہ کرلاؤ (کلو جانے لگتا ہے ۔ کلیان اسے ٹھہرا لیتا ہے) چلم بھر کر لاؤ تو مجھ سے مل لینا ۔ تمہارے پاس کے پیسے ہیں؟

کلو ۔ ایک روپیہ سات آنے ۔

غالب ۔ (چونک کر) ایک روپیہ سات آنے! کلیان اور کلو باہر جاتے ہیں تو غالب خط لکھنے کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں) ۔

غالب ۔ اب خاص اپنا دکھ روتا ہوں ۔ ایک بیوی اور دو بچے ۔ تین چار آدمی گھر کے ۔ کلو ۔ کلیان ۔ ایاز باہر ۔ مداری کے جورو بچے بدستور . . . . ایک پیسے کی آمد نہیں ۔ بیس آدمی روٹی کھانے والے . . . . جانتے ہو کہ علی کا بندہ ہوں ۔ اس کی قسم کبھی جھوٹ نہیں کہتا ۔ اس وقت کلو کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں ۔ بعد اس کے نہ کہیں سے قرض کی امید ہے ، نہ کوئی جنس رھن و بیع کے قابل ۔ اگر رام پور سے کچھ آیا تو خیر ورنہ اناللہ و انا الیہ راجعون ۔ (پچھلے دروازے کا پردہ ہلتا ہے ۔ غالب اپنے ہی خیالات میں محو ہیں) ۔

بی وفادار۔ (پردے کے پیچھے سے تتلاتی ہوئی آواز میں) حجور! بی بی کائے اِین ۔

غالب ۔ (چونک کر) کون؟ خیر سے بی وفادار ہیں؟

بی وفادار۔ (چیخ کر) بی بی کائے اِین ۔

غالب ۔ (کان پر ہاتھ رکھ کر) کون کائے ہیں بی وفادار! . . . . میں بہرہ نہیں ۔ یہ الگ بات ہے کہ سنتا نہیں ہوں ۔ کہو بی بی کیا کائے اِین؟

بی وفادار۔ (بدستور اونچی آواز میں) وہ آپ سے بات کائے ہیں ۔

غالب ۔ کچھ کہو بھی (خط لکھتے ہوئے) سنو ہرگوپال تفتہ! تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ . . . .

بیگم غالب۔(پردے کے پیچھے سے) یہ کلو سے آپ نے کچھ کہا ۔

غالب ۔ میں نے کچھ نہیں کہا نیک بخت ! کلیان نے کچھ کہا ہوگا ۔

بیگم غالب۔ ایک روپیہ سات آنے کی بات - یہی تو کل کائنات ہے اس وقت گھر کی . . . .

غالب ۔ (اپنی ہی رو میں) ایک عرصہ ہوا فکر شعر نہیں کر سکا . . . میر مہدی کو خط نہیں لکھا . . . ہرگوپال تفتہ الگ پریشان ہے -

بیگم - ہے ہے ! میری بات بھی تو سنو !

غالب - سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر -

بیگم - مجھے یہ بڈھے چونچلے ایک آنکھ نہیں بھاتے -

غالب - بہرہ ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات -

بیگم ۔ (جھجھلاتے ہوئے لہجے میں) وہ آپ نے کیا کہا کلو سے ایک روپیہ سات آنے کی وہی کاموہی . . . . وہی بلا . . .

غالب ۔ (بات کاٹ کر) ! . . . وبا تھی کہاں ؟ . . . . ایک بہتر برس کا مرد ، ایک ستر برس کی بڑھیا . . . . ان دونوں میں سے ایک بھی مرتا تو ہم جانتے کہ ہاں وبا آئی تھی - تف بریں وبا !

بیگم - (روکھی آواز میں) وبا تمہیں تو نہ لے جا سکی - اچھا ہوا . . . . مجھے لے جاتی تو میں اس مصیبت سے چھٹ جاتی . . . . اس ڈائن سے تو نجات مل جاتی جو ساٹھ سال سے اس گھر میں ڈیرا جمائے بیٹھی ہے . . . .

غالب ۔ کون سی ڈائن ! . . . سمجھا . . . . . وہی بلانا . . . . جو میاں کالے صاحب کے مکان میں رہتی تھی . . . .

بیگم - (غصے سے) کون میاں کالے ؟

غالب ۔ (سنجیدگی سے) غدر سے پہلے کی بات ہے بیگم - آہ ! کیا دن تھے اب نہ وہ دن رہے نہ وہ دلی . . . . میں پہلے گورے کی قید میں تھا -

بیگم - (بدستور غصے میں) وہ واقعہ یاد نہ دلاؤ - وہی روسیاہی . . . . ساری دلی میں وہ تھڑی تھڑی ہوئی کہ خدا کی پناہ . . . ابھی تک وہ کالک منہ سے نہیں چھٹی -

غالب ۔ (بدستور سنجیدگی سے) وہ تو کوتوال بر سر پرخاش تھا ورنہ شریف

زادوں آکے گھروں میں دو گھڑی دل بہلاوے کو چوسر اور گنجفے کی بازی جم ہی جاتی ہے -

بیگم - (اونچی آواز میں) واہ ! اچھا دل بہلاوا تھا - ایک شعر و شاعری اور اس پر جوا - سبحان اللہ ! میرا تو جی چاہ رہا تھا کہیں چلی جاؤں - دلی میں رہنا دو بھر ہو گیا تھا -

غالب - آہ مرحوم دلی ! میں پہلے گورے کی قید میں رہا - پھر کالے کی قید میں آگیا اور تم تھیں کہ نئے مکان میں جانے سے گھبرا رہی تھیں - تم کہتی تھیں کہ اس مکان میں بلا رہتی ہے اور میں نے یونہی کہہ دیا تھا کہ تم سے بڑی بلا اور کون ہوگی -

بیگم - (چڑی ہوئی آواز میں) یونہی کہہ دیا تھا اور اب پھر کہہ رہے ہو . . . . کاش مجھے تو موت آ جاتی -

غالب - (مسکرا کر) آج سے کچھ عرصہ پہلے یہی بات تمہارے منہ سے نکلتی تو خیر اور بات تھی (سنجیدہ ہوکر) لیکن اب تو ایسا نہ کہو بیگم -

بیگم - کیوں نہ کہوں؟ جہاں جہاں ہمارے منحوس قدم پڑے ، اس کی اینٹ سے اینٹ بج گئی -

غالب - ہاں ٹھیک کہتی ہو بیگم ! میاں کالے صاحب مغفور کا گھر اس طرح تباہ ہوا کہ جیسے جھاڑو پھری ، کاغذ کا پرزہ ، سونے کا تار ، پشمینے کا بال باقی نہ رہا -

بیگم - اور شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی کا مقرہ ؟ میں کئی بار وہاں زیارت کو گئی -

غالب - وہاں ایک اچھے گاؤں کی آبادی تھی - اب ایک جنگل ہے اور میدان میں قبر . . . . اس سے سوا کچھ نہیں -

بیگم - (پسیجی ہوئی آواز میں) ایک روپیہ سات آنے - آج رات کو کچھ نہ پکا تو کوئی بات نہیں - ایک فاقے سے کوئی نہیں مرے گا کچھ پیسے بچ رہے تو آدھ پاؤ گوشت منگوا لینا -

غالب - آٹھ پہر میں ایک بار آب گوشت پی لیتا ہوں - آج وہ بھی نہ سہی بیگم - اخذ ہوں - ہیچ ہوں - عاصی ہوں ، فاسق ہوں ، روسیاہ ہوں

پرمچ جاتا ہو -

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

کلیان - حضور!

غالب - کون ؟

کلیان - میں ہوں کلیان! چلم بھر لایا ہوں -

غالب - کلیان تم ؟ نجم الدولہ دبیرالملک اسداللہ خاں کے منشی ... میں نے آج تک تم سے یہ خدمت نہ لی -

کلیان - آقا! میں نے عمر بھر اس گھر کا نمک کھایا -

غالب - کلو بازار چلا گیا ؟

کلیان - جی حضور!

غالب - ایاز کو بھیج کر اسے روک دو -

کلیان - لیکن آپ ....

غالب - میں آپ اپنا تماشائی ہوں کلیان! خدا کا راندہ ، خلق کا مردود ، بوڑھا ناتوان ، فقیر ، نکبت میں گرفتار .... وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بدر بھیک مانگے وہ میں ہوں -

کلیان - حضور آج کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں -

غالب - (اپنی ہی رو میں) کاش! مجھے وہ دست گاہ نصیب ہوتی کہ تمام عالم کا میزبان بن جاتا - اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی - جس شہر میں رہوں ، اس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے -

کلیان - چلم رکھ دوں -

غالب - (بے خیالی میں) رکھ دو .... جاؤ (خط کا کاغذ سامنے رکھ کر سوچتے ہیں - روشنی آہستہ آہستہ کم ہو رہی ہے) اس نمائش گاہ کی سیر سے جس کو دنیا کہتے ہیں جی بھر گیا (رک کر) .... ہر دم دم نزع ہے .... دل غم سے خون ریز ہوگیا ہے .... وہی بلاخانہ ہے .... وہی میں ہوں .... سیڑھیوں پر نظر ہے کہ وہ میر

سہدی آئے . . . . وہ یوسف مرزا آئے . . . . وہ میرن آئے . . . .
مرے ہوؤں کا نام لینا . . . . ہزاروں کا ماتم دار ہوں . . . . میں
مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا . . . . بس اللہ ہی اللہ ہے -

دم واپسیں بر سر راہ ہے
عزیزو بس اللہ ہی اللہ ہے

کلیان - (آتا ہے) شمع روشن کر دوں حضور !

غالب - (آہستہ آہستہ آنکھیں کھول کر) کر دو - (سیڑھیوں پر سے کھٹ کھٹ کی آواز آتی ہے - چند لمحوں بعد کلو ہالپتا کانپتا آتا ہے) -

غالب - (حیران ہو کر) کیا بات ہے کلو ؟

کلو - حضور غضب ہوگیا -

کلیان - کیا ہوا ؟

کلو - رامپور سے !

غالب - (گھبرائے ہوئے انداز میں) رئیس رامپور ! . . . . خدا نہ کرے !

کلو - نہیں حضور ! قاصد ہے - گھر کا پتا پوچھتا ہوا آرہا تھا - میں ساتھ لے آیا -

غالب - (ہنس کر) بلاؤ اسے . . . . وظیفے کی رقم لایا ہوگا -

کلو - ہے تو کچھ ایسی ہی بات حضور ! کمر میں کچھ باندھ تو رکھا ہے اس نے !

کلیان - (اندر آکر) نواب رامپور کا خط ! (خط بڑے ادب سے پیش کرتا ہے) -

غالب - (خط کھول کر) کتنی قدردانی ہے ! کلیان ! سو روپے کی ہنڈوی - نہ رسید کی طلب - نہ شکریے کی خواہش - نواب صاحب مجھ کو نوکر نہیں سمجھتے - جو کچھ دیتے ہیں از راہ جوانمردی دیتے ہیں -

کلو - بی بی جی سے پوچھ لوں - بازار سے کیا کیا آئے گا ؟

غالب - ابھی نہیں کلو . . . . کلیان تم جاؤ اور ہنڈوی تڑوا لاؤ . . . . (مسکرا کر) تم جانتے ہو کہ مجھے گڑچھال کی شراب سے کتنی نفرت ہے -

کلیان ۔ (ہنس کر) یہ قدیمی غمخوار حضور کا مزاج شناس ہے ۔ (کلو اور کلیان باہر جاتے ہیں تو غالب خط لکھنا شروع کر دیتے ہیں) ۔

غالب ۔ زندگی میری کب تک؟ سات مہینے یہ اور بارہ مہینے سال آئندہ کے ۔ اسی مہینے اپنے آقا کے پاس جا پہنچتا ہوں ۔ وہاں نہ روٹی کی فکر ، نہ پانی کی پیاس ، نہ جاڑے کی شدت ، نہ گرمی کی حدت ۔ نہ مکان کا کا کرایہ دینا پڑے ، نہ کپڑا خریدنا پڑے ، نہ گوشت گھی منگاؤں ، نہ روٹی پکواؤں ۔ عالم نور اور سراسر سرور ۔ (مسکراتے ہیں اور آہستہ آہستہ پردہ گرتا ہے) ۔

* * * * *

غفلت کفیل عمر و اسد ضامن نشاط
اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

خودداری کا مجسمہ

ممتاز اقبال ملک

غالب کی نجی زندگی اور ان کے کلام کے بغور مطالعہ سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ جذبۂ خودداری ان کی پہلو دار اور منفرد شخصیت کا ایک اہم جزو ہے -

غالب قدیم جاگیردارانہ نظام کے ایک ممتاز خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور وضع داری ، رکھ رکھاؤ ، احساس برتری ، حسن پرستی اور خودداری ایسی جاگیردارانہ خصوصیات ان کی شخصیت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں -

ان کی نجی زندگی کے مطالعہ سے اکثر ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے ان کا جذبۂ خودداری کھل کر سامنے آ جاتا ہے - مولانا محمد حسین آزاد ''آب حیات'' میں ایک ایسا واقعہ یوں بیان کرتے ہیں -

''۱۸۴۲ میں گورنمنٹ انگلشیہ کو دہلی کالج کا انتظام از سر نو منظور ہوا - ٹامسن صاحب جو کئی سال اضلاع شمال مغرب کے لفٹینٹ گورنر بھی رہے اس وقت سیکرٹری تھے - وہ مدرسین کے انتظام کے لئے دہلی آئے اور چاہا کہ جس طرح سو روپے مہینہ کا ایک مدرس عربی ہے ایسا ہی ایک فارسی کا ہو - لوگوں نے چند کاملوں کے نام بتائے - ان میں مرزا کا نام بھی آیا - مرزا صاحب حسب الطلب تشریف لائے - صاحب کو اطلاع ہوئی - مگر یہ پالکی سے اتر کر اس انتظار میں ٹھہرے رہے کہ حسب دستور قدیم صاحب سیکرٹری استقبال کو تشریف لائیں گے - جبکہ نہ وہ ادھر آئے اور نہ یہ ادھر سے گئے اور دیر ہوئی تو صاحب سیکرٹری نے جمعدار سے پوچھا - وہ پھر باہر آیا کہ آپ کیوں نہیں چلتے - مرزا نے کہا کہ صاحب استقبال کو تشریف نہیں لائے میں کیونکر جاتا - جمعدار نے جا کر پھر عرض کی - صاحب باہر آئے اور کہا جب آپ دربار گورنری میں بحیثیت ریاست تشریف لائیں گے تو آپ کی وہ تعظیم ہوگی

لیکن اس وقت آپ نوکری کے لئے آئے ہیں - اس تعظیم کے مستحق نہیں - مرزا صاحب نے فرمایا کہ گورنمنٹ کی ملازمت باعث زیادتی اعزاز سمجھتا ہوں نہ یہ کہ بزرگوں کے اعزاز بھی گنوا بیٹھوں - صاحب نے فرمایا ہم آئین سے مجبور ہیں - مرزا صاحب رخصت ہو کر چلے آئے"۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے کہ غالب ایک دفعہ لکھنؤ گئے تو نائب سلطنت نے ان سے ملاقات کرنا چاہی - غالب اس شرط پر مان گئے کہ نائب سلطنت کھڑے ہو کر ان کی پذیرائی کریں اور حسب دستور نقد نذر پیش کرنے سے معذور سمجھیں - نائب سلطنت یہ شرائط ماننے پر راضی نہ ہوئے اور مرزا نے بھی خودداری پر آنچ نہ آنے دی -

مولانا الطاف حسین حالی "یادگار غالب" میں غالب کی وضع داری اور خود داری کے بارے لکھتے ہیں "باوجودیکہ مرزا کی آمدنی اور مقدور بہت کم تھا مگر خودداری اور حفظ وضع کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے - کبھی بازار میں بغیر پالکی یا ہوا دار کے نہیں نکلتے تھے - عائدین شہر میں سے جو لوگ ان کے مکان پر نہیں آتے تھے وہ کبھی ان کے مکان پر نہیں جاتے تھے" -

مرزا غالب کو خواہ ہم ماحول کے پس منظر میں دیکھیں خواہ نفسیات کی روشنی میں، یہ بات واضح ہے کہ انہیں فرسودگی اور تقلید سے سخت نفرت تھی اور خودداری، انفرادیت اور وضع داری ان کا خاصا تھی - غالب کے کلام میں بھی ان کی زندگی کا یہ اہم پہلو نہایت ہی نمایاں ہے - وہ کسی شخص کے آگے جھکنا پسند نہیں کرتے اور نہ ہی کسی کی پیروی کرتے ہیں - عام لوگوں کو رہنما بنانا تو درکنار وہ حضرت خضر علیہ اسلام کو بھی اپنا ہم سفر ہی خیال کرتے ہیں -

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہمسفر ملے

غالب کی خودداری نے انہیں کسی بڑے سے بڑے شاعر یا انسان سے اپنے آپ کو کم تر نہ سمجھنے دیا - چونکہ ان کی فطرت میں جدت اور انفرادیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اس لئے وہ اس بات کو اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے کہ اسی طرح لکھیں جس طرح سینکڑوں شاعر لکھتے چلے آ رہے

ہیں - ان کی خودداری نے ہی انہیں پیچیدہ لکھنے پر مجبور کیا - بیدل کے انداز میں لکھ کر انہوں نے بیدل کی تقلید نہیں کی بلکہ ان کا مقصد اپنے معاصرین کو بتانا تھا کہ اگر وہ طرز بیدل میں لکھ سکتے ہیں تو خود مرزا کے لئے بھی ایسا ناممکن نہیں ہے -

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا اسداللہ خاں قیامت ہے

غالب کی اس جدت اور انفرادیت کو مشکل پسندی کا نام دے کر ان کے معاصرین نے ان کی توجہ اس "خامی" کی جانب دلائی اور اشاروں کنایوں میں ایسا کلام لکھنے سے منع کیا - مثلاً ایک صاحب نے اس شعر کو غالب کا شعر کہہ کر سنایا

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال

مقصد ان لوگوں کا یہ تھا کہ مرزا کے اشعار بھی اسی طرح بے معنی ہوتے ہیں - غالب ان باتوں کو خاطر میں ہی نہ لاتے کیونکہ یہ تو ان کی خودداری کے خلاف تھا کہ 'سطحی قسم کے لوگ' بھی ان کے کلام کے معنی سمجھنے لگ جائیں - اس سلسلہ میں فرماتے ہیں -

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

پھر ایک رباعی کی شکل میں اعتراض کرنے والوں کو جاہل قرار دیتے ہیں -

مشکل ہے زبس کلام مرا اے دل
سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

غالب کا جذبۂ خودداری محض ان کی ذات تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ نوع انسان کی خودداری کے بھی خواہاں ہیں اور اس کی ذلت اور رسوائی پر نالاں۔ غالب خودداری کی ایک نادر مثال تھے اور ان کے کلام میں یہ جذبہ اوج کمال پر پہنچا ہوا ہے غالب خودبین اور آزاد منش تھے - یہ خودبینی اور آزاد منشی خودداری ہی کی پیداوار ہے

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا

عشق و محبت ، جو غزل کی جان ہیں ، میں خواری اور رسوائی غزل کا اہم جزو ہیں - غالب کا عشق خودی اور بے خودی کا حسین اور منفرد مجموعہ ہے - انہوں نے غزل کو بھی خودداری سے آشنا و ہم آہنگ کر دیا - وہ محبوب سے ملنے کو بڑے بے تاب ہیں ادھر ان کی خودداری کا تقاضا ہے کہ محبوب سے برسر عام بازار میں بات نہ کی جائے بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ محبوب انہیں گھر پر بلا لے - نتیجتاً محبوب گھر پر نہیں بلاتے، راستے میں ملنا ان کی وضعداری کے خلاف ہے - اگرچہ محبوب سے والہانہ فریفتگی اور انس ہے مگر انفرادیت اور خودداری اپنی جگہ قائم - اصولوں سے سمجھوتہ غالب کے لئے ناممکن -

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

محبوب سے حد درجہ پیار اور محبت ہے مگر خودداری یہاں بھی موجود

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

غالب نے عشق و محبت میں وضعداری اور خودداری کو سمو کر صحیح معنوں میں انہیں بلند مقام پر پہنچا دیا ہے -

واں وہ غرور عز و ناز ، یاں یہ حجاب پاس وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں ؟ بزم میں وہ بلائے کیوں

غالب کی خودداری غیرت اور عزت نفس کی پاسداری کا دوسرا نام ہے۔ انہوں نے ایک با حمیت اور خوددار عاشق کی طرح "راز معشوق" سے کبھی پردہ نہ اٹھنے دیا۔ جبکہ اکثر ممتاز شعرا کے معشوقوں کے حدود اربعہ تک سے عام لوگ ان کے کلام کی وساطت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ خطوط میں محبوبہ کی وفات پر آنسو بہانے اور اس کا مرثیہ لکھنے کے باوجود محبوب کا نام نوک قلم پر کبھی نہ آنے دیا۔

شرم رسوائی سے جا چھپنا نقاب خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

غالب نے ستم ہائے روزگار کا بڑی استقامت اور پامردی سے مقابلہ کیا اور خودداری کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹنے دیا۔

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر

بعض لوگ غالب کے جذبۂ خودداری کے سرے سے قائل ہی نہیں۔ اس سلسلہ میں ان پر سب سے بڑا "الزام" ان کی قصیدہ گوئی ہے۔ اور خصوصاً وہ قصائد جو انگریز حکام پر لکھے گئے۔ اعتراضات کی پٹاری والے اس حقیقت کو سراسر نظر انداز کر جاتے ہیں کہ غالب درباری آدمی تھے اور حسب دستور قدیم دربار میں نقد نذر پیش کرنے کی بجائے اپنے قصیدے ہی پیش کرتے تھے جو ان کا عظیم فنی سرمایہ تھے۔ مولانا حالی کے مطابق غالب کا قول ہے کہ 'جو قصیدہ نہیں لکھ سکتا اس کو شعرا میں شامل نہیں کیا جا سکتا'۔ گویا ان کا مطلب یہ تھا کہ غزل کے میدان میں تو ہر کہ ومہ اتر سکتا ہے مگر قوت تخیل کے امتحان کے لئے قصیدہ ہی کسوٹی ہے جوکہ فن کا ایک جزو ہے۔ چنانچہ فن کے ایک جزو پر طبع آزمائی کی وجہ سے غالب کی خودداری پر شک کرنا نامناسب ہے۔

مرزا غالب کا تخلص "غالب" ہی ان کی خودداری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ انہوں نے غالب تخلص رکھ کر واضح کر دیا کہ وہ کسی کے تابع یا کسی سے کمتر نہیں۔ غالب سچ مچ خودداری کا مجسمہ تھا۔ غالب ہمیشہ غالب ہی رہا اور رہے گا۔

غالب سے ایک انٹرویو

اختر وقار عظیم

میں - آداب عرض! مرزا صاحب - میں بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے اپنی بے پناہ مصروفیات میں سے وقت نکال کر کچھ باتیں کرنے کا موقع عطا فرمایا - تکلفات میں وقت ضائع نہیں کروں گا ۔ اس لئے مختصر سے شکریے پر اکتفا کرتے ہوئے اپنا کام شروع کرتا ہوں - پہلا سوال حاضر خدمت ہے حضرت! ایک زمانہ تھا جب آپ بہشت کو دل کا بہلاوا کہا کرتے تھے اور آپ نے فرمایا تھا :

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

لیکن اب بنفس نفیس یہاں تشریف لانے کے بعد آپ نے اس سلسلے میں کیا رائے قائم کی ؟

غالب - کم نہیں جلوہ گری میں تیرے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے ، ولے اس قدر آباد نہیں

میں - آپ کا مطلب ہے کہ بہشت میں ہماری دنیا کی طرح رونق وونق نہیں ہے ، ایسے میں تو آپ خاصی تنہائی محسوس کرتے ہوں گے ؟

غالب - کاو کاو سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھو
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

میں - اس تنہائی میں پھر تو آپ کو یقیناً اپنی دنیا کی یاد ستاتی رہتی ہوگی ، لیکن اس کے باوجود کبھی آپ نے وہاں آنے کا قصد نہیں کیا - آخر بہشت میں ایسی کیا خاص بات ہے جس کے لئے آپ اپنا گھر بار ، وطن سبھی کچھ بھولے ہوئے ہیں ؟

غالب - وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادہ گلفام و مشک بو کیا ہے

میں - یعنی آپ یہاں بھی اسی طرح سے نوشی فرماتے ہیں ؟

غالب - غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روز ابر و شب ماہتاب میں

میں - مرزا جی ! اگر بار خاطر نہ ہو تو براہ کرم یہ بھی بتائیے کہ بہشت میں آنے کے بعد آپ نے دنیا کے بارے میں کیا رائے قائم کی ؟

غالب - جفائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے بھی
دوام کلفت خاطر ہے عیش دنیا کا

میں - اب دنیا کی طرف لوٹ آئے ہیں تو سب سے پہلے ایک سوال آپ ہی کے بارے میں پوچھ لوں۔ مرزا جی میرا خیال ہے کہ ہر شاعر کے تخلص کے پیچھے ایک کہانی ہوتی ہے اور وہ کسی واقعہ کی نسبت سے کوئی تخلص اپنایا کرتا ہے - بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ لوگ اپنا حقیقی نام پسند نہ ہونے کی وجہ سے اسے تخلص کے پردے میں چھپا لیتے ہیں - لیکن آپ کا تو حقیقی نام بھی بہت پیارا ہے - کیا اچھا نام ہے . . . . اسد اللہ خان - اور ایک زمانے میں تو آپ اپنی غزلوں میں بھی اپنا تخلص اسد ہی کیا کرتے تھے - پھر کیا وجہ ہے کہ آگے چل کر آپ نے اپنے آپ کو غالب کہلانا زیادہ پسند کیا ؟

غالب - چھیڑتا ہوں کہ ان کو غصہ آئے
کیوں رکھوں ورنہ غالب اپنا نام

میں - یہ بھی آپ نے خوب کہی "ان" کا ذکر آگیا ہے تو جی چاہتا ہے کہ کچھ سوال آپ کے محبوب کے بارے میں بھی پوچھ لوں کہ آپ کی ساری زندگی اس محبوب کے ناز اٹھاتے گزری لیکن آپ سے کبھی وہ بے تکلف نہ ہوا -

غالب - آہی جاتا وہ راہ پر غالب
کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

میں - جی ہاں کیوں نہیں ؟ خیر چھوڑیے یہ بات تو رہی ایک طرف۔
مجھے یہ بتائیے کہ یہ جو آپ نے ایک مرتبہ کہا تھا۔

سنتے ہیں بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

اور پھر ایک اور جگہہ آپ نے یہاں تک کہہ دیا تھا۔

کیا ہی رضوان سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

یہاں آنے کے بعد یقیناً کبھی تو آپ کو اپنے محبوب کی یاد ستائی ہوگی
ذرا یہ تو فرمائیے ایسے میں رضوان اور آپ کے تعلقات کیسے رہے۔
میرے خیال میں اس دوران میں آپ کے اور ان کے تعلقات ٹھیک ہی
رہے ورنہ اس سلسلے میں کوئی نہ کوئی خبر ہمارے سننے میں
بھی آتی ، یہاں میرے ذہن میں ایک دلچسپ سوال ابھر آیا ہے۔
وہ یہ کہ اگر آپ کے محبوب کے در کا دربان رضوان کو بنا دیا جاتا
تو کیسی رہتی ؟

غالب - بعد یک عمر ورع ، بار تو دیتا بارے
کاش ! رضواں ہی در یار کا دربان ہوتا

میں - آپ نے فرمایا ہے۔

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

لیکن میرے خیال میں جب تک آپ کی شاعری سے اس محبوب کا
ذکر خارج نہ کیا جائے اس وقت تک آپ ولی ہونے کا دعویٰ
نہیں کر سکتے۔ صرف بادہ نوشی ترک کرنے سے وہ بات پیدا نہیں
ہو سکتی۔ خیر چھوڑئے اس بات کو۔ یہ بتائیے کہ کبھی آپ کی
اس محبوب سے ملاقات بھی ہوئی جس کا ذکر ہر وقت آپ کے ورد زبان
رہتا ہے ؟

غالب - یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

میں - کمال کر دیا آپ نے بھی اس کے باوجود اتنی ناز برداریاں ؟ میری مانیئے تو ایسے محبوب کا خیال دل سے نکال دیجئے - کیوں کیا خیال ہے آپ کا ؟

غالب - چھوڑوں گا میں نہ اس بت کافر کو پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

میں - خیر صاحب آپ کی مرضی ، میں کیا کہہ سکتا ہوں - یہاں بیٹھے بیٹھے خاصی دیر ہو گئی ہے - آئیے اٹھیے ذرا باغ بہشت کی سیر ہی کریں - باتیں بھی ہوتی رہیں گی -

غالب - باغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر
ہر گل تر ایک چشم خونفشاں ہو جائے گا

میں - جیسی آپ کی مرضی ! یہیں بیٹھے بیٹھے کچھ اور باتیں پوچھتا ہوں - یہ سوال بہت دیر سے میرے ذہن میں منڈلا رہا ہے کہ اردو شاعری کی تاریخ میں بڑے بڑے نامور شعرا ہو گزرے ہیں ، مگر جتنا بڑا شاعر آپ کو مانا جاتا ہے ، اتنا کسی اور کو نہیں سمجھا جاتا - کچھ آپ ہی بتائیے ، ایسا کیوں ہے ؟

غالب - ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

میں - لیکن بعض لوگ ایسے بھی تو ہیں جو آپ کی شاعری کو تکلف محض سمجھتے ہیں ان کی بابت آپ کیا کہیں گے ؟

غالب - غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

میں - اچھا مرزا جی اب یہ بتائیے کہ کیا ذوق شاعری آپ کو ورثہ میں ملا تھا ؟

غالب - سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

میں - اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے اردو شاعری میں جو اتنا نام پیدا کیا وہ سب آپ کی ذاتی قابلیت کا نتیجہ ہے ، خوب - مرزا جی ! آپ کی

شاعری کے بارے میں بھی بات چیت ہو چکی ، آپ کے محبوب کا بھی ذکر ہو چکا ، اب کچھ اپنے بارے میں کہیئے ؟

غالب - اسد ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سروپا ہیں
که ہے سر پنجۂ مژگان آہو پشت خار اپنا

میں - مرزا جی آپ نے اتنی سی دیر میں جھٹ سی پتے کی باتیں بتا دیں ، میں اگر آپ کا شکریہ ادا کرنا بھی چاہوں تو یہ میرے لئے ممکن نہیں البتہ اتنی دیر سمع خراشی کی معافی چاہتا ہوں ، اب اجازت دیجئے - دنیا سے متعلق میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بسرو چشم حاضر ہوں -

. . . خاموشی . . . .

میں - مرزا جی آپ خاموش کیوں ہیں ، کیا مصلحتاً کچھ کہنا نہیں چاہتے ؟

غالب - جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے ، وگرنہ ہم
سر جائے یا رہے ، نہ رہیں پر کہے بغیر

میں - یقیناً آپ نے درست فرمایا - مجھے بھی آپ کی بیباکی پر پورا یقین ہے ، یہ آپ ہی کی ہمت تھی کہ آپ نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے ظلم و ستم دیکھنے کے باوجود اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر دھلی میں انگریزوں کے ہاتھوں ہونے والے مظالم کا نقشہ ان دو شعروں میں بڑی عمدگی اور بیباکی سے کھینچ دیا تھا -

چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دھلی کا ذرہ ذرۂ خاک تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا

لیکن اس کے باوجود میرا جی چاہتا ہے کہ میں دنیا میں جا کر آپ کی کوئی خدمت بجا لاؤں اور کچھ نہیں تو ہماری دنیا والوں کو کچھ نصیحت ہی کر دیجئے - حالانکہ یہ بات عجیب سی لگتی ہے کہ میں آپ سے نصیحت کرنے کو کہہ رہا ہوں یہ جانتے ہوئے بھی کہ آپ کے خیالات ناصح کے بارے میں کبھی اچھے نہیں رہے ، ناصح دوست کو تو آپ دوست ہی ماننے کو تیار نہ تھے -

. . . خاموشی . . .

میں - مرزا جی ! آپ خاموش کیوں ہیں ، کچھ فرمائیے نا ۔

غالب - نہ سنو گر برا کہے کوئی نہ کہو اگر برا کرے کوئی ۔
روک لو گر غلط چلے کوئی بخش دو گر خطا کرے کوئی

میں - سبحان‌اللہ مرزا جی آپ نے کیا عمدہ پیغام مرحمت فرمایا ہے ، جی خوش ہوگیا - مجھے واپس جانے سے پہلے ذرا ایک اور صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہونا ہے اجازت - خدا حافظ !

غالب - تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
ہم کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

غالب اور قبول عام

اجمل نیازی

آج کل جسے دیکھو غالب کے حوالے سے بات کرتا ھے - لوگوں کا "پسندیدہ" شاعر غالب ہے - دنیا بھر میں عموماً اور سارے برصغیر پاک و ھند میں خصوصاً غالب کا چرچا ھے - پورے ایک سو سال کے بعد اب وہ ھمارے ذوق اور احساس پر پوری طرح چھا گیا ھے - ادب کے علاوہ صحافت ، سیاست ، معاشرت اور دوسرے تمام شعبوں پر بھی اثر انداز ھوا ھے - پریس کانفرنسوں میں سوال و جواب کے طور پر غالب کے اشعار استعمال ھوتے ھیں - سیاسی صورتحال جو رخ اختیار کرتی ہے غالب کے کلام کے دھارے اسی طرف موڑ دیئے جاتے ھیں - معاشرت کی تو بات ھی اپنی ھے - مذاق بھی کرنا ھوتا ھے تو غالب کا شعر پڑھا جاتا ھے ، مذاق اڑانا مقصود ھو تو بھی غالب کا شعر - رات کو خواب میں غالب سے ملاقات ھوتی ھے - اور خواب کی تعبیر کے لئے دیوان غالب کھولا جاتا ھے - اگر نیند نہ آئے پھر بھی -

موت کا ایک دن معین ھے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

پہلے لوگ راہ چلتے ھوئے ، غسل فرماتے ھوئے ، وقت پاس کرنے کے لئے ، کسی سے چھیڑ چھاڑ کرنے کی غرض سے ، اظہار عشق و محبت کے طور پر اور بس یونہی موڈ میں آ کر کسی نئی پکچر کا "پرانا" گانا زیر لب کچھ بالائے لب گنگنایا کرتے تھے اب غالب کے اشعار پڑھتے ھیں - غالب کسی کا استاد محترم ھے کسی کا چچا بزرگوار اور کسی کا صرف بزرگ - کوئی ان سے جت ھی متاثر ھے - کوئی خاصا مرعوب اور کوئی نہایت معتقد -

"بس جی غالب غالب ھے" یہ فقرہ میں کم از کم ایک ھزار ایک سو ایک آدمیوں سے سن چکا ھوں - تقریباً ھر ا-ب یا ا-ن جاننے والے کو غالب کا

ایک آدھ شعر یا شعر کا پورا آدھ مصرعہ یاد ہے۔ خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔ گفتگو کے دوران کسی نہ کسی جگہ کہیں نہ کہیں ضرور جڑ دیں گے۔

"واہ غالب بھی کیا شے تھا۔ سبحان اللہ، جزاک اللہ۔"

اس اندھا دھند مقبولیت سے کئی مضحکہ خیز صورتیں اور کیفیتیں سامنے آتی ہیں۔ بائرن جب کچھ زیادہ ہی مقبول ہوگیا تو اس کو لنگڑاتا دیکھ کر لوگ بھی لنگڑے بن گئے۔ اور دیکھا دیکھی یہ "لنگڑاپا" ایک فیشن اور رواج بن گیا۔ جب بھی کوئی آدمی "پاپولر" ہوا تو لوگوں نے اس جیسا بننے کے لئے کیا کچھ نہ کیا۔ (صرف فلم ایکٹر اور ایکٹرسوں کو لے لیجئے) اور

آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے

اسی طرح آج کل لوگوں کو "غالبیریا" ہوا پھرتا ہے۔ آخر یہ کیوں ہوا۔ شاعر تو اور بھی ہیں اور تھوک و پرچون دونوں حساب سے ملتے ہیں۔ مگر یہ کیا کہ ایک شاعر لوگوں کا اپنا شاعر بن جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ وابستگی اور عقیدت کا اظہار بڑی عجیب و غریب صورتوں میں ڈھلتا رہتا ہے۔ اس کے اشعار زباں زد عام ہو جاتے ہیں اور ضرب المثل کی سی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ لوگ اسے اپنے جذبات کا ترجمان سمجھتے ہیں۔ اپنے حالات کے مطابق پاتے ہیں۔ مختلف "سیچوایشنز" پر منطبق (Apply) کرتے ہیں۔ انہیں یہ کہتے ہوئے کتنا کیف اور مسرت محسوس ہوتی ہے کہ یہ شعر ہمارے بارے میں لکھا گیا ہے۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

سچ ہے

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

غالب کے قبول عام کا راز بھی یہی ہے کہ اس نے لوگوں کے دل کی بات کہی ہے۔ ان کی زندگی کی بات کی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ ہم سے واقف تھا اس نے یہ زمانہ دیکھا ہوا تھا۔ گویا وہ ابھی یہاں سے ہو کر ہم سے مل کر گیا ہے یعنی وہ ہمارا بے تکلف دوست تھا۔ اتنا بے تکلف کہ ہمارا سب کچھ اس پر عیاں تھا۔ وہ ہمارا ہم راز تھا۔ ہمدرد بھی تھا اور شاید "ہمعصر" بھی۔

وہ غلطی سے بہت پہلے پیدا ہو گیا تھا ۔ وہ ہر طرح سے ہمارے زمانے کا آدمی ہے ہماری عادتیں ، ہمارے مشغلے ، ارادے ، آرزوئیں ، خواہشیں ، خوشیاں ، غم ہمارا سب کچھ اسکا بھی تھا اور وہ زندگی کے تمام پہلوؤں سے آشنا تھا۔ اس کے اشعار اکثر و بیشتر تمام مردوں اورکم و بیش ساری عورتوں پر صادق آتے ہیں۔ کبھی آپ نے محسوس کیا کہ اس نے ہمارے بارے میں کتنی بے لاگ اور فطری آرا کا اظہار کیا ہے ۔ نجانے اس نے ہم سے اتنا لمبا چوڑا تعارف کیسے حاصل کر لیا تھا ۔ بہرکیف دوسروں سے ہمارا تعارف خوب کرایا ہے ۔ زندگی کے ہر شعبے کے لوگوں نے غالب کے شعروں میں اور شعروں سے اپنا مطلب ڈھونڈنے اور اپنا مطلب نکالنے کی خاصی کامیاب کوششیں فرمائی ہیں ۔ ان کوششوں کے دوران جو کچھ منظر عام پر آیا وہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے ۔ بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لینے کے بمصداق لوگوں نے قبول عام کے اس سیل رواں میں نہانے ، تیرنے اور کشتیاں چلانے تک کی مشق کر ڈالی ۔ شعروں کے جا و بے جا استعمال سے جائز و ناجائز فائدے اٹھانا چاہے ۔ مصیبت تھی تو یہی کہ غالب ہمیں بہت پہلے سے بڑی اچھی طرح جانتا تھا مگر ہم اسے اب تک تھوڑا سا بھی نہیں سمجھ پائے ۔

اب اسے کیا کہیں کہ اس کے باوجود بھی تقریباً ہر کوئی ہر کہیں ہر حالت میں اور ہر وقت غالب کا ذکر خیر و شر فرمانے پر تلا ہوا ہے ۔ عام لوگ ان پڑھ طبقہ بھی حیرانی اور دلچسپی کے ملے جلے تاثر سے پوچھتا ہے ۔ ''یار ایہہ غالب کون سی ۔ جدھر جاؤ غالب غالب ہوندی پئی اے ۔ حال چال پچھو ۔ کوئی بچیاں دی خیر خیریت ۔ اک ادھ نویں تازی ۔ کجھ ملک دا حال ۔ ایویں کوئی گل بات ۔۔ بس ہور کچھ نہ ۔ شروع ہو جان گے ۔ غالب صاحب نے کیا کھوب فرمایا اے ۔ بھئی ٹھیک اے ۔ پر پہلاں ایہہ تاں دسو اوہ ہے گا کون سی ، کی کردا سی تے کتھوں دا سی''۔

اس کے برعکس امریکہ ، برطانیہ ، روس ، جرمنی ، فرانس اور کئی دوسرے ملکوں میں پڑھے لکھے طبقے میں یہی تجسس پایا جاتا ہے اور ۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون تھا
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

ان دنوں شاعر اور ادیب غالب سے بری طرح متاثر ہیں ۔ بس یکلخت ہی متاثر ہو گئے ہیں ۔ مختلف رشتے ناطے ، برادری ، پرانی دوستی ، عقیدت مندی

اور دوسرے کئی وغیرہ وغیرہ تعلقات پیدا کر کے غالب کو "اپنا" آدمی ثابت کیا جا رہا ہے - اس کی وساطت سے "سکوپ" بننے لگا ہے - بہتوں کا بھلا ہو چکا ہے - باقیوں کا ہو رہا ہے - اردو زبان کے تقریباً سارے شعرا غالب سے متاثر ہیں اور یہ متنازعہ فیہ مسئلہ نہیں - دوسری زبانوں مثلاً انگریزی ، فرانسیسی، روسی ، جرمن اور جاپانی وغیرہ کے شاعروں کو بھی غالب کے شانہ بہ شانہ بلکہ سینہ بہ سینہ دکھانے کے خاصے کامیاب پروگرام بنائے گئے ہیں - غالب انگریزی زبان کا "وہ" ہے - روسی زبان کا ''یہ'' ہے - جرمن جاپانی کا ''یہ وہ'' دونوں ہے- یہ بھی غالب کے غلبے کا کرشمہ ہے کہ اس نے ایک دنیا کو مغلوب بنا رکھا ہے

ایں سعادت بزور بازو نیست

اس سے پہلے اردو زبان میں اقبال کے سوا کسی شاعر کو اتنی پذیرائی ، اس قدر قبول عام اور ایسا مقام نہیں ملا - اس لحاظ سے اقبال غالب کے بعد آیا اور پہلے رہا - مگر یار لوگوں نے دوسرے شاعروں کی طرح اقبال کو بھی غالب سے متاثر منوا کر تمام قبول عام کے ''العام'' کا غالب کو مستحق قرار دے دیا -

اقبال نے مسلمانوں کی سوچوں کو تکلم عطا کیا - ان کی بے زبانی کو زبان دی - پھر عشق رسول وہ جذبہ ہے جو کسی بھی آدمی کو مسلمانوں کے قریب کر دیتا ہے - بس پھر کیا تھا - ان کے اشعار گھروں میں سڑکوں پر ، تقریروں ، تحریروں ، عام گفتگو اور خاص بات چیت میں بے تکلفی اور بے دردی سے استعمال کئے گئے - خواہ ان کا مطلب آتا ہو یا نہ آتا ہو - لڑکے لڑکیوں کو کلام اقبال رٹایا جانے لگا - جیسے قرآن پاک حفظ کیا جاتا ہے - اور ۹۹ فیصد حفاظ اس کے سوا کچھ نہیں جانتے کہ یہ خدا کا کلام ہے - اس کی ضرورت بھی کیا ہے قرآن حفظ کر لینا کیا کم ثواب ہے - یہی حال کلام اقبال کا ہوا - بقول بجنوری وید مقدس کے بعد الہامی کتاب دیوان غالب ہے - لوگوں نے دیوان غالب زبانی یاد کر لیا اور دیوانۂ غالب بن گئے - کلام خدا کے بعد متبرک چیز کلام اقبال ہے - چنانچہ دھڑا دھڑ اقبال کے اشعار حفظ کئے گئے اور یوں اقبال مند بننے کی ٹھانی -

ایک بزرگ نے مجھے ایک دفعہ نصیحت فرمائی کہ اے بد نصیب ! اگر صبح سویرے تلاوت قرآن کرنا تیری قسمت میں نہیں تو کلام اقبال ہی پڑھ کر آ جایا کر - بہت ثواب ہوتا ہے - اور میں نے یہ ثواب خوب کمایا - مگر

اس سے اقبال کو کیا فائدہ پہنچا - یہ میں نہیں جانتا - اسی قسم کے لوگ اقبال کو صرف مذہب کا شاعر سمجھنے لگے اور مولوی صاحبان نے مسجدوں میں اور منبروں پر اپنے گراں قدر خطبوں اور وعظوں کے دوران کلام اقبال کی "تلاوت" شروع کر دی - بے چارے ان پڑھ اور سادہ لوح عوام نے کلام اقبال کو مولود شریف سمجھ لیا اور اقبال مشہور ہو گیا - اس کا کلام ہر پکی روٹی پڑھے اور کچی پکی پاس آدمی کی زبان پر رواں دواں ہوگیا - اس سے ثابت ہوا کہ اقبال بہت بڑا شاعر ہے - مثلاً ان کا یہ شعر بہت مشہور و مقبول و معروف ہے اور سب سے پہلے مجھے بھی یہی شعر یاد ہوا -

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

بسوں اور بس سٹاپوں ، ریل گاڑیوں اور ریلوے سٹیشنوں پر دانت منجن یا اسی قسم کی کوئی اور چیز فروش صاحبان قدردان اپنے بلیغ خیالات اور وسیع معلومات سے پہلے بسم اللہ کی جگہ یہ شعر پڑھنا نہایت ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ اس طرح حاضرین جو مسافرین بھی ہیں ضرور متاثرین ہوں گے اور اسی وقت موقعے پر دانت منجن خرید کر آنکھوں کا سرمہ بنا لیں گے -

ہمارے ایک ماسٹر جی اچانک رحلت فرما گئے - خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے - بہت ظالم آدمی تھے - گن کر پورے پچیس ڈنڈے مارتے تھے - چوبیس پر آ کر ہر بار بھول جایا کرتے تھے اور پھر نئے سرے سے گنتی شروع کر دیتے - ایک مرتبہ جماعت میں کسی نے پوچھا - تاریکی کے کیا معنی ہیں تو انہوں نے فرمایا "مرغی" - ہم حیران کہ ابا جان نے اندھیرا بتلایا تھا - ڈرتے ڈرتے عرض کی تو مار مار کے ہمیں مرغا بنا دیا اور ارشاد شروع کیا - مرغی کے چوزے ہوتے ہیں جب چیل ان پر جھپٹتی ہے تو وہ انہیں اپنے پروں کے نیچے چھپا لیتی ہے وہاں ان چوزوں کو کیا محسوس ہوتا ہے - اندھیرا - معلوم ہوا کہ تاریکی کے معنی مرغی - اور وہاں ان کے ڈنڈے (مولا بخش) کے سائے میں ہمیں یوں محسوس ہوا تھا جیسے چیل کے پنجوں میں چوزے - خیر خدا انہیں جزائے خیر دے - ویسے بہت اچھے آدمی تھے - ان کی وفات حسرت آیات پر ایک جلسہ ہوا اور ہیڈ ماسٹر صاحب نے یہی شعر پڑھا -

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ساری محفل پر رقت طاری ہوگئی اور ہمیں یقین ہوگیا کہ علامہ صاحب نے یہ شعر ہمارے ماسٹر صاحب کے لئے لکھا ہے ۔ نرگس کو روتے ہوئے ہزار سال ہوئے یا نہیں ، اس دن ہزاروں بچوں کو خوشی ہوئی کیونکہ وقت سے پہلے چھٹی ہوگئی تھی ۔

یہی شعر جب ایک مولوی صاحب نے خطبے کے فوراً بعد قرات کے ساتھ پڑھا تو لوگوں نے جانا کہ شاید یہ بھی خطبے کا ہی حصہ ہے ۔ پہلی صف میں بیٹھا ہوا ایک بڈھا چرواہا زار زار رونے لگا ۔ مولوی صاحب کی گردن تن کر کچھ اور موٹی ہوگئی اور وہ اپنی تقریر کی تاثیر دیکھ کر پھول کر کپا بن گئے۔ ”بزرگو کیہہ گل اے ۔ تہانوں کیوں رون آیا ۔“

بڈھے نے آنسوؤں اور ہچکیوں میں الفاظ کو توڑ کر بلکہ نچوڑ کر کہا ۔ ”سچ فرمایا اے رب پاک نے کہ دھی دا ”ور“ ملنا بڑا مشکل اے ۔ مری کاکی دا ناں نرگس اے ۔ اوہدے وال چٹے ہون لگ پئے نیں تے حالی تک ویاہ نہیں ہویا ۔“

یہ ہے اقبال کے قبول عام کی ایک جھلک ۔ اقبال کا ایک اور شعر یعنی اللہ تعالیٰ نے بانگ درا میں فرمایا ہے ۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اس کی ”ضرب الامثالیت“ پھر کبھی عرض کروں گا ۔

غالب کے ذکر سے مجھے خاص طور پر اس لئے اقبال یاد آیا کہ ایک تو یہ غالب سے بھی زیادہ عوامی اور مقبول عام شاعر ہے اور دوسرا سر عبدالقادر نے بانگ درا کے دیباچے میں لکھا ہے کہ اگر میں مسئلہ آواگان کا قائل ہوتا تو کہہ دیتا کہ غالب کی روح اقبال کے وجود میں حلول کر آئی ہے ۔ وہ تو خیر ہوئی ”سر“ صاحب اس مسئلے کے قائل نہ ہوئے ورنہ . . .

اب یہ نقاد حضرات جانیں کہ اقبال غالب سے متاثر ہے تو کیونکر اور کس طرح اور کس لئے ۔ اس طرح تو اقبال بہت سے آدمیوں سے متاثر ہے ۔ مثلاً شکوہ جواب شکوہ اس نے حالی سے متاثر ہو کر لکھا ہے اور یہ شعر رومی اور رازی دونوں سے مل کر اکٹھا متاثر ہونے کے بعد کہا ہوگا ۔

اسی کشمکش میں گزریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

کچھ چیزیں نطشے سے مرعوب ہو کر لکھیں - جرمنی میں تعلیم جو پائی تھی اور کافی سے بھی زیادہ نظمیں اللہ تعالیٰ سے متاثر ہو کر قلمبند فرمائیں کیونکہ وہ قرآن مجید پڑھتے ہوئے بہت رویا کرتے تھے -

مانے لیتے ہیں مگر ہمیں صرف غالب سے غرض ہے - ہم سر قادر کی طرح کچھ ایسے ویسے نقاد نہیں کہ یہ ہمارا پیشہ ہے ورنہ ہم غالب کی اولیت اور اہمیت کی دھاک بٹھانے کے لئے ثابت کر دیتے کہ اقبال نے تقریباً ہر شعر غالب سے متاثر حتیٰ کہ بہت ہی اور زیادہ سے زیادہ متاثر ہو کر لکھا ہے - اب ایک خوددار ادیب ہونے کی حیثیت سے عبدالقادر کی بات ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا - وہ تو انہوں نے صرف دیباچے کے طور پر لکھا ہے اور دیباچہ لوگ "کچھ تو لکھنا پڑے گا" کے زریں اصول کے تحت لکھتے ہیں - یہ الگ بات کہ بعض اوقات دیباچے کے دو تین صفحے اصل کتاب کے دو تین سو صفحوں سے زیادہ موزوں ، دلچسپ اور ٹھیک ہوتے ہیں - اور لوگ صرف دیباچے کے لئے کتاب خریدتے ہیں - بانگ درا کے مقابلے میں دیباچۂ قادر -- خیر ہم صاف مکر گئے کہ صاحب ! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اقبال غالب سے متاثر ہو جائے - بس خواہ مخواہ ہی - یہ تو وہی بات ہوئی جیسے یونہی کوئی کہے کہ اکبرالہ آبادی نظیر اکبر آبادی سے بری طرح متاثر ہے - کیوں متاثر ہے ؟ یہ بتانے والی بات نہیں - آخر کیوں ؟ بس ہے --- کوئی وجہ تو ہوگی ؟ ہر بات کی وجہ نہیں ہوا کرتی -

اگر کوئی متاثر ہونے والی ایسی ہی ضروری بات ہوتی تو اقبال رومی وغیرہ کے ساتھ غالب کا بھی ضرور ذکر کرتا - وہ تو پاس ادب سے اپنے آپ کو مرید ہندی کہتا ہے -

پیر رومی را رفیق راہ ساز
تا خدا بخشد ترا سوز و گداز

غالب نجانے میر تقی میر سے متاثر تھا بھی کہ نہیں مگر

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

کیا یہ ضروری ہے کہ جو معتقد ہو وہ لازماً متاثر بھی ہو۔ عقیدت بزرگوں سے ہوتی ہے اور ہو جایا کرتی ہے محبت کی طرح - مگر ان کا اثر قبول کرنے کم ہی کسی کو دیکھا ہے ۔ اگر ایسی ہی بات ہے تو ناسخ میر صاحب سے چلے متاثر ہے اور غالب کو یہ نیک خیال ناسخ کی وجہ سے ہوا ۔ گویا خربوزے کو دیکھ کر خربوزے کا رنگ پکڑ لینا سولہ آنے درست ہے ۔ اب ذرا ڈبکی لگا کر دیکھئے کہ ناسخ کے بحر غزل میں کہاں کہاں میر صاحب ڈبکیاں کھاتے پھرتے ہیں ۔ اب یہ امام ، میر اور مرزا کا ذاتی معاملہ ہو گیا - ایک اور جگہ غالب نے کہا ہے ۔

ریختہ کے تمہی استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

استاد والا معاملہ بھی عجیب ہے - غالب کس طرف سے اور کس لحاظ سے میر کے شاگرد رشید ہوئے ۔ اکثر سکولوں میں پڑھنے والوں کی پوری ایک کلاس کا صرف ایک استاد ہوا کرتا ہے مگر بچے سکول کے باقی تمام یعنی تیرہ چودہ عدد استادوں کو بھی بالکل اپنا استاد سمجھتے ہیں راہ میں کبھی مل جائیں تو اسی ادب سے ہاتھ اٹھا کر سلام کرنا پڑتا ہے - استاد جی سلاما لیکم ۔ ورنہ دوسرے دن خیر نہیں ۔ غالب کا میر سے غالباً اور شاید ایسا ہی کوئی رشتہ بنتا ہے ورنہ وہ ان کے بارے میں سکول سے فارغ ہونے والوں بچوں کی طرح یہ نہ کہتا ۔

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو

ویسے یہ بھی اک ادا ہے بننے کی ۔ دیکھئے بات آخر سامنے آ ہی گئی ۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

یہ شعر پڑھتے ہی ہمیشہ مجھے لکھنو کا وہ شاعر یاد آ جاتا ہے جس نے اپنے ایک مخاطب شاعر کو کہا تھا - ہندوستان میں بس دو ہی شاعر ہیں ایک آپ اور ایک میں - آپ بھی کیا ہیں - بس میں ہی میں ہوں ۔ میر نے اتنا تو کیا تھا کہ اپنے عہد کے ایک شاعر کو پورا ، ایک کو آدھا اور ایک کو آدھے کا آدھا تسلیم کر لیا تھا ۔ وہ اگر نہ کرتا تو ہم اس کا کیا کر لیتے ۔ شاید غالب نے صرف اسی ڈر سے فقط میر کا نام لیا ہے یا فارسی میں نظیری اور ظہوری اور بیدل وغیرہ کا ذکر کیا ہے چونکہ یہ سب رحلت فرما چکے تھے - ظہوری کے مقابلے

میں وہ اپنے آپ کو خفائی کہتے ہیں اس لئے کہ اس وقت وہ مشہور نہیں تھے صرف بدنام تھے -

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

یعنی

بدنام جو ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

لوگ تو مرے ہوئے دشمن کی بھی تعریف کر گزرتے ہیں - مزا تو تب تھا کہ غالب ، ذوق کی تعریف کرتا - ذوق کی نیک نیتی اور برخورداری ملاحظہ ہو - کتنی دیانت داری ہے -

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

جن لوگوں کو غالب سخنور مان رہا ہے - انھی بھلے مانسوں کو چڑانے کے لئے اس نے اپنا نام تبدیل کرکے غالب رکھ لیا تھا - بیشک وہ غالب تھا اور غالب ہی رہا (ہم کسی کا نام تو تبدیل کرنے سے رہے) - مگر یہ کوئی طریقہ ہے کہ شریف آدمیوں کا اس طرح مذاق اڑایا جائے - غالب نے ہمیشہ ایک الگ راہ اختیار کی - خود سر ، بے راہرو اور "آپ مہارا" قسم کا آدمی تھا - اپنے وقت کے معززین یعنی "شاعرین" کو خواہ مخواہ تنگ کیا - ان کے اشعار سن کر مستند شاعروں کے بھی خاک پلے نہیں پڑتا تھا - پھر یہی بات ان کی عظمت کا سبب بنی - (اللہ تعالیٰ جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلیل کر دے) - یہ تو خیر قدرت کی بات ہوئی - اب اسی بات کی آڑ لے کر آجکل کے جدید اور شدید بلکہ ھل من مزید شعرا بھی ، جن کے کلام کو سمجھنا خود ان لئے بھی جان جوکھوں کا کام ہے ، اتراتے ہیں اور ہمارے لئے "غالب" بنے ہوئے ہیں - غالب نے تو واشگاف الفاظ میں اعلان کیا تھا -

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

ان میں سخن فہمی تو نام کی نہیں البتہ طرفداری ہی طرفداری نظر آتی ہے - غالب کے اشعار سمجھ میں نہیں آتے تھے اس لئے وہ عظیم شاعر ہے - ہماری بے کافیہ اور بے کیف نظمیں بھی سمجھ میں نہیں آ سکتیں - جتنا زور چاہو لگا لو - لہذا ہیں

بھی بڑا شاعر مان لو ۔ کوئی ایک اس قسم کا غالب ہوتا تو ہم بھلا کیوں نہ مان لیتے ۔ ہمارا کیا جاتا ۔ مگر یہاں تو ہر ساتواں آدمی زن سے غالب ان بیٹھا ہے ۔ کس پر احسان چڑھائیں اور کس کس کو دشمن بنائیں ۔

ایک نقاد صاحب خلاف دستور بڑے لبرل واقع ہوئے ہیں ۔ فرمانے لگے مرزا اسداللہ خاں نوشہ غالب اور ان ریڈی میڈ غالبوں میں معمولی سا فرق ہے مثلاً جو ڑ اور ڈ میں ہوتا ہے ۔ ز اور ذ میں ہوتا ہے ۔ ک اور ق میں ہوتا ہے ۔ ا اور ع میں ہوتا ہے س اور ص میں . . . ''مگر یہ ث کا کیا بنے گا ۔''

یہ غالب یا جالب یا ان کے کسی طالب سے پوچھئے ۔ جو ط اور ت میں ہوتا ہے ۔ ض اور ظ میں ہوتا ہے ۔ اور جو چھوٹی ی اور بڑی ے میں ہوتا ہے ۔ ہم حیران و ششدر اور مبہوت کہ یہ بھی ایک اچھی بھلی جدید نظم ہوگئی ۔ اب اس کی تشریح کی ضرورت محسوس ہوئی اور جب انہوں نے خدا کا نام لے کر تشریح شروع کی تو مجھے ایک بار پھر تاریکی کے معنی مرغی والا قصہ یاد آ گیا ۔ ویسے یہ قصہ اکثر جدید نظموں کی تشریح سنتے وقت یاد آتا ہی رہتا ہے ۔ وہ مرد ملنگ صفت نقاد بھالپ گیا اور پیار سے سمجھانے لگا ۔ دیکھئے نا مطلب کہنے کا یہ ہے ۔ یعنی گویا کہ مثلاً غالب کے کلام میں فکر ہے ۔ ان کی کلام میں پریشانی ہے ۔ فن وہ بھی ہے ، فن یہ بھی ۔ فرق آپ کڈھ لے ۔

ہم نے اس پر ان کی منت سماجت کی کہ حضور فیض گنجور آپ بھی ہمارے لئے خدا نخواستہ جدید شاعر اور ''نوین'' غالب ہو بیٹھے ۔ خدا کے لئے رحم فرمائیے اور کسی مثال سے واضح کیجئے ۔ انہوں نے جلال و جمال کو چہرے پر طاری کرتے ہوئے غالب کا یہ شعر پڑھا ۔

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

مطلب واقعی کچھ نہیں ۔ غالب خط کے طور پر شعر لکھتا تھا ۔ یہ شعر کی صورت میں خط لکھتے ہیں ۔ خط بھی بے رنگ ۔ عموماً لڑکیوں کو لکھتے ہیں خود بھی لڑکی بن کر ۔ سمجھ میں کیا خاک آئے ۔ ڈرپوک کہیں کے ۔ غالب نام کا عاشق تھا یہ جسم کے ۔ وہ دیدۂ بینا رکھتا تھا اور اس نے الدھوں کو اشارے سے بتلانے کی کوشش کی تھی کہ یوں ہوتی ہے کھیر ۔ وہ بھی خاصی ٹیڑھی کھیر لگی تھی لوگوں کو ۔ یہ جدید کبوتر نما شاعر ، جنہوں نے آنکھیں

بند کر لی ہیں ۔ بلی کے ڈر سے ۔ اور چلے ہیں سمجھانے کہ ہمارے پاس کھیر ہے ۔ آؤ تم بھی کھاؤ ۔ بدھضمی ہو جانے کی صورت میں کمپنی ذمہ دار نہ ہوگی ۔ غالب نے کھیر خود پکائی تھی ۔ انہیں کہیں سے پکی پکائی ہاتھ لگ گئی ہے ۔ دور کہیں سے ڈھول بجنے کی صدا بھی آ رہی ہے ۔ گویا کوئی جتنوں سے پکائی ہوئی کھیر اٹھا کر لے گیا ہے ---- بس اور صرف یہی فرق ہے ۔ سمجھے ۔

بات غالب سے اقبال کے متاثر ہونے کی تھی اور جا پہنچی ان زبردستی کے متاثرین تک ۔ کوئی متاثر ہو نہ ہو یہ ضرور متاثر ہیں کیونکہ ان کا کلام سمجھ میں نہ آتا ہے اور نہ کبھی آ سکے گا ۔ انشاءاللہ تعالیٰ ۔ پھر ان پیدائشی باغیوں نے آزاد نظموں میں بھی غالب کی ترکیبیں ، تشبیہیں ، استعارے اور دوسری چیزیں استعمال کرنا شروع کر دیں ۔ غالب کو جدیدیت کا امام (اسے بغیر اطلاع اور نوٹس دیئے) بنا لیا اور خود اس کے پیچھے بغیر وضو کے غائبانہ نماز کی نیت کرلی حالانکہ ان میں سے اکثر کو نماز نہیں آتی ۔ اس کا یہ فائدہ ضرور ہے کہ بفرض محال ان کی دعا قبول ہوئی اور یہ کبھی مقبول و مشہور یا بدنام ہوگئے تو کریڈٹ غالب کو جائے گا ۔ قبول عام کے سوتے تو اسی سرچشمے سے پھوٹے ہیں نا ۔

اسی طرح اقبال کی عام مقبولیت بھی غالب کی مرہون منت ہوگی ۔ وہ کسی نہ کسی طرح غالب سے ضرور متاثر ہوگا ۔ مگر ابھی تک یقین نہ آتا تھا جس طرح اوروں نے اور غالب نے خود اعتراف کیا ۔ اقبال کو بھی کم از کم کہیں نہ کہیں تو اظہار کرنا چاہئے تھا ۔ مرزا غالب کی تعریف میں اس قسم کے چند تعریفی اشعار لکھ کر انہوں نے غالب کے آنسو پونچھنے کی کوشش کی ہے ۔

فکر انساں پہ تیری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پر مرغ تخیل کی رسائی تا کجا
تھا سراپا روح تو بزم سخن پیکر ترا
زیب محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا

اس قسم کے شعر تو علامہ صاحب نے نطشے ، گوئٹے ، ہیگل ، مارکس ، ورڈزورتھ ، داغ اور کئی دوسرے بزرگوں کی تعریف میں لکھے ہیں ۔ غالب کا نام "کئی دوسرے" کی فہرست میں آتا ہے ۔

لیکن اس دن ماننے ہی بنی جب ایم - اے اردو کی کلاس میں ایک پروفیسر صاحب نے پوچھا - یہ کس کا شعر ہے ؟

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقان کا

ایک شاگرد سعید یعنی ''کاہل'' طالب علم نے جواب دیا - سر اقبال کا - انہوں نے شاباش دیتے ہوئے مزید پوچھا - اس کے ثبوت میں کوئی اور شعر - جواب ملا -

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

جب ساری جماعت اس طالبعلم کی سعادت مندی اور ''کاہلیت'' سے متاثر ہو چکی تو پتہ چلا کہ ایک شعر تو مرزا غالب کا ہے - اب ہم نے سوچا کہ ہو نہ ہو یہ غالب سے متاثر ہونے والی ہی بات نہ ہو - ویسے اس قسم کے متاثر ہونے والوں کی فہرست بھی خاصی وسیع و عریض ہے - یہ بھی اک پہلو ہے قبول عام کی تصویر کا - غالب کے اشعار کئی گمنام شاعروں کی خوش قسمتی کا سبب بنے اور کئی برائے نام اشعار غالب سے منسوب ہو کر خوش قسمت کہلائے - مثلاً یہ شعر بڑی صفائی سے سراج الدین بہادر شاہ ظفر کے سر باندھ دیا گیا -

پہلے آتی تھی حال دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

اور یہ شعر جو غالب نے کبھی بھول کر بھی نہیں کہا ہوگا اپنی پیشانی پر غالب کا نام چپکا کر چار دانگ عالم میں عام ہوا -

تنگ، دستی اگر نہ ہو غالب
تندرستی ہزار نعمت ہے

اب ہم بھی کئی دوسرے سر پھروں کی طرح اس ٹوہ میں لگ گئے کہ اقبال پر غالب کے گہرے اثرات ڈھونڈھ نکالیں تو یہ معرکہ ہو - اور یہ چوٹی سر ہو ہی گئی -

غالب اور اقبال دونوں جھگڑالو تھے - اقبال خدا سے لڑتا جھگڑتا رہتا تھا -

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک

روز حساب پیش ہو جب مرا دفتر عمل
آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہر جائی ہے

اور غالب اپنے محبوب سے لڑتا بھڑتا رہتا ہے ۔

ہم سے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذر مستی ایک دن
دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا
ہم ھی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

یار سے چھیڑ چلی جائے اسد
گر نہیں وصل تو حسرت ھی سہی

کہتے ھیں شعر کے مجازی اور حقیقی معنی ہوتے ھیں ۔ اور ہر شعر میں شاعر کے دو دو محبوب ہوتے ھیں ۔ ایک انسان اور دوسرا اللہ تعالی ۔ غالب کے بارے میں ایک رائے یہ بھی ہے کہ پہنچا ہوا ولی تھا ۔ بس تھوڑی سی پی لیتا تھا ۔ معرفت اور حالت مجذوبی اور یک گونہ بےخودی کے لئے یہ بالکل جائز ہے ۔

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

کوئی سمجھے نہ سمجھے ۔ ہم نے فوراً مان لیا ۔ اس طرح ثابت ہوگیا کہ غالب کا محبوب خدا ہے ۔ مگر یہ خدا سے بوقت مے پرستی بے تکلف ہونے سے کیا مراد ہے ۔ جنت میں ہو سکتا ہے ممکن ہو ۔ یہ دنیا میں دھول دھپا اور چھیڑ چھاڑ اور وہ بھی خدا سے ۔ استغفراللہ تعالی ۔ ہم نے بڑا تیر مارا تھا کہ چلو ایک نیک کام تو ہوا ۔ تحقیق تو بڑی چونکا دینے والی تھی مگر خدا کی مرضی ! ھار ہم نے بھی نہیں مانی اور لڑنا بھڑنا اور جھگڑنا دونوں شاعروں میں قدر مشترک جان کر فیصلہ کر لیا کہ اقبال غالب سے سو فیصد نہیں تو ۹۹ فیصد تو بہر حال متاثر ہے ۔

رھی سہی کسر فیض احمد فیض نے پوری کر دی جو آج کے دور کے مقبول ترین شاعر مانے جاتے ھیں - فیض صاحب نے اقبال اور غالب دونوں سے فیض حاصل کیا ھے - ان دونوں میں لازماً کوئی ایک قدر مشترک ھوگی اور وھی ایک اقبال نے غالب سے وصول کی ھوگی جو بعد میں فیض نے ھتھیا لی -

اقبال اور فیض دونوں امید کے شاعر ھیں - پہلے نا امیدی کے سمندر میں ڈبکیاں کھلاتے ھیں پھر خود ھی کشتی بھیج دیتے ھیں فیض صاحب والی کشتی خود ڈبکیاں کھاتی ڈولتی ڈگمگاتی رھتی ھے - اقبال کی کشتی میں بیٹھے ھوئے لوگ یونہی ڈبکیاں کھانے اور جھومتے جھامتے رھتے ھیں مثلاً

اقبال : کہ خون صد ہزار انجم سے ھوتی ھے سحر پیدا -

فیض : سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گبھرائے -

مگر یہ کیا کہ ھمیں "کئی" عثمالیوں پر کوہ غم ٹوٹنے کا واقعی کوئی غم نہیں ھوتا - اور زنداں پہ ھوا کی ھلکی سی دستک سے ھم خاصے گھبرا جاتے ھیں -

فیض غالب سے یوں متاثر ھے کہ اس نے اپنی ایک کتاب کا نام "نقش فریادی" رکھا ھے - اور یہ دیوان غالب کی پہلی غزل کے پہلے شعر کے پہلے مصرعے کا پہلا لفظ ھے -

نقش فریادی ھے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ھے پیرہن ھر پیکر تصویر کا

دوسری کتاب کا نام "دست تہ سنگ" ہے - یہ غزل نمبر ۲۰۳ کے شعر نمبر ۹ کے مصرعہ نمبر ۲ کا لفظ نمبر ۱ ھے -

مجبوری و دعویٔ گرفتاریٔ الفت
دست تہ سنگ آمدہ پیمان وفا ہے

غالب کے کلام میں کتابوں اور مجموعوں کے نام اور مضمونوں اور نظموں کے عنوان بکثرت موجود ھیں - شاعر اور ادیب اس سے ابھی فائدہ اٹھارھے ھیں - کنھیا لعل کپور نے اپنی غالباً پہلی کتاب کا نام سنگ و خشت رکھا ھے -

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

کپور صاحب نے کتابوں کے ناموں کے سلسلے میں ایک فارمولہ تیار کیا تھا کہ غالب کے دیوان میں ایسے مصرعے اور شعر موجود ہیں کہ پورے کے پورے یا آدھے کے آدھے بطور نام اور عنوان استعمال ہو سکتے ہیں۔ یہ بات بھی غالب کو قبولنے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

غالب اور فیض ایک ہی سوچ کے مارے لگتے ہیں۔

غالب : غم عشق اگر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

فیض : تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روز گار کے

یہ فرق تو نہ ہوا۔ فیض غم روز گار کو زیادہ دلفریب سمجھتے ہیں۔ غالب غم عشق کو اولیت دے رہے ہیں۔ پسند اپنی اپنی خیال اپنا اپنا۔

فیض : چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے۔

غالب : بلبل کے کاروبار پہ ہے خندہ ہائے گل۔

گلشن اور بلبل کے کاروبار میں بھلا کیا فرق ہو سکتا ہے۔ ویسے اب یہ کاروبار خاصا چل نکلا ہے۔ باغ جناح اور شالامار کے ساتھ ساتھ اس کاروبار کو فروغ دینے کے لئے ریڈیو، ٹیلی‌ویژن اور فلم انڈسٹری اور دوسرے اسی قسم کے ادارے بہت اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ انفرادی طور پر گانے والوں اور والیوں کی نظر کرم کی ضرورت بھی ہے۔ یہ بات عام ہے کہ فیض کی مقبولیت مہدی حسن اور نور جہاں کی مرہون منت ہے۔ واللہ عالم بالصواب۔ فیض کے بارے میں لوگوں نے بڑی فیاضی سے کام لیا ہے۔ فیض کا قبول عام ملاحظہ ہو۔ لوگ گلی کوچوں میں گاتے پھرتے ہیں۔

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

اطلاعاً عرض ہے کہ یہ ایک فلم کا گانا بھی ہے۔ "محبت کا جنازہ جا رہا ہے" کبھی یہ گانا گایا جاتا تھا اب لوگوں نے فیض کو کندھوں پر اٹھا لیا ہے۔ ویسے بھی خدا لگتی بات ہے آخر پہلی محبت ہی کیوں۔ کیوں نہ دوسری، تیسری، پانچویں، بیسویں، سالھویں علیٰ ہذالقیاس آخری محبت سہی۔ یہ اتنی

ساری محبتیں کوئی اچار ڈالنے کے لئے تو نہیں کی تھیں - مگر سنا ہے پہلی محبت . . . . . . -

غالب کے قبول عام کا آغاز بھی اسی عشق و محبت سے ہوا ہے -

عشق پر زور نہیں . . . (یہ عصمت چغتائی کے ایک افسانے کا نام بھی ہے) عشق کی ہوا ان دنوں کچھ ایسی چلی ہے کہ کسی کے بس کی بات نہیں کہ اسے روکے - عشق پر واقعی زور نہیں - جمعدارنی ، نوکرانی ، لولی ، لنگڑی ، کانی حتیٰ کہ حسین و جمیل سے بھی ہو سکتا ہے - عورتوں کا عشق اس سے بھی "زور آور" ہوتا ہے - عشق نہ دیکھے ذات - عاشق نام کی کوئی ذات نہیں - یہ ٹھیک ہے مگر اب تو یہ ایک بہت بڑا قبیلہ ہے - بلکہ پوری قوم ہے جو ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے - اس قوم کے لوگ واقعی اتنے سرکش ہیں کہ ان پر کسی کا کوئی زور نہیں چلتا - غالب نے بھی ایک ستم کش ڈومنی سے عشق فرمایا تھا - آج اکثر لوگ خاندانی قرابتوں اور باہمی دوستیوں کا منہ چڑا کر کسی خواب و خیال میں نہ آنے والی ڈومنی المعروف بہ میراثن سے بڑے دھڑلے سے عشق رچاتے ہیں جھومتے ہیں گنگناتے ہیں اور بزرگ سن کر بڑبڑاتے ہیں -

عشق پر زور نہیں . . . . .

آپ نے کبھی عشق کیا ہے - ضرور کیا ہوگا - بےعشق بھلا کون جی سکتا ہے - آپ کو اپنی شہ دماغی پر ناز بھی ہوگا - ہمیں قطعاً کوئی شک نہیں مگر ایک وقت آئے گا کہ آپ خود اپنی ان دلفریب حرکتوں کو یاد کرکے زیر لب تبسم کریں گے - جس طرح لوگ آج آپکو دیکھ کر بالائے لب تبسم کرتے ہیں -

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

عشق پہلے جذبہ تھا - ہم اس جذبے کی دل کی گہرائیوں سے قدر کرتے ہیں مگر اب یہ فیشن ہے ، رسم ہے ، سوشل ایکٹیوٹی ہے ، مشغلہ ہے ، دل بہلاوہ ہے - اور یہ مرض یوں عام ہوا ہے کہ

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی

وہ شادی ہی کیا ہے جو عشق سے آلودہ نہیں - عشق شادی سے پہلے ایک چنگی بھلی شادی ہے - اب تو عشق بغیر ساری عمر کنوارے ہی مرنے کا شدید

خطرہ ہوتا ہے۔ شادی سے پہلے عشق شریف اتنا ہی ضروری ہے جتنا نماز سے پہلے وضو۔ لیکن اس قسم کے بیشتر خواتین و حضرات ''شادی شدہ کنوارے'' ہی رہتے ہیں۔ کیونکہ ان کا وہی حشر ہوتا ہے جو نماز کے دوران وضو ٹوٹ جانے کی صورت میں ہوتا ہے۔ پھر کبھی زندگی کی نماز مکمل نہیں ہو پاتی ۔ بے چارے کسی کام کے نہیں رہتے۔ اتنے نکمے کہ دوسرے عشق کے قابل بھی نہیں۔

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

ہم اور تم کس شمار میں ہیں۔ عشق نے تو بڑے بڑوں کو بے سرو سامان کر دیا۔ بے آبرو ، بیکار اور بے ''کار'' کر دیا۔ اور بھی بہت سی چیزیں نکما بنا دیتی ہیں۔ کئی لوگ یونہی نکمے ہوتے ہیں پڑھ لکھ کر بھی نکمے ہی رہتے ہیں۔ ایم اے کرنے کے بعد بھی کام نہیں ملتا۔ عشق کے بعد ہم تو یہی کہیں گے۔ علم نے غالب نکما کر دیا۔

غالب کو برا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے ۔

ہمارے ہاں ہر آدمی زیادہ سے زیادہ لوگوں کو برا کہتا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ وہ ہرگز اچھا نہیں کرتا۔ یہ مصرعہ کئی مرتبہ اس طرح سنا گیا۔ خالد کو برا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے کشور کو ، رضوی کو ، صابی کو ، مسری کو اجمل کو اور وغیرہ وغیرہ کو برا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے۔ (. . .) کو برا کہتے ہو اچھا کرتے ہو۔ ساری دنیا میں کوئی اچھے تو نہیں بستے۔ کئی مطلب پرست ، موقعہ شناس ، پاجی اور ظالم بھی تو ہیں۔ کئی گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہیں۔ شادی سے پہلے اچھے اور شادی کے بعد دوسری شادی کے لئے تیار۔ الیکشن سے پہلے جھک کر سلام اور بالکل بے غرض اور الیکشن کے بعد دور سے سلام اور پرلے درجے کے خود غرض۔ اسی طرح موت سے پہلے کچھ اور اور موت کے بعد نقشہ ہی تبدیل۔ لیکن اس کے ساتھ

ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

اب تھوڑا سا رد و بدل کرنا ہوگا۔ ہونے لگ گئی ہے کہ بروں کو اچھا کہتے ہیں۔ بات ایک ہی ہے۔ اسی اثنا میں کسی کو لاج آ جائے اور وہ چلا اٹھے

غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

دیکھئے نا یہ واقعی اچھا نہیں لگتا - ایک تو ہم مشرب ، ہم پیشہ اور ہمراز ہوا پھر اس پر مزید ہم کالج ، ہم جماعت ، ہمخیال ، ہمزبان ، ہمدم ، ہمدرد اور ہم . . . .) ہے - آپ کچھ تو خیال کریں - اس سے غرض نہیں کہ ہمارے پیچھے آپ اس کا کیا حال کرتے ہوں گے کم از کم ہمارے آگے تو اس کا یہ رلگ نہ کریں - گرچہ

مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

اور لیلیٰ کو برا کہتا ہے مجنوں مرے آگے- (دونوں نئے) سسی کو پنوں ، پنوں کو سسی خاوند کو بیوی ، بیوی کو خاوند - - دونوں ایک دوسرے کو - - - اور

اجمل کو برا کہتے ہیں سارے مرے آگے

ہم بالکل برا نہیں مناتے کیونکہ -

ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

ایک آدمی تو ہے جو مجھے اچھا کہتا ہے اور وہ خود ایسا ہے کہ اسے سب اچھا کہتے ہیں - نجانے کون ہے یہ مجھے بھی معلوم نہیں -

تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے -

اس کیلئے غالب نے مصوری سیکھی تھی- اب لوگ موسیقی ، شاعری ، کشتی رانی اور ڈرائیونگ سیکھتے ہیں - اس کام کے لئے اداکاری بھی بہت مفید ہے - ویسے پکنک ، پکچر اور پیار اور دوسرے تمام پ سے شروع ہونے والے کام جائز ہیں - ملاقات کا پہلا لفظ م ہے - موت سب سے بہترین طریقہ ہے ابدی ملاقات - جیسا کہ سوہنی اور سسی وغیرہ نے کیا - اگر یہ نہ ہو تو مذاق بھی بہتر ہے - اس چھیڑ چھاڑ میں ڈھول ڈھپا ہو جائے تو مت گھبرائیں اور صدق دل سے کوشش جاری رکھیں - اب ملاقات کے لئے تقریب بھی ضروری ہوگئی ہے - کسی ہوٹل میں خوشامد پارٹی ، کوئی جلسہ ، خود ساختہ سالگرہ وغیرہ - یہ جتنے کام بھی ہیں پہلے مصرعے کے طور پر اپنے آپ استعمال ہو جاتے ہیں اور

تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے

ہم اکثر سنتے ہیں ۔ کسی حرکت پر ناراض یا خوش ہو کر کہا جاتا ہے شرم تم کو مگر نہیں آتی ۔ یہ اس موصوف کا کمال نہیں غالب کا مصرعہ ہے ۔ اتنا عام ہوا کہ بس عام ہو گیا ۔ یہ مصرعہ دراصل یوں ہونا چاہئے تھا شرم ہم کو مگر نہیں آتی ۔ یہاں واقعی کسی کو بھی کسی کام میں بالکل شرم نہیں آتی ۔ مگر خود کتنے ہی بےشرم ہوں ۔ اپنے آپ کو کبھی شرم نہیں دلائیں گے ۔ ہمیشہ دوسروں کو احساس دلاتے رہیں گے ۔ شرم تم کو مگر نہیں آتی ۔ اور یہ مصرعہ آپ بڑی آسانی سے تقریباً ہر ایک کو کہہ سکتے ہیں ۔ عام اصول یہ ہے ۔ عزت آنی جانی چیز ہے بندے کو ڈھیٹ ہونا چاہئے ۔ ایک شرم عورتوں کے لئے مخصوص ہوتی ہے ۔ اب عورت عورت ہی نہیں رہی تو شرم کس کو آئے ۔ غالب کو بھی دیکھئے ۔ کعبہ جاتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی تھی اور یہ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ کعبہ سے ہو آنے کے بعد بھی شرم نہیں آتی ۔

رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایک دن

ادھار کی شراب پینے والوں کے لئے یہ مصرعہ شراب کے سرور سے کم نہیں ۔ غالب کی امید اب چشم دید ہوتی جا رہی ہے ۔ اب عذر مستی کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی ۔ اور بوفت سے پرستی بلکہ کوکا کولا پرستی حتی کہ خالی حسن پرستی سے بھی لوگ خاصے کھل جاتے ہیں ۔ عذر مستی کی بجائے اگر بد مستی ہو جائے تو سہانے پر سہاگہ ۔ پھر آپ ضرور پیش دستی کریں ۔ زبردستی کریں اور دست بدستی کے لئے بھی تیار رہیں ۔ فاقہ مستی تب جا کر رنگ لائیگی اور ہر چیز سستی ہو جائے گی ۔ لیکن مسرت پھر بھی عام نہ ہوگی اور غم کبھی نہ ختم ہو سکے گا ۔ خیر کسی کو نغمہ ہائے غم غنیمت کسی کو قہقہہ ہائے مسرت مبارک ۔

بے صدا ہو جائے گا یہ ساز ہستی ایک دن

اس حال میں جب کوئی یار کے کوچے کی طرف کوچ کرے کوچے سے مراد دفتر ، کالج ، گھر ، سینما ، کار ، فٹ پاتھ اور ہر وہ مقام اور مکان جہاں مندرجہ ذیل واقعات پیش آئیں ۔ وہاں پہلے تو کتے پیچھے لگ جائیں ۔ پھر گالیاں نکلیں لیکن ع گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا ۔ اس کے بعد جوتیاں کھا کے بھی بے مزا نہ ہوا ۔ بے مزا نہ ہو سکا تو بے آبرو کیونکر ہو گیا ۔ یہ آبرو قسم کی

چیزیں اب (out dated) اور متروک ہو گئی ہیں - نہ ہوا تو غالب کا یہ مصرعہ متروک نہ ہوا - پھر اور پھر اور پھر بار بار اور بار اس کوچے میں تشریف لے جاتے ہیں وقت ایک چکر لگاتا ہے - تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے - کتے ، گالیاں اور جوتیاں - نہ بے مزا ہوئے نہ بے آبرو - غالب کا یہ مصرعہ پڑھتے ہوئے واپس آ گئے -

بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

میں نے جب سے پڑھنا شروع کیا ہے - (چلی والا قاعدہ نہیں) - کئی آدمی انتقال فرما گئے - مختلف رنگ و بو کے لوگ ، بھانت بھانت کے ، طرح طرح کے اور قسم قسم کے آدمی اور انسان اور اشخاص اور لوگ مر گئے - ان کے بارے میں جو تحریر لکھی گئی ، تقریر کی گئی اس میں ایک بات ضرور نظر آئی اور وہ ہے

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

کیا جامع مصرعہ ہے - مغفرت کی دعا بھی اور مرحوم کی تعریف بھی - عجب ، آزاد اور مرد - حق مغفرت کرے - نہ فاتحہ نہ درود - اللہ اللہ باقی خیر سلیٰ - تعزیت بھی ہوگئی اور ذوق کی دھاک بھی بیٹھ گئی -

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو -

یہ مصرعہ ہر دوست کے بارے میں بڑی بے تکلفی سے استعمال کیا جاتا ہے - فرحت اللہ بیگ کا مضمون مجھے مرے دوستوں سے بچاؤ ، کپور صاحب کا رہئیے اب ایسی جگہ چل کر . . . . وضاحت کے لئے کافی ہیں -

یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہوگئیں -

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا -

ان دونوں میں آپ درباں اور مصاحب کا آسان زبان میں ترجمہ کر لیں ان مصرعوں کا زباں زد عام ہونا سامنے آ جائے گا - چپڑاسی اور دوسرا چمچہ - ان دونوں چیزوں سے آپ کو واسطہ پڑا ہوگا -

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا صرف مٹی کا پیالہ نہیں اور بھی جو برتن ٹوٹ جائے - اس کے علاوہ

لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

آنکھ ، بازو ، ٹانگیں ، دل ، جگر اور گردے بلکہ پورے کا پورا جسم بھی بڑے سستے داموں خرید سکتے ہیں - یہ مصرعہ پڑھ کر سستے چھوٹ سکتے ہیں - صرف ''ان'' کا شہر میں ہونا ضروری ہے -

آپ کسی کے گھر جائیں - آپ کی حالت زار دیدنی ہو - گرتے پڑتے ، اٹھتے بیٹھتے ، الجھے ہوئے بال ، بھٹکی ہوئی چال ، جاتے ہی اس محل نما کوٹھی کو دیکھ کر حیران ہو جائیں پھر پریشان ہو جائیں اور صاحب خانہ مسکرا کر کہے

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے

یہ سن کر کیا آپ کو غالب کے گھر گھر چرچے ہونے پر یقین نہیں آ جائے گا - اور آپ بے اختیار چیخ نہیں اٹھیں گے -

کبھی ہم خود کو کبھی آپ کے گھر کو دیکھتے ہیں

آجکل گلیوں ، سڑکوں اور چوراہوں میں بیٹھنے کا رواج پڑ گیا ہے - دھرنا مار کے بیٹھنے کو ترجیح دی جا رہی ہے - کوئی اعتراض کرے تو

بیٹھے ہیں رہگذر پہ ہم، کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

عورتیں خود پر اپنے ایک ہی خاص اعتراض کی صورت میں یہ کہہ دیتی ہیں -

روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

جب میک اپ میں دو گھنٹے کی بجائے چار گھنٹے لگ جائیں

تو اور آرائش خم و کاکل

اس دوران میں آپ بور ہو جائیں اور آپ یقیناً ہو جائیں گے

میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

کئی خوبصورت آدمیوں کو دیکھ کر

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں -

اس کے علاوہ آپ مندرجہ ذیل مصرعے اور اس کے علاوہ بھی بہت سے مصرعے غالباً آدھا دیوان کسی نہ کسی مقام پر کسی نہ کسی طرح استعمال کرتے ہیں، کر سکتے ہیں اور کرتے رہیں گے - کم از کم سنتے تو ضرور ہیں اور اگر غالب کا قبول عام یونہی رہا تو پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سنتے رہنا پڑے گا - آپ خود

سیانے ھیں۔ میں ھر شعر کا فرداً فرداً (جوڑ لکال کر) قبول عام تو نہیں بتا سکتا۔ آپ خود شعر کی ماھیت ، اپنی ضرورت اور صورتحال کی لزاکت کو دیکھ کر کوئی سا مصرعہ جا دیں - آگے اللہ مالک ھے ۔ ویسے عام مشق کے لئے کچھ مصرعے بتا دیئے گئے ھیں ۔ یہ زبانی یاد کر لیں ۔ کام چلتا رھے گا ۔

ھم کہاں قسمت آزمانے جائیں -
ھائے اس زود پشیماں کا پشیماں ھونا -
کچھ تو ھے جس کی پردہ داری ھے -
یہ نہ تھی ھماری قسمت کہ وصال یار ھوتا -
کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی -
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ھو -
بک رھا ھوں جنوں میں کیا کیا کچھ ۔
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ھوگئیں -
خاک ھو جائیں گے ھم تجھ کو خبر ھونے تک -
جو تیری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا -

وغیرہ وغیرہ - اور - شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے -
اس کے قبول عام کے لئے ھم بذات خود بنفس لفیس زندہ ثبوت ھیں -

اسی طرح غالب کا کلام روزمرہ زندگی میں بکھرا نظر آتا ھے - زندگی کی روح میں سرایت کر گیا ہے - غالب کا غلبہ ھمارے احساس ، ذوق ، جذبے ، سوچ، تہذیب، ثقافت ، اور معاشرت پر ھے - اس کا کلام محاورہ ، روزمرہ ، ضرب الامثال اور عام گفتگو بن چکا ہے -

یوں بھی غالب اور عام لوگوں میں کافی یگانگت ، یکسالیت اور یک جالیت ھے - غالب کی طرح آج بھی عام لوگ غریب ھیں مقروض اور مصروف ۔ فاقہ مستی مے پرستی ، حسن پرستی ، پیش دستی اور عذر مستی تمام میں قدر مشترک ۔ یعنی ایک ھی ساز ھستی کے مختلف راگ۔گویا غالب اپنا ھی بھائی بند - لشہ کرنا، جوا کھیلنا، پتنگ لڑانا ، جیل جانا ،کوٹھے پر جانا، شعر کہنا، خط لکھنا ، عشق کرنا، اور خاصا ٹھاٹھ دار عشق کرنا کئی دوسری اور تقریباً ساری عادتیں ایک جیسی - پھر کیوں نہ وہ ھماری بات کرے ۔ اور ھم اس کے شعر اور مصرعے سنتے اور سناتے ، گاتے اور گنگناتے اور منطبق کرتے اور کراتے پھریں۔ ھم تو چلتے پھرتے غالب کے مصرعے ھیں -

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے

زمین غزل

نئے پھول

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہوگئیں

کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

★

اسداللہ خاں غالب

(میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی مرے دل میں ہے)

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

حسرت نے لا رکھا تری بزم خیال میں
گلدستۂ نگاہ سویدا کہیں جسے

پھونکا ہے کس نے گوش محبت میں اے خدا
افسون انتظار، تمنا کہیں جسے

سر پر ھجوم درد غریبی سے ڈالئے
وہ ایک مشت خاک کہ صحرا کہیں جسے

ہے چشم تر میں حسرت دیدار سے نہاں
شوق عناں گسیختہ دریا کہیں جسے

درکار ہے شگفتن گلہائے عیش کو
صبح بہار پنبۂ مینا کہیں جسے

غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

★

احسان دانش

(نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا)

صبح نے لوٹا اثاثہ شمع کی تنویر کا
ذائقہ کتنا ہے تلخ اس خواب کی تعبیر کا

مسکراتی چاندنی تھی بارش رنگ جنوں
چاند کا ہالہ تھا یہ حلقہ میری زنجیر کا

ہو رہے ہیں مجھ سے باغی دست و پا عزم و خیال
تم نے اچھا وقت رکھا ہے میری تقریر کا

مصر کے بازار کی زینت بڑھانا تھی اسے
چشم یوسف سے چھپایا آئینہ تقدیر کا

جب پریشانی کی رت آئی تو آنکھیں کھل گئیں
تھا ستاروں سے بھی رشتہ ہاتھ کی تحریر کا

برق کے تیشے نے کاٹے ہیں گھٹاؤں کے پہاڑ
کس سے رکتا راستہ سورج کی جوئے شیر کا

صرف لفظوں کی کھنک کانوں میں رس بھرتی رہی
جب کھلے معنی اجالا بجھ گیا تحریر کا!

رقص کرتی آئیں گی سورج کی کرلیں کوہ پر
برگ سے اعلان ہوگا برق کی تاثیر کا!

وقت نے باندھا عجب خوابِ زبیدہ کا طلسم
کس طرح زینہ اتارا خواب سے تعبیر کا!

پشت کی دیوار پر پھیلی ہے زنجیروں کی بیل
کربلا کا خون خاکہ بن گیا تقدیر کا

ریت کے قالب میں ڈھالیں زندگی کی قوتیں
ذہن میں کس کے یہ نقشہ تھا مری تعمیر کا

کاش جا کر ختم ہو اس آستاں پر زندگی
اس گلی کی خاک کر جاتی ہے کام اکسیر کا

کون کافر ہے جو تیرے فن سے منکر ہے مگر
آئے دن مفہوم کیوں بدلے تیری تحریر کا

جب کہ میں اپنے مصور کا ہوں شہکار قلم
میرے آئینے پہ دھبہ آئے کیوں تقدیر کا

رہ گئی صرف، اس یقیں سے مفلسی کی آبرو
خود ہی مل جائیگا جو ہوگا میری تقدیر کا

شام سے تا صبح آنکھوں میں گزر جاتی ہے رات
سلسلہ ہے اک خیال و خواب کی زنجیر کا

دانش آئینے میں بچپن ہے نہ وہ دورِ شباب
توبہ توبہ یہ بھی اک رخ تھا میری تصویر کا

★

احمد ندیم قاسمی

(گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر)

ھنسی آتی ھے مجھ کو امتیازِ دشت و گلشن پر
گھٹا کعبے سے اٹھتی ہے ، برستی ھے برھمن پر

خمار خانہ ویرانی میں یوں محسوس ھوتا ہے
کہ جیسے بجلیوں نے رنگ چھڑکے ھیں نشیمن پر

چلو ، دشت طلب میں ایک انساں تو نظر آیا
جو وہ مانے تو اپنی جان رکھ دوں دست رھزن پر

جفائے دوست کی مجھ سے شکایت ھو تو کیونکر ھو
وہ دیوانہ ھوں ، جس کو پیار آ جاتا ھے دشمن پر

شمیم گل تو رنگ گل کے بس میں بھی نہیں رھتی
خزاں کیوں ھاتھ پھیلاتی رھی دیوار گلشن پر

قفس کی تیرگی کچھ کم نہ تھی ھول آفرینی کو
کرن کے روپ میں تلوار رکھ دی کس نے روزن پر

خدا کے سامنے کس منہ سے جائیں گے، خدا جانے
محبت کا کوئی دھبہ نہیں ھے جن کے دامن پر

عناصر سے نمٹ کر، کیا بتاؤں ، کس سے نمٹے گا
ندیم اب آدمی کے ھاتھ میں خود اپنی گردن پر

★

ناصر کاظمی

(ہنوز تیرے تصور میں ہیں نشیب و فراز)

بسا ہوا ہے خیالوں میں کوئی پیکر ناز
بلا رہی ہے ابھی تک وہ دلنشیں آواز

وہی دنوں میں تپش ہے وہی شبوں میں گداز
مگر یہ کیا کہ مری زندگی میں سوز نہ ساز

یہ اور بات کہ دنیا نہ سن سکی لیکن
سکوت اہل نظر ہے بجائے خود آواز

یہ بے سبب نہیں شام و سحر کے ہنگامے
اٹھا رہا ہے کوئی پردہ ہائے ناز و نیاز

شراب و شعر کی دنیا بدل گئی لیکن
وہ آنکھ ڈھونڈ ہی لیتی ہے بیخودی کا جواز

بس اب تو ایک ہی دھن ہے کہ نیند آ جائے
وہ دل کہاں کہ اٹھائیں شب فراق کے ناز

عروج پر ہے مرا درد ان دنوں ناصر
مری غزل میں دھڑکتی ہے وقت کی آواز

✶

ہوم نظر

(چاہئے اچھوں کو جتنا چاہئے)

ہو سکے تو دل کی دنیا چاہئے چاہنے کو ورنہ کیا کیا چاہئے

کل تلک تھا ناز ذوق حسن پر آج اُس کا حشر دیکھا چاہئے

اُن سے ملنے پر عجب عالم رہا اُن سے ملنے پر نہ رہنا چاہئے

آشناؤں کے تعلق سے کھلا ناشناساؤں کو سمجھا چاہئے

کون ان ناکامیوں سے کہہ سکے سانس بھی تو لینے دینا چاہئے

ایک ہنگامہ سہی صحن چمن آتش گل کو بھڑکنا چاہئے

بس ہجوم یاس مٹنے دے مجھے ایک شعلہ اب خوشی کا چاہئے

آ بھی جا اے مرگ نازک وقت ہے نامرادی کو سہارا چاہئے

کیا زمانہ تھا کہ کہتے تھے نظر
زندگی سے پیار کرنا چاہئے

*

ڈاکٹر وزیر آغا

(آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے)

رات آکے سیپ سے جب درد رہا ہوتا ہے
صبح تک سینکڑوں پلکوں پہ سجا ہوتا ہے

زخم دروازہ نہیں ہے کہ مقفل کر لیں
زخم ہر حال میں آغوش کشا ہوتا ہے

گرد اُڑتی ہے تو اٹ جاتے ہیں اشجار تمام
اوس گرتی ہے تو اک حشر بپا ہوتا ہے

کم نہیں کرب کی لہروں کا تناؤ لیکن
چاند نکلے تو یہ طوفان سوا ہوتا ہے

روگ پھر روگ ہے پتھر کو بھی لگ سکتا ہے
درد ، دل میں کبھی تیرے بھی بتا، ہوتا ہے؟

سجاد باقر رضوی

(اے مرگ نا گہاں تجھے کیا انتظار ہے)

دل دشت ہے وفور تمنا غبار ہے
اے ابر نو امید ترا انتظار ہے

پھر استوار رابطۂ سنگ و سر ہوا
پھر ان دنوں جنوں کو ہوا سازگار ہے

جاں دادگی کی رسم جگاؤ کہ آجکل
پھر ملتفت ہوائے سر رہ گذار ہے

یہ نکہت خیال اسیر ہوا ہوئی
ہر موج نور کم نگہی کی شکار ہے

روشن ضمیر تیرہ نصیبی خدا کی شان
اتنی سی اب حکایت لیل و نہار ہے

ہاں اے ہوائے دشت ادھر شہر میں بھی آ
محبوس کب سے نکہت گیسوئے یار ہے

کہئے تو کسطرح جو نہ کہئے تو کسطرح
عرض سخن میں لفظ بھی بے اعتبار ہے

لب بستہ دل کشادہ چمن میں گذاریئے
یہ غنچگی کی رسم گلوں کا شعار ہے

باقر غزل میں رمز و کنایہ بجا مگر
یہ احتیاط حرف تمنا پہ بار ہے

*

سید افسر رضوی

(عزم سیر نجف و طوف حرم ہے ہم کو)

راز سا راز کوئی ملک عدم ہے ہم کو
رہبر راہ ترا نقش قدم ہے ہم کو

گرچہ گھیرے ہوئے اک لشکر غم ہے ہم کو
ہمت جان وفادار علم ہے ہم کو

افسر و کرسی و اورنگ شہی چھوڑ چکے
حاصل عمر یہی لوح و قلم ہے ہم کو

چاند تسخیر ہوا ، اختر و انجم کانپے
منزل عرش بھی دو چار قدم ہے ہم کو

عرش کے پار حرم ایک بنائیں گے نیا
قسم تفرقۂ دیر و حرم ہے ہم کو

موت جینے ہی کے معنی میں ہے اپنے نزدیک
موت بے موت کی اک پہلوئے دم ہے ہم کو

تیرے مرنے کا نہیں غم کہ مجھے مرنا تھا
سوئے عرش ہاتھ اٹھانے کا الم ہے ہم کو

جان دینا شب فرقت تو بڑی بات نہیں
وعدۂ یار کے ایفا کا بھرم ہے ہم کو

موت سے ہار کے کہتے ہیں، خدا کیوں نہ ہوئے
کون ہے جس کے بچھڑنے کا یہ غم ہے ہم کو

تم نے دیکھا تھا محبت کی نظر سے اکبار
حاصل زیست وہی چشم کرم ہے ہم کو

خاک میں چاند سی تصویر ملی، ہیں خاموش
جن کو دعویٰ تھا مسیحائی کا دم ہے ہم کو

موت جینے کی محافظ ہے جیالوں کے لئے
مژدۂ عید خط تیغ ستم ہے ہم کو

اے خدا مہلت دیدار بڑی چیز نہ تھی
یوں تو کہنے کو ترا فیض بہم ہے ہم کو

عرش پر ان سے ملا دے کہ زمین پر یا رب
جائے راحت نہ کوئی گوشۂ زم ہے ہم کو

درد دل شعر کے پردے میں چھپا دے افسر
ایک غماز ترا دیدۂ نم ہے ہم کو

٭

ظفر اقبال

(برادرم نیازی صاحب! تمہارا خط ملا - غزل بھیج رہا ہوں - امید ہے پسند آئے گی - جیسا کہ تمہیں معلوم ہوگا - یہ زمین نسخۂ حمیدیہ میں سے ہے)۔

یہ جو لکھا ہے مجھے، یہ جو مٹایا ہے مجھے
نہ سہی اور، تماشا تو بنایا ہے مجھے

کوئی تیر و تبر اپنا بھی نکالا ہوتا
میرے ہی اسلحہ سے اس نے ڈرایا ہے مجھے

جیسے یہ سب ہیں، اسی طرح کا ہو جاؤں اگر
بیٹھے بیٹھے یہ خیال آج ہی آیا ہے مجھے

عیب رکھتا ہوں کہ آخر یہ ہنر ہے میرا
دھوپ میری ہے یہی، اور یہی سایا ہے مجھے

تا کہ میں کچھ نہ کہوں وضع کی مجبوری میں
اس لئے مسند ایواں پہ بٹھایا ہے مجھے

سر تسلیم ہوں، جس طور جھکایا مجھ کو
دست تائید ہوں، جس رنگ اٹھایا ہے مجھے

میں وہ خوں ہوں کہ بہایا ہے مجھے سڑکوں پر
میں ہوں وہ رنگ کہ چہروں سے اڑایا ہے مجھے

پھڑپھڑاتا ہوں ابھی زور ہوا میں رخ پر
نہ اٹھایا ہے ابھی، اور نہ گرایا ہے مجھے

میں کہ اس عہد میں منکر ہوں، ظفر، اپنا بھی
کس لئے محفل غالب میں بلایا ہے مجھے

*

کشور ناہید

(صبا جو غنچے کے پردے میں جا لگتی ہے)

چمن کے پیرہن گل صبا نکلتی ہے
سیاہیوں کے جگر سے ضیا نکلتی ہے

کبھی تو مجھ کو بھی احساس آشنائی دے
وہ روشنی جو کف گل پہ جا لگتی ہے

میں آنکھ بند کروں تو بھی ہے وہی منظر
وہ ایک شکل ہر اک راہ پہ آ نکلتی ہے

سراب فہم سے آگے کہیں ہے بحر مراد
ہر ایک منزل دل نقش پا نکلتی ہے

مطالب در احساس پیش و پس مت پوچھ
عدم دراز ادائے بقا نکلتی ہے

کبھی جو کھل کے کروں بات اپنے آپ سے میں
ہر ایک آرزو غم آشنا نکلتی ہے

اب اور کوئی طریق ستم کرو ایجاد
صلیب درد تمنا فزا نکلتی ہے

سرک رہے ہیں اندھیرے ہر ایک بستی سے
عذاب ابر سے قرص رضا نکلتی ہے

ہجوم عکس میں چہرہ تلاش کیسے کریں
ہر ایک شکل اساس خلا نکلتی ہے

مرے یقین کی گھٹن اور بھی بڑھے ناہید
ہوا ہو بند تو موج بلا نکلتی ہے

★

اصغر سلیم

(سوائے حسرت تعمیر گھر میں خاک نہیں)

عجب نہیں جو مرے زخم سر میں خاک نہیں
ستم تو یہ ہے کف چارہ گر میں خاک نہیں

اب ایک شہر کو راس آ گئی ہوائے جنوں
اب ایک شہر کے دیوار و در میں خاک نہیں

کہیں کھلا ہے گل آفتاب کا منظر
کہیں سواد سحر تک نظر میں خاک نہیں

چلے ہیں نوحہ کناں رہروان دشت بلا
وہ بے کسی ہے کہ رخت سفر میں خاک نہیں

پڑا ہے گھات میں کب سے بلا کشوں کا لہو
اسے گماں ہے کہ اس رہگذر میں خاک نہیں

کہو تو قرض سخن کس طرح ادا کیجے
گہر فشانیٔ لب سے جگر میں خاک نہیں

سلیم غالب خونیں رقم کی بات سہی
میں کیوں کہوں مری کلک ہنر میں خاک نہیں

★

محمد منور

(آپ جانا ادھر اور آپ ھی حیراں ھونا)

خوش نہ آیا اسے ممنون بہاراں ھونا
گلشن دل کی تمنا ھے بیاباں ھونا!

دوستو! دیکھ لیا ھم نے پریشاں ھوکر!
دوستو چھوڑ دیا ھم نے پریشاں ھونا!

وائے احوال دل زار ھو قسمت جس کی
ھدف تیر عنایات عزیزاں ھونا!

شوکت گل کی ھو کیوں نذر تیری رعنائی
خار گلشن سے فزوں خار بیاباں ھونا!

شیوۂ انس بھی ھے تیری نگاھوں میں اگر!
ھو مبارک تجھے ھم چشم غزالاں ھونا!

دل کو گرمائے نہ جس کے سخن مور ضعیف
نہیں زیبا اسے ھم گام سلیماں ھونا!

یار اب آہ پہ نادم ھیں، وہ عالم بھی تھا!
مایۂ ننگ نہ تھا چاک گریباں ھونا!

دل یاراں پہ منور ھے اداسی طاری
پھر یاراں ترا جائز ھے غزلخواں ھونا!

★

امجد اسلام امجد

(یک قلم منظور ہے جو کچھ پریشانی کرے)

دیکھتا رہتا ہوں میں جو کچھ پریشانی کرے
فیصلے جب دل کے ہوں تو کیا ہنردانی کرے

ایک تو اس کی نگاہوں نے کیا بے دست و پا
اس پہ یہ مشکل کہ اپنا دل بھی من مانی کرے

آرزو خود اپنے خوں سے انجمن پرداز ہے
دل بھر قیمت فروغ جلوہ سامانی کرے

دھیان سے جس کو ہٹانے پر مرا قابو نہیں
آنکھ میں اس کی تمنا خون کو پانی کرے

وہ گراں گوشی ہے کوئی بات ہی سنتا نہیں
کس توقع پر زباں عرض گراں جانی کرے

آنکھ میں منظر کا جالا ، کان میں گرد صدا
دشت کا ماحول پیدا خانہ ویرانی کرے

زندگی بے سود ہے گر اس کی جانب سے نہ ہو
موت بھی دولت ہے گر وہ آپ ارزانی کرے

سامنے آیا ہے تو میرے رگ و پے میں اتر
میں تو آئینہ نہیں جو صرف حیرانی کرے

کیا کہوں امجد ہوائے اضطراب دید کو
دشت دل کو ایک پل میں شبنمستانی کرے

★

سرمد صہبائی

(سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں)

خواہشیں خود اپنی ہی شدت سے عریاں ہوگئیں
صورتیں ٹکرا کے آئینوں سے حیراں ہوگئیں

ہوگئیں پیوست کتنی ہی صدائیں جسم میں
رنگتیں آنکھوں میں آتریں تو رگ جاں ہوگئیں

میری تنہائی نے ہے مجھ کو سمیٹا رات بھر
رونقیں گھبرا کے سڑکوں پر پریشاں ہوگئیں

رعد کی صورت گلی کوچوں میں گونجی بازگشت
برق کی صورت رگیں میری نمایاں ہو گئیں

کون اب ٹوٹی صداؤں کو سمیٹے گا یہاں
شہر گونگے ہوگئے سنسان گلیاں ہو گئیں

تیرگی میں ڈھونڈتا پھرتا ہوں کرنوں کی چمک
شب کے اس اندھے سفر میں مجھ کو صدیاں ہو گئیں

★

الیاس کومل

(آنے لگی ہے نکہت گل سے حیا مجھے)

ہوں کس مقام پر ذرا تو ہی بتا مجھے
تیری زباں سے پھول بھی پتھر لگا مجھے

پھر دے رہے ہیں زہرہ و انجم صدا مجھے
اے ہم نفس چلا میں ذرا تھامنا مجھے

پھر ہو رہا ہوں جرم محبت کا مرتکب!
ملنے کو پھر ہے کوئی انوکھی سزا مجھے

عہد وفا نہ باندھیئے، رہنے بھی دیجیئے!
کرنا پڑے نہ آپ سے کل ہی گلا مجھے

پھر آ گیا خیال مجھے ترک عشق کا!
دشت جنوں میں ہوش نے پھر آ لیا مجھے

چلے میں ایک عمر اسے ڈھونڈتا رہا
میں گم ہوا تو ڈھونڈنے نکلا خدا مجھے

کومل نہ مجھ کو شہر تمنا میں کھینچئے
راس آ گئی ہے دشت انا کی ہوا مجھے

★

اشرف عظیم

(آج غالب غزل سرا نہ ہوا)

ٹوٹتے دل کی تو صدا نہ ہوا
یہ عجب اپنا دوستانہ ہوا

میں تجھے پوجتا رہا شب بھر
تو مری صبح کا خدا نہ ہوا

سرد راتوں میں کانپتے سایے
گرم سورج بھی آسرا نہ ہوا

غم کے ماروں کو اورخواھش ہے
ظلم تجھ سے اگر سوا نہ ھوا

ھم رہے سب کے راز کے محرم
ھم سے کوئی بھی آشنا نہ ھوا

وقت کی راہ میں چلے تنہا
ساتھ کوئی بھی دوسرا نہ ھوا

کل وہ خاموش ھوگیا تھا عظیم
آج غالب غزل سرا نہ ھوا

★

نگہت پروین رعنا

(ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں)

راس آ جائے اگر غم تو وفا کہتے ہیں
ورنہ مجبوری کی حالت میں جفا کہتے ہیں

حسن بھی عشق کی تخلیق کا اک شعبہ ہے
عشق والوں کو حقیقت میں خدا کہتے ہیں

کرکے نیکی نہ ستائش کی تمنا رکھئے
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

کتنے ظالم ہیں کوئی جا کے انہیں بتلائے
ہاتھ میں زہر ہے وہ جس کو دوا کہتے ہیں

اس قدر معتقد حسن ہیں دنیا والے
تیرے انداز جفا کو بھی وفا کہتے ہیں

میرے حق میں وہ دعا بھی ہے اثر سے خالی
جس کو رعنا وہ محبت کی دعا کہتے ہیں

*

سہیل صفدر

(چلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی)

مٹی کے جسم سے کبھی نکلا کرے کوئی
میں کون ہوں؟ میں کیا ہوں؟ یہ سوچا کرے کوئی

میں کون سی فضا میں ہوں کیا کام ہے مرا
خود اپنے آپ سے کبھی پوچھا کرے کوئی

سورج ، زمین ، چاند ستاروں کے سلسلے
اس آسمانی آنکھ سے دیکھا کرے کوئی

قطرے کا اک سفر مجھے انساں بنا گیا
میں راز ہوں ، ذرا مجھے افشا کرے کوئی

خوشبو بکھیر کر مرے شانوں سے اڑ گئی
ایسی ہوائے انس کو ڈھونڈا کرے کوئی

بکھرا پڑا ہوں ذات کے ٹکڑوں میں جا بجا
مجھ کو مرے وجود میں یکجا کرے کوئی

سچ ہے سزا ملی ہے کہ ننگے رہیں مدام
کافر بدن کو شرم سے ڈھانپا کرے کوئی

پاؤں شکستہ ، ہاتھ قلم اور سر نگوں
صفدر تمہارے شہر میں کیا کیا کرے کوئی

*

حسن رضوی

(اس کی ہر بات پہ ہم نام خدا کہتے ہیں)

مہ جبیں ، شوخ حسیں ، ماہ لقا کہتے ہیں
تمہی کہہ دو کہ تمہیں اور بھی کیا کہتے ہیں

آسماں نے تیرے گالوں سے شفق مانگی ہے
چاندنی کو تری آنکھوں کی ضیا کہتے ہیں

کہکشاں یوں تیرے چہرے کا تقدس ٹھہری
رات کو تیری جوانی کی ادا کہتے ہیں

استقامت وہ ارادوں کو عطا کی میں نے
دل کی ڈھیری ہے جسے کوہ صفا کہتے ہیں

ناخداؤں نے اگر اپنی چرا لیں آنکھیں
کشتیاں بن گئیں امواج بلا کہتے ہیں

خواہش آتش خاموش میں ڈھل جائیں تو
ضبط کو دل کے تشدد کا خدا کہتے ہیں

رات جلتی ہے پگھلتے ہوئے دن میں رضوی
آج کل گرم ہے زلفوں کی ہوا کہتے ہیں

★

مظفر عباس

(جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر)

آ کتا گیا تھا رونق گلزار دیکھ کر
جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر

شیوہ ہے ان کا ظلم ، ہمارا ستم کشی
خوش ہو رہے ہیں دل میں مجھے خوار دیکھ کر

دنیائے انقلاب میں معدوم ہے سکون
ہم کو یقین ہے گیسوئے خمدار دیکھ کر

تصویر حسن یار سکندر نہ بن سکی
حیراں ہوں تیری کاوش بیدار دیکھ کر

صبح ، نوید حسن مظفر جوبن گئی
رخصت سیاہی ہوگئی انوار دیکھ کر

★

منظر صہبائی

(آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں)

پھر کوئی شخص ہے سولی پہ چڑھا کہتے ہیں
شہر در شہر لہو پھر ہے بہا کہتے ہیں

رات کو مٹی کی قبروں پہ ہے دہشت کا غبار
اب بھی آتی ہے یہاں تیری صدا کہتے ہیں

سانولا رنگ ہے بھیگی ہوئی کالی آنکھیں
پوچھتا پھرتا ہے وہ میرا پتا کہتے ہیں

خود ہی بیکار سے پتھر کی بنا کر مورت
بعد میں لوگ اسے خود ہی خدا کہتے ہیں

سن تو لیتے ہیں مری بات بڑے غور کے ساتھ
جانتا ہوں کہ میرے بعد وہ کیا کہتے ہیں

آنکھ میں چبھتے ہیں خواہش کے چمکتے ذرے
وہ مرے بعد کسی سے ہے ملا کہتے ہیں

سرخ آندھی نے اگل ڈالے ہیں پیلے پتے
ہر طرف چاک ہے پھولوں کی قبا کہتے ہیں

ایک ہنگامے نے بدلے ہیں ہزاروں چہرے
پھر مرا شہر ہے لاشوں سے پٹا کہتے ہیں

لاکھ داغوں سے کرن ایک نہ پھوٹی منظر
لوگ کیسے ہیں جو داغوں کو دیا کہتے ہیں

٭

احمد سعید چمن

(دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی)

احساس غم کی موج بڑا کام کر گئی
دل میں کسی کی چاند سی صورت اتر گئی

یہ ہے کمال حسن کہ معراج عشق ہے
جلوہ فشاں تھے آپ جہاں تک نظر گئی

ساقی تری نگاہ کرم کے طفیل آج
ساغر چلا تو گردش دوراں ٹھہر گئی

غم کے بگولے رقص کناں تھے وہاں وہاں
اے دل جہاں جہاں بھی ہماری خبر گئی

دیکھا نہ ہم نے بھول کے ملاح کی طرف
گو کشتیٔ حیات بھنور میں اتر گئی

حیرت ہوئی فلک کے مکینوں کو دوستو!
شمس و قمر سے آگے جو فکر بشر گئی

پت جھڑ کا لوگ سوگ مناتے ہی رہ گئے
آئی بہار اور چمن سے گذر گئی

*

سید مسعود ہاشمی

(ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں)

لوگ اس دور میں چاہت کو ریا کہتے ہیں
مجھ کو محسوس یہ ہوتا ہے بجا کہتے ہیں

آپ کی زلف میں راتوں کی مہک ہوتی ہے
آپ کے رنگ کو پھولوں کی قبا کہتے ہیں

دیکھئے فرق محبت کی ستم رانی کا
ہم انہیں کہتے ہیں کیا وہ ہمیں کیا کہتے ہیں

میری حالت جو نظر آتی ہے صاحب تم کو
اس کو کچھ لوگ محبت کی سزا کہتے ہیں

وہ یہیں پر ہیں کہیں نغمہ کناں سنتے ہیں
وہ یہیں پر ہیں کہیں شعلہ نوا کہتے ہیں

آج کشتی کو کنارے ہی پہ آنے دیجئے
آج لہروں میں بے زوروں کی ہوا کہتے ہیں

لوگ کہتے ہیں برا مجھ کو تو کیا غم صاحب
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

*

اجمل نیازی

(ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے)

ہم اکیلے ہی سہی شہر میں کیا رکھتے تھے
دل میں جھانکو تو کئی شہر بسا رکھتے تھے

اب کسے دیکھنے بیٹھے ہو لیئے درد کی ضو
اٹھ گئے لوگ جو آنکھوں میں حیا رکھتے تھے

اس طرح تازہ خداؤں سے پڑا ہے پالا
یہ بھی اب یاد نہیں ہے کہ خدا رکھتے تھے

چھین کر کس نے بکھیرا ہے شعاعوں کی طرح
رات کا درد زمانے سے بچا رکھتے تھے

لے گئیں جانے کہاں گرم ہوائیں ان کو
پھول سے لوگ جو دامن میں صبا رکھتے تھے

کل جو دیکھا تو وہ آنکھوں میں لئیے پھرتا تھا
ہائے وہ چیز کہ ہم سب سے چھپا رکھتے تھے

تازہ زخموں سے چھلک اٹھیں پرانی ٹیسیں
ورنہ ہم درد کا احساس نیا رکھتے تھے

یہ جو روتے ہیں لیئے آنکھ میں ٹوٹے تارے
اپنے چہرے پہ کبھی چاند سجا رکھتے تھے

کوئی سنتا بھی یہاں چیختے لمحوں میں اسے
ذہن میں ٹوٹتے لفظوں کی صدا رکھتے تھے

آج وہ شہر خموشاں کی طرح ہیں اجمل
کل تلک شہر میں جو دھوم مچا رکھتے تھے